کراچی

سچی کہانیاں

MARCH
2018

PDF

MARCH 2018

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

E-mail.pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیر اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: دانیال شمسی

مدیر اعزازی: محمد سلیم اختر

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز	MEMBER APNS CPNE

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0331-8221212

منیجر سرکولیشن
آفتاب عالم
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893121
021-35893123

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ☼ جلد: 35 - شمارہ: 03 ☼ مارچ 2018ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

URDUSOFTBOOKS.COM

URDUSOFTBOOKS.COM

URDUSOFTBOOKS.CO

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی ۔ سٹی پریس OB-7 تا لیو

URDUSOFTBOOKS.COM

URDUSOFTBOOKS.COM

URDUSOFTBOOKS.COM

سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے، افریقہ 65 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر، ایشیا، یورپ 55 ڈا

"دوشیزہ کا سفر"

دو حصوں پر مشتمل ایک ایسے سفر کی داستان جس
سچائی کی گواہ یہ دنیا ہے' زندگی کے نشیب و فراز اور لوگو
کے کڑوے کسیلے رویوں سے مزین ایک ایسا سفر جو آپ
ادارہ دوشیزہ اور اس سے جڑے لوگوں سے جوڑے ر
گا...... اور یہ یقین بھی دے گا کہ سفر کیسا بھی ہو اختت
منزل پر ہی ہوتا ہے۔

منزہ سہام کے قلم سے ایک خوشنما تحریر جس کو
کہانیاں کے قارئین کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس سچے س
کی پہلی قسط اپریل کے شمارے میں موجود ہوگی۔

ہمارا دعویٰ ہے جس نے دوشیزہ کا سفر نہیں پڑ
اُس نے کچھ نہیں پڑھا......



محبت کا ثبوت

کاغذ کی قیمت میں ہوش ربا اضافہ اور اشتہاری کمپنیوں کا الیکٹرانک میڈیا کی طرف جھکاؤ ان مسائل کی وجہ سے پرنٹ میڈیا شدید مشکلات میں مبتلا تھا اور اب سونے پر سہاگہ چند ناعاقبت اندیش لوگوں نے بنا اجازت ڈائجسٹ نیٹ پر ڈالنا شروع کر دیے ہیں شمارہ ابھی پریس میں ہی ہوتا ہے اور یہ چور ڈاکو پورا ڈائجسٹ نیٹ پر ڈال دیتے ہیں جس سے پرچوں کی سیل بری طرح متاثر ہو رہی ہے' اس کے علاوہ کتاب پڑھنے کی عادت لوگوں میں ختم ہو رہی ہے جو آنے والے دنوں میں پورے معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ کتاب پڑھنے سے ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ انسانی ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل رہتا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ کتاب میں چھپنے والا مواد مستند ہوتا ہے' کیونکہ چھاپنے سے پہلے مکمل ریسرچ کی جاتی ہے۔ مہذب معاشرے کی پہچان ہے کہ وہاں کتاب دوستی کو اہمیت دی جاتی ہے مگر کچھ لالچی لوگ چند روپوں کی خاطر یہ غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ میری ارباب اختیار سے اپیل ہے کہ سائبر کرائم کے تحت ایسی تمام سائٹس کو بند کر دیا جائے جو بنا اجازت مواد نیٹ پر اپ لوڈ کرتی ہیں۔ میری آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی کے صدر اور جنرل سیکریٹری سے بھی اپیل ہے کہ اس معاملے کا آپ نے نوٹس لیا ہے مگر سخت اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ پرنٹ میڈیا کی انڈسٹری تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس سے وابستہ ہزاروں لوگ بے روزگار ہو جائیں گے۔ کتاب سب سے اچھی دوست ہوتی ہے ان چند چوروں کی وجہ سے ہم پاکستانی اچھے دوست سے نہ محروم ہو جائیں لہٰذا فوری طور پر ان غیر قانونی سائٹس کو بند ہونا چاہیے میری اپنے پڑھنے والوں سے بھی اپیل ہے کہ کتاب دوستی کا ثبوت دیں اور تھوڑی سی آسانی کے لیے اپنے پسندیدہ ڈائجسٹوں کو نقصان نہ پہنچائیں اپنی محبت کا ثبوت دیں اور شمارہ خرید کر پڑھیں۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ' آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

عزیز احوالیو! امید کرتی ہوں کہ آپ کا ساتھ ہمیشہ کی طرح سچی کہانیوں کی کامیابی اور ترقی میں شامل حال رہے گا۔ ایک عرصے کے بعد آپ سے مخاطب ہوں' چاہتی ہوں کہ کچھ باتوں کی وضاحت کردوں۔ دوشیزہ اور سچی کہانیاں مجھے اسی طرح عزیز ہیں جیسے ایک ماں کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے۔ لہٰذا لکھاری ہوں یا قاری میرے لیے نہایت قابل احترام ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ماضی میں کسی کے ساتھ ناروا سلوک رکھا گیا ہو۔ کیونکہ کچھ لوگ ایڈیٹر کی گڈ بک میں آجاتے ہیں اور کچھ کو نظر انداز کیا جاتا ہے اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں میں اُس تفصیل میں جانا نہیں چاہتی مگر آپ لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ بحیثیت مدیرہ اعلیٰ میرا منصب مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی کے ساتھ بھی زیادتی کروں اور کسی کو غیر معمولی توجہ دوں میرے لیے آپ سب اہم ہیں بالکل اس ماں کی طرح جو اپنے تمام بچوں سے ایک سی محبت روا رکھتی ہے۔ اس بار سچی کہانیاں آپ لوگوں تک تاخیر سے پہنچا اس لیے خطوط کی تعداد کم ہے اگر خطوط کا انتظار کرتی تو پرچا پھر لیٹ ہوجاتا اس لیے اس بار جن کے خطوط رہ گئے وہ میری مجبوری کو سمجھیں اور اگلے ماہ 10 تاریخ تک اپنے خطوط بھجوادیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ روٹھے ہوئے بھی واپس آئیں گے کیونکہ یہ روٹھنا منانا بس ایک سیاسی پارٹی کو ہی زیب دیتا ہے ہم سب تو پڑھنے لکھنے والے لوگ ہیں کسی سے ناراض نہیں ہوتے سوائے اپنے' آیئے عہد کریں کہ ہم سب مل کر اپنے سچی کہانیاں کو دن گنی اور رات چوگنی ترقی کی راہ پر گامزن کریں گے بڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب......

٭ منشی محمد عزیز مئے' لڈن وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ اچھی آپی منزہ سہام مرزا صاحبہ' عقیدت بھرا سلام قبول ہو۔ عرصہ دراز بعد آپ سے مخاطب ہوں' سچی کہانیاں سے تو رابطہ برقرار تھا مگر آپ سے براہِ راست بات چیت ہوئے کافی عرصہ گزر گیا۔ ایک دو بار آپ کے دفتر کے رابطے نمبر پر آپ سے بات کرنا چاہی مگر ناکام رہا' خیر یہ تو ایک طویل قصہ ہے۔ سب سے پہلے تو محترم بھائی ناصر رضا کے لیے سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھ کر اُن کی روح کو ایصال ثواب بخشا۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اگر چہ اُن کے رابطہ نمبر پر اُن کی چھوٹی صاحبزادی سے تعزیت کر چکا ہوں لیکن پھر بھی ضروری سمجھا۔ میری سالانہ رپورٹ شائع کرنے

کا شکریہ لیکن کافی کچھ شاید غلطی سے شائع ہونے سے رہ گیا۔ اب پُراسرار نمبر پر تبصرہ' سات فروری کو ایک دوست سے کہہ کر شمارہ منگوایا' اپنا خط شائع ہونے کی خبر سوشل میڈیا اور محبت کرنے والے دوست مور شاہد حسین کی بدولت دو دن پہلے ہی مل چکی تھی۔ بہت خوشی ہوئی اپنا خط دیکھ کر' سرورق پُراسرار نمبر کے عین مطابق تھا۔ اداریہ میں منزہ باجی بھائی ناصر رضا کی کمی محسوس کرتی نظر آئیں۔ یقیناً یہ بہت خلا ہے۔ احوال میں اس بار خطوط بنا ایڈٹ کیے شائع ہوئے۔ اچھی بات سب سے پہلے عبدالغفار عابد کی تحریر دوسری دنیا پڑھی۔ غفار بھائی نے چکوال کے خوبصورت علاقوں کی سیر گھر بیٹھے کوا دی۔ حمید کی لاڈلی نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر اپنے مالک کے بیٹے کو بچالیا۔ الماس فاطمہ ارمان نے اپنی تحریر میں دو محبت کرنے والوں کی حالت زار بیان کی جو اس دنیا میں ایک نہ ہوسکے۔ مور شاہد حسین دو بدروحیں کے عنوان سے ایک غریب رکشہ ڈرائیور کی بپتا سنا رہے تھے جو کہ تاریک رات میں بدروحوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ پھر بھی صد شکر کہ جانے بچانے میں کامیاب ہوگیا۔ ویسے مور اس تحریر کو آگے بڑھا سکتے تھے۔ شگفتہ شفیق آج کا شاعر میں مجاز لکھنوی سے ملاقات کروا رہی تھیں اُن کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

تیرے ماتھے پر یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تُو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

اعلان

اقبال زمان صاحب جو کہ ہمارے سابقہ سرکولیشن منیجر تھے اُن کا ادارہ سے اب کوئی تعلق نہیں لہٰذا پرچوں کی معلومات' خریداری اور دیگر معاملات کے لیے ان نمبروں 35893121-22-23 یا موجودہ سرکولیشن منیجر آفتاب عالم سے رابطہ کریں۔

مقصود احمد بلوچ مختصر سی تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ خادم حسین کی قسمت اچھی تھی جو بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اگلے صفحات پر عمران مظہر اپنے پسندیدہ مدیر کو خراج تحسین پیش کرتے نظر آئے قمر علی عباسی کا سفر نامہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔

☆ منشی عزیز مئے بھائی! میری کچھ مصروفیات ایسی ہیں کہ فون پر اکثر دستیاب نہیں ہوتی اس لیے آپ سب سے درخواست ہوگی کہ نصف ملاقات کو ترجیح دیں۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ اتنی توجہ اور دلچسپی سے سچی کہانیاں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر بھائی یہ ساری تفصیل میں شائع کر چکی ہوں آپ بھول رہے ہیں ایک بار پھر اپنا خط فروری کے شمارے میں دیکھیے۔ آپ کی تعریف دوستوں تک پہنچا دی ہے۔ میں منتظر رہوں گی کہ آپ احوال میں ہر ماہ بھرپور انداز میں شرکت کریں گے اور کہانیاں بھی ارسال کریں گے۔

ساحل ابڑو جعفر آباد سے لکھتے ہیں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال زیر قلم ہے کہ ماہنامہ دوشیزہ اور ماہنامہ سچی کہانیاں میں لکھنے کا شرف حاصل تو ایڈیٹر پرویز بلگرامی کے دور سے تھا جو وقتاً فوقتاً لکھتے آرہے ہیں مگر چند سالوں سے دونوں پرچوں سے کنارہ کشی کرلی تھی جس کی وجہ تھی مصروفیات' اور آج محمد سلیم اختر صاحب کے حکم تکمیل کرتے ہوئے دوبارہ لکھنے کی جسارت کررہا ہوں محمد سلیم اختر صاحب ہماری تنظیم ملی ادبی فاؤنڈیشن کے مرکزی صدر ہیں۔ ناصر رضا صاحب ایک اچھے اور مخلص ادیب انسان تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ ہمارے لیے استاد محترم کا درجہ رکھتے ہیں اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ ملی ادبی فاؤنڈیشن کی رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو میں نے محمد سلیم اختر صاحب کے کہنے پر ارسال کررہا ہوں ہمیں امید ہے کہ آپ اسے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گی۔ ایک اسٹوری پُراسرار نمبر کے لیے ارسال خدمت ہے باقی تحریریں آپ کو انشاء اللہ عنقریب سب مل جائیں گی۔

☆ ساحل بھائی! ماضی کو بھول جائیے اور یہ بھروسہ رکھیے کہ میں بحیثیت مدیرہ اعلیٰ اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ ہوں میرے لیے آپ سب بہت اہم ہیں کیونکہ آپ لوگوں کے بغیر سچی کہانیاں کچھ نہیں یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے اپنا حصہ ڈالتے رہیے کہانی اور تقریب کا حال جلد شائع کروں گی۔

روشانے سبحین مہاروی لاہور سے لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ آپا' السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ ناصر بھائی کے داغِ مفارقت دے جانے کے بعد سچی کہانیاں میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں تو دل ایک انجانے دکھ اور غم کے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔ اس بار نئے سال کی شروعات عجیب دکھ بھری ہوئی کئی اپنے بچھڑ گئے پیاروں کے بچھڑنے کا دکھ کتنا جان لیوا ہے ناں؟ جنوری ہمیشہ سے اپنے دامن میں پاس کی پرچھائیاں لیے اترتا ہے 23 جنوری کو بابا جان

کی برسی تھی، انہیں ہم سے بچھڑے 17 سال ہونے کو آئے یہ 17 سال گویا 17 صدیاں تھیں اُن کی یاد میرے پہلو میں آج بھی اسی تابناکی سے زندہ ہے۔ اس پر مستزاد ناسازی طبع نے نڈھال کیے رکھا جنوری کا پرچہ قدرے تاخیر سے ملا سو اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں کہ ابھی تک خطوط کے علاوہ کچھ نہیں پڑھا۔ ناصر بھائی کا مرتب کردہ آخری پرچہ خدایا یہ کتنا جاں لیوا احساس ہے۔ اور کیا کہوں...... بس ریشم کے دھاگے کی چوتھی قسم حاضر ہے اپنا خیال رکھیے گا۔

☆ اچھی روشانے! میں تمہاری تکلیف سمجھ سکتی ہوں میں نے بھی اپنے بہت پیارے دوست جیسے والد کو کھویا ہے۔ بیٹیاں کتنی بڑی ہو جائیں کتنی ذمہ داریاں بڑھ جائیں مگر جو سکون اور شفقت کا احساس باپ کی چھاؤں میں ہوتا ہے وہ کہیں نہیں، ناصر بھائی کی بیٹیاں بھی اب دکھ اٹھائیں گی۔ تم اپنی صحت کا بہت خیال رکھو بچوں کو پیار اور میاں کو ڈھیروں دعائیں۔

◆ ایم یعقوب احمدانی بلوچ ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! جی کیا حال ہیں منزہ سہام امید ہے خیر و عافیت سے ہوں گے قابل عزت بندہ ناچیز بہت عرصے کے بعد سچی کہانیاں کی محفل میں حاضر ہے۔ احمد رضا صاحب واپسی آمد کی بہت خوشی ہوئی آپ کا بہت ذکر نام سنا ہے قابل عزت دوست سے، دنیا داری، پیٹ کی پوجا سے فرصت ہی نہیں مل پائی حاضری دینے کی امید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ ہم بہت پرانے قاری ہیں محفل کے، تبصرے کے لیے معذرت میں ایسی جگہ ہوں جہاں پرچہ مل نہیں سکتا۔ خیر اپنے دوستوں کو سلام کہوں گا جن کو میں یاد تک نہیں کوئی بات نہیں۔ جناب بڑے بھائی ممتاز احمد سرگودھا، عبدالغفار عابد صاحب، یوسف لغاری، راشد لطیف، ندیم عباس میواتی، ابوہریرہ، ابوذر غفاری بلوچ، اور ڈیرہ غازی خان سے ننھے منعم اصغر، ارم جی سلام اور ارم ناز صاحبہ رائٹر ایوارڈ کی بات مذاق تھی۔ جو میں نے کی تھی سوری، فرح انیس سلام عرض، یہ چھوٹا سا محبت نامہ پُرخلوص بڑی چاہت سے پیش نظر ہے قبول فرمایئے گا اور نئے سال کی مبارکباد اللہ سب امت مسلمہ کی خیر فرمائے۔ ڈھیر ساری خوشیاں کامیابیاں رونقیں حسین پل اچھی صحت سب دوستوں کو عطا فرمائے آمین اور سچی کہانیاں کو بلند و بالا ترقی سے اپنے مقاصد میں کامیابی دے آمین ثم آمین ایک کہانی عرض گزارش ہے نظر ثانی فرمایئے گا۔

☆ بھائی ایم یعقوب میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ پابندی سے احوال کا حصہ بنتے رہیں گے۔ آپ کے تمام دوستوں تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ کہانی موصول ہوگئی ہے جلد شائع کروں گی۔

◆ ڈاکٹر عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے لکھتے ہیں۔ محترم ڈیئر ناصر رضا صاحب السلام علیکم! میں کافی عرصہ سے سچی کہانیاں ڈائجسٹ شوق سے پڑھ رہا ہوں میرا دل تو بہت کرتا تھا کہ میں بھی کچھ سچی کہانیاں لکھ کر آپ کو ارسال کروں مگر ایک تو مصروفیات بہت زیادہ

تھی دوسرا یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں آپ میری کہانی کو شائع ہی نہ کریں۔ اب میں آپ کو ایک کہانی 'معصوم محبت' ارسال کرر ہا ہوں جس کی غلطیاں درست کر کے اسے جلد از جلد شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں تا کہ حوصلہ افزائی سے میں مزید کہانیاں بھی لکھ کر آپ کو ارسال کرسکوں۔ جناب کی بہت مہربانی ہوگی میری دعا ہے کہ ماہنامہ سچی کہانیاں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے آمین۔

☆ بھائی عامر شہزاد! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ سچی کہانیاں کے پرانے قاری ہیں بلاخوف وخطر لکھنے کا عمل جاری رکھیں۔ انشاء اللہ جلد آپ کی تحریر اپریل عشق نمبر میں لگاؤں گی اور ڈاکٹر صاحب وقت نکال کر سچی کہانیاں پر تبصرہ ضرور کیا کریں۔

﴾ فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ طویل عرصے کے بعد سچی کہانیاں کے احوال میں شرکت کرر ہا ہوں پہلے یونیورسٹی کے امتحانات کی وجہ سے غیر حاضر رہا پھر گھریلو معاملات کی پریشانیوں کی وجہ سے نہ لکھ سکا۔ ماہ فروری کا شمارہ 5 فروری کو ملا۔ ٹائٹل میں پُر اسرار نمبر کے مطابق ڈراؤنی آنکھوں والی دیکھ کر ہم تو ڈر ہی گئے۔ اس کے بعد اشتہارات کو پلٹتے دیکھتے پڑھتے ہوئے منزہ سہام کے اداریے پر جا کر نظر ٹھہری اے کاش کہ میری راہوں میں ناصر رضا صاحب کی وفات کا اچانک دنیا سے چلے جانا پڑھا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک آئے بلاشبہ ناصر رضا مرحوم کی بطور ایڈیٹر سچی کہانیاں قابل فخر ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ کمی تو ضرور محسوس ہوتی ہے جب کوئی ہم میں نہ رہے تو جیتے جی تو گلے شکوے ہوتے ہیں لیکن مرنے کے بعد بس کمی ہی محسوس ہوتی ہے۔ احوال میں سب سے پہلے فیضان عثمانی کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ اس کے علاوہ نعمان احمد آرائیں' عاصم مجاہد' نازیہ بتول' روشانے سبحین' مدیحہ گل' ارشد اقبال چوہان' عمران مظہر' دانیال' خضر حیات' عبدالغفار حسن نظامی' احوال میں خطوط کی تعداد بہت کم ہے۔ کاشی چوہان جب ایڈیٹر تھے تو خطوط کی تعداد پچاس سے زائد ہوا کرتی تھی۔ تمام بڑے قارئین کو گزارش ہے کہ احوال میں واپس لوٹ آئیں سچی کہانیاں اسی طرح اپنی افادیت کے ساتھ قائم ہے آب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف۔ زبیدہ آپا کا بے شک پاکستان کی معروف شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ ملک کی خاطر اُن کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنی جوار رحمت کی جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے موت کی چنگھاڑ سلیم اختر سسپنس سے جڑی حیران کر دینے والی کہانی ہے۔ پُر اسرار فقیر اُم مناہل فقیر کے چلے جانے کے بعد سکوں کا ملتے رہنا سمجھ سے بالاتر ہے زبردست کہانی ہے۔ کشش کوئی ہے فرح انیس آج بھی بدروحیں انسانوں میں داخل ہو کر اسے اذیت پہنچاتی ہیں پلوشہ کا ان اذیت ناک مراحل سے گزرنا بہت بڑا امتحان تھا۔ اللہ تعالیٰ پلوشہ کو سکون نصیب فرمائے' قبر کے مکین رضوانہ آفتاب صارم کی زندگی میں واقعہ اسی

سے زندگی کا سبق ہے ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے بابا جی کے فیض سے لوگوں کو مسائل کے وظائف بتاتے ہوئے جب اُن کے مسائل ختم ہوتے ہیں تو پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے آج الحمدللہ میں نے ایم اے اردو پاس کرلیا ہے۔ ایک کہانی لکھ رہا ہوں جلد ہی آپ کو ارسال کروں گا۔ تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام۔

☆ فیصل بھائی! ایم اے پاس کرنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد' شمارے پر تبصرہ کیا اچھا لگا۔ بھائی میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ میرا مان رکھیں اور مجھے خط لکھیں مجھے فون کرکے کسی کو کہنا نہ پڑے کہ خدارا تبصرہ بھیجو آپ کی کہانی کی منتظر ہوں۔

❁ نفیسہ فضل کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری بیٹی منزہ! خوش رہو' اللہ پاک صحت زندگی اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین میں ناصر بھیا کو خط لکھ رہی تھی درمیان میں ہی فون کردیا تو ان کے انتقال کا سن کر بہت دکھ ہوا ناصر رضا میرے چھوٹے بھائی جیسے تھے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے ان کے درجات بلند فرمائے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ دو غزلیں میں نے لکھی تھیں ارسال کررہی ہوں پلیز پہلی اشاعت میں شامل کرلیں شکریہ' میرا یہ خط احوال میں شامل کرکے شکریہ کا موقع دیں۔

☆ آنٹی نفیسہ فضل! بے شک ناصر رضا صاحب کا جانا ہم سب کے لیے سانحہ سے کم نہیں...... اللہ اُن کے درجات بلند کرے آپ کی پسند کی غزل احوال میں شامل کررہی ہوں۔

بھائی منیر خان ناصر رضا بھیا اور ان کے جانے پر
روتی آنکھوں نے دیکھا ہے خلقت کتنا روئی ہے
مٹی کی امانت مٹی کی آغوش میں جا کر سوئی ہے
رنج والم کے گہرے بادل ٹوٹ کے ہر سو برسے ہیں
وہ روحِ ظرافت روٹھ گئی یوں ہونٹ ہنسی کو ترسے ہیں
انجانے سے ایسے لمحے زیست میں کیوں آجاتے ہیں
اتنے اچھے اتنے سچے لوگ جو یوں مرجاتے ہیں
حیرانی سی حیرانی ہے ہنستے ہنستے کھیل گیا
آخر وہ آلام تھے کیسے جن کو اکیلا جھیل گیا
راضی برضا تو رہنا ہے ہاں صبر کا یارا دے مولا
دل انگارہ انگارہ ہے اب کچھ تو سہارا دے مولا
ہم سب کی دعائے عجز ہے یہ منظور کا درجہ دے یارب
مرحوم کو اپنی رحمت سے مغفور کا درجہ دے یارب

❁ مور شاہد حسین قمر شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں۔ ڈیئر آپی منزہ سہام سلام و دعائیں'

آداب' امید ہے آپ سچی کہانیاں کا تمام اسٹاف اور قارئین حضرات بالکل خیر خیریت سے ہوں گے۔ اللہ سب پر اپنی رحمتوں' برکتوں' نعمتوں کا نزول فرمائے۔ سچی کہانیاں کا پُراسرار نمبر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ عمدہ پرچہ مہیا کرنے پر بے حد نوازش' مبارک باد ٹائٹل پُراسرار نمبر کے لیے بے حد اچھا تھا۔ فہرست میں مور شاہد حسین' دو بدروحیں شامل ہیں۔ حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ اے کاش کہ میری راہوں میں' اللہ پاک انکل ناصر رضا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ روشانے سبعین اور شازلی سعید مغل کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ منشی محمد عزیز اپنے احوال میں خصوصی ذکر کرنے پر بے حد شکریہ سلام و دعائیں' قمبر' لاڑکانہ سے نواب شاہ' حیدر آباد جامشورو سے کراچی تک تمام لکھاری بہنوں اور بھائیوں کو احوال میں شرکت کے لیے دلی دعوت' عزیز بھائی آپ بھی لڈن سے ملتان' لاہور' سرگودھا' بہاول پور' اسلام آباد سے ہنڈی آزاد کشمیر تک سب ساتھیوں کو آواز دیں کہ محفل احوال میں شریک ہوکر رونق بڑھائیں۔ ادی تحسین جونیجو 9 مارچ سدرہ شاہین بہنا 4 مارچ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو خوش سلامت رہیں بہنوادی زرینہ جونیجو' سلام ودعائیں' قدیم عباس مہواتی بھائی آپ بھی آئیں ناپلیز' زبیدہ آپا کی زندگی پر آپ نے بہت اچھا لکھا۔ منورہ نوری خلیق کی تاریخی کہانیوں کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ موت کی چنگھاڑ' پُراسرار فقیر' شش کوئی ہے۔ قبر کے مکین' حیرت تجسس اسرار سے پُر تھیں پھوپو کی روح میں انتقام لوں گی اچھی تھیں۔ دوسرے دنیا مردے کی فریاد بیٹھے بیٹھے حاضری ہوگئی عورت پن کی بلی' دہشت ناک رات' خوفناک منظر' اسما کہاں گئی رائٹرز نے خوب محنت کی۔ خون آشام انتقام بلی کے سیاہ بچے' نعیم بابا خزانہ سرد خانہ اسرار میں ڈوبی ہوئی حیرت انگیز تحریریں تھیں۔ باقی کہانیاں بھی اسرار سے بھرتھیں۔ ڈیئر آپی عشق نمبر کے لیے ایک کہانی بھیجی تھی۔ قابل اشاعت ہے یا ردی کی ٹوکری (بھوکی کہیں کی) ہضم کرگئی۔

☆ بھائی شاہد! شمارہ پسند کرنے کا شکریہ یقین کریں محنت وصول ہوگئی مجھے بہت اچھا لگا آپ نے نئے پرانے سب احوالیوں کو آواز دی انشاء اللہ ایک بار پھر احوال میں خوب رونق ہوگی۔ میں کسی کی بھی کہانی ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالوں گی اس پر خود کام کر کے شائع کروں گی مگر پھر لکھاری اپنی تحریر سے خامیاں دور کر کے اگلی تحریر مجھے بھیجیں ہم یہاں سکھانے کے لیے بیٹھے ہیں کسی کو رد کرنے کے لیے نہیں۔

◆ ملازم حسین شیرازی' بھکر' محترمہ مدیرہ اعلیٰ صاحبہ' السلام علیکم' مرحوم ناصر رضا صاحب کے اچانک دویا سے سفر آخرت پر جانے سے بہت صدمہ پہنچا دل بہت رنجیدہ ہوا۔ وفات سے چند دن پہلے میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی بہت حوصلہ افزائی فرما رہے تھے اور التماس دعا کے طالب تھے۔ بہت شفیق' مہربان اور اہلِ علم انسان تھے اللہ

پاک ان کی مغفرت فرمائے اوران کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے محترم منشی عزیز مئے وہاڑی نے سچی کہانیاں سال 2017 کا سالانہ تجزیہ بڑی محنت اورعرق ریزی سے کیا مجھے احوال نامہ 2017ء میں سات بار شرکت کرنے پر اول پوزیشن کے مقام پر فائز فرمایا پہلی پوزیشن کا حقدار بنایا اوراسپیشل مبارکبادیوں سے نوازا۔ بہت شکریہ' ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے خطوط زیادہ نہ لکھ سکا آئندہ سلسلہ خط وکتابت جاری رہے گا۔ زبیدہ آپا کے بارے میں منزہ سہام صاحبہ نے اُن کی ذاتی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں معلومات سے قارئین کو مستفید فرمایا بڑے دلنشین انداز میں تحریر لکھی گئی ماشاءاللہ دختر کاہن' ازقلم م ن خ کی پہلی قسط میں جو تشنگی رہ گئی تھی ۔ دوسری قسط میں خوب ادا ہوئی' آئندہ بھی سلسلہ اسی طرح دلچسپیاں برقرار رکھے گا۔ تاریخ کے جھرونکوں سے جھانکتی دلچسپ داستان موت کی چنگھاڑ' محمد سلیم اختر' زیرنظر کہانی پر تبصرہ بہت مشکل ہے تحریر میں شگفتگی برقرار ہے۔ پُراسرار فقیر ام مناہل اسرار میں لپٹی خوبصورت کہانی' پھوپو کی روح نازیہ بتول ڈر خوف اور کسی سحر میں گرفتار ہوجاتا ان کی رفع کے لیے نیک اعمال صدقہ جاریہ ہیں۔ سب مصیبتیں ٹل جاتی ہیں اچھی کاوش بیٹھے بیٹھے حاضری ہوگئی نفیسہ فضل محمود' نیت نیک منزل آسان عمدہ آج کا شاعر شگفتہ شفیق ہر اہل علم شاعر سے خراج عقیدت موصول کرنے والا عام انقلابیوں سے مختلف شاعر بہترین تحریر۔ دہشت ناک رات مقصود احمد بلوچ ماروائی مخلوق' آسیبی' اور خبیث روحیں انسان کو دھمکاتی ہیں۔ لیکن اللہ کے نیک بندے کسی قسم کے زیراثر نہیں آتے اچھوتی تحریر اسماء کہاں گئی زین شمسی' جو بدروحیں اورشیاطین مخلوق کو نہیں مانتے اُن کی کم عقلی کم علمی پر رونا آتا ہے زین شمسی کی تحریر ریشم کے دھاگے روشانے سبعین مہاروی ایک الگ سے موضوع پر مشتمل دلچسپیاں قائم رکھے ہوئے دلچسپ سلسلہ میں انتقام لوں گی مریم شاہ بخاری جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے دوسری دنیا' عبدالغفار عابد ہر غلط کام کا انجام اندوہناک ہوتا ہے نہایت عمدہ کہانی موت کی فریاد' الماس فاطمہ ارمان' دولت کے لالچ میں قبر کو مسمار کر کے دوسرا تازہ مردہ ڈال دینا ایک مکروہ غلیظ قابل نفرت توہین انسانیت ہے آپ زندہ ہیں عمران نصیر کی تحریر کردہ غمناک کہانی' دل کو ہلانے دینے والی تحریر خون آشام آتما' تبسم زہرہ' ناقابل یقین کہانی اپنوں کی بے رخی خون کے رشتے کتنے جلد بدل جاتے ہیں عبرت ناک کہانی۔ نعیم بابا قاضی فیضان حسین عثمانی' اگر ماورائی آسیبی مخلوقات ہیں تو ان سے بچاؤ کے لیے اللہ پاک نے نیک بندے بھی پیدا کیے ہیں جن کے وسیلوں اور دعاؤں سے شکلیں مصیبتیں رفع ہوجاتی ہیں۔ خزانہ نجیب عمر انگریزی سے ماخوذ ایک نایاب تحریر نہایت پُرلطف سردخانہ محمد شاہد' ایسی تحریر جو عرصہ دراز تک قارئین کو مسحور رکھے گی۔ باقی کہانیاں بھی دلچسپ ہیں خط کے طوالت کے پیش نظر قلم روکنا پڑتا ہے۔ فیض حسین عثمانی

ایک تفصیلی اور پُر مغز تحریر سچی کہانیاں سے اُن کی لگن احساسات قابل ستائش ہیں اور لائق تحسین ہیں عرصہ دراز سے شمارہ سے اُن کا تعلق اس بات کا ثبوت ہے کہ ترقی کی منازل طے کرانے میں اُن کا باقاعدہ حصہ ہے' لقمان آرائیں آپ کے بیان کردہ چھ واقعات کا مفصل حال ضرور پڑھیں گے شاید ان سے کچھ تجربات اخذ ہوں۔ ایم عاصم مجاہد' دین اسلام کا مجاہد ہونا بہت بڑی سعادت ہے۔ روشانے سبعین آپ کی نظموں کی کتاب کے منتظر ہیں اللہ کامیابی عطا فرمائے تازہ نظم حوازادی خوب رہی۔ منشی عزیز مئے دیہاڑی سے آپ نے اپنے مفصل خط میں بڑی معلومات اور قارئین کو مکمل آگاہی سے نوازا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کا مشکور ہوں کہ سال 2017ء کے احوال نامے میں سات بار شرکت کرنے پر پہلی پوزیشن دی اور ڈھیروں مبارکبادیوں سے نوازا۔ بہت شکریہ پورے سال میں لکھاریوں کی تحریر کردہ تحاریر' خطوط کہانیوں کا ریکارڈ رکھنا بڑی محنت طلب کام ہے بغور چشم عرق ریزی سے کام لیا۔ آپ کی لگن محنت کو سلام۔ عبدالغفار عابد آپ کی ناصر بھائی اور ان کے اہل خانہ سے ملاقات یقیناً اعزاز ہے ناصر بھائی کے آخری دنوں میں ان سے رابطے میں رہنا بڑی بات ہے اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے آمین نہایت مخلص محنتی اور خوش خلق تھے ایم حسن نظامی آپ کی تحریر اور ناصر بھائی کے بارے میں تاثرات نہایت حوصلہ افزائی ہیں ارشد اقبال چوہان عمران مظہر' محمد دانیال' خضر حیات' نازیہ بتول ودیگر خطوط احوال نامہ کی جان ہیں آخر میں مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام کی خدمت میں گزارش ہے کہ جو شمع آپ کے والد گرامی نے جلائی تھی اس کی روشنی میں ساری عمر پیراہ رہیں آپ کے برخوردار اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں اپنی طرف سے پورا تعاون آپ کے شامل حال ہے۔

☆ بھائی شیرازی! آپ کو اپنے درمیان پاکر اور وہ بھی بالکل آخری لحات میں مجھے بہت خوشی ہوئی سچی کہانیاں اب جلدی مارکیٹ میں دستیاب ہوگا اس لیے خطوط بھیجنے کی آخری تاریخ ہر ماہ کی 12 تاریخ ہوگی۔ آپ کے تبصرے نے جہاں بہت خوش کیا وہاں آپ کے خط کی آخری لائنوں نے مجھے حیرت زدہ کر دیا میں اس بات سے قطعی ناواقف تھی مگر آپ کا تعلق میرے والد سے کیسا رہا ہوگا بہت اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اسی طرح محفل میں شرکت کرتے رہیں۔

☆ حامد شکور سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ میں نے ان کہانیوں کو بہت خوبصورتی سے تحریر کیا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہ ضرور پسند آئیں گے۔ اس کہانی (سنگدل) کو میں نے ایک ماہ کے اندر تحریر کیا ہے اور (غلط راستے کا انتخاب) کو پانچ ماہ کے اندر تحریر کیا ہے۔ سنگدل حقیقت پر مبنی ہے اور ناول غلط راستے کا انتخاب بھی بہت سبق آموز ہے۔ میری والدہ نے مجھے ایک کہانی سنائی

تھی جو کہ ہمارے خاندان پر مشتمل تھی۔ رائٹر بننا میرا خواب ہے پھر میں نے اسے تحریر کیا میرے خواب کو حقیقت کا روپ صرف آپ ہی دے سکتے ہیں فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

☆ حامد فون پر آپ سے بات ہوئی تھی مجھے اندازہ نہیں کہ آپ کی کیا عمر ہے مگر آواز سے محسوس ہوا جیسے ابھی طالب علم ہیں آپ کی دونوں کہانیاں میرے پاس موجود ہیں جلد پڑھ کر بتاؤں گی کہ کب شائع ہو رہی ہیں لیکن ایک نصیحت ضرور کروں گی کہ پہلے توجہ اپنی تعلیم کو دینا' اچھا انسان بننا بہت ضروری ہے کیونکہ اچھا انسان ہی اچھا رائٹر بنتا ہے۔

فرح انیس' کراچی سے لکھتی ہیں' السلام علیکم امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے اور دعا ہے اللہ سے کہ وہ سب پر اپنا کرم رکھے آمین۔ ناصر رضا صاحب سے میری ملاقات میم منزہ کے آفس میں اور ایک دوبار کال پر بات کرنے کا اتفاق ہوا۔ بہت ہی نرم مزاج اور اچھی عادت کے انسان لگے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ سچی کہانیاں پانچ تاریخ کو موصول ہوا۔ احوال کے سب ساتھی کیسے ہیں اور تمام پڑھنے والوں کے کیا حال احوال ہیں سب کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ سب کے ہی تبصرے پڑھ کر اچھا لگا۔ منشی عزیز مئے کا طویل ترین تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ محمد سلیم اختر کی تحریر میں پشپا کماری کون تھی نے ایک تجسس چھوڑ دیا۔ اُم مناہل کی پُراسرار فقیر بھی بہت اچھی تھی کہ کسی بھی شخص کے بارے میں پتا نہیں ہوتا کہ کون کیا ہے۔ رضوانہ آفتاب کی تحریر لاجواب لگی کہ برائی کا انجام برائی ہوتا ہے۔ پھوپو کی روح نازیہ بتول کی تحریر اچھی لگی۔ الماس فاطمہ کی تحریر مردے کی فریاد میں انہوں نے بہت اچھی آخر میں بات کہی کہ مرنے والوں کو بھول نہ جائیں بلکہ ان کو یاد رکھیں اپنی دعاؤں میں اور اُن کے لیے ایصال ثواب کریں کیونکہ اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ مور شاہد حسین کی تحریر دو بدروحیں پڑھ کر کافی ڈر محسوس ہوا زبردست' زین شمسی کی تحریر اسماء کہاں گئی کافی پُراسرار لگی اور ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئی کہ اسماء کہاں چلی گئی یا اس کو وہ دوسری مخلوق اپنے ساتھ لے گئی۔ ابھی اتنی ہی پڑھی ہے کہانیاں' باقی بھی سب کی کہانیاں امید ہے بہت اچھی ہوں گی اجازت چاہتی ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ سچی کہانیاں کے محبت نمبر کے حوالے سے ایک سچی کہانی راجکماری بھیج رہی ہوں۔

☆ پیاری سی چھوٹی سی فرح! تمہارا بروقت تبصرہ پا کر تو میرا ڈھیروں خون بڑھ گیا...... مجھے اپنے نوجوان لکھنے والوں سے بہت امیدیں ہیں تمہاری پُراسرار اور سچی کہانی دونوں میرے پاس ہیں راجکماری انشاء اللہ عشق نمبر کا حصہ ضرور بنے گی۔

اس آخری خط کے ساتھ اجازت دیجیے اگلے ماہ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ کوئی شکایت ہو تو بلا جھجک اپنی مدیرہ اعلیٰ سے رابطہ کیجیے میں صبح 12 بجے سے شام 4 بجے تک آفس میں موجود ہوتی ہوں۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی علم سے آباد ایک زندہ تحریر

دُختر کاہن

(آخری حصہ)

حسرت موہانی کا خیال

> اے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
> سوغات عشق لا رہے ہیں کوئے بتاں سے ہم

م۔ن۔خ

''میں اسے سلاکر آتی ہوں۔'' پھر ہاران اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ کمرے سے چلی گئی۔ ہاران کا سانس تیز چل رہا تھا۔ وہ کھسیاہٹ اور غم سے اس لڑکی کو دیکھتا ر



اسے لگا کہ ممتا کے جذبے نے ہر جذبے کو شکست دے دی۔ نہ جانے کس کمرے میں ھوا' صفورہ کو سلا رہی تھی لیکن اس کمرے میں بستر پر نیم دراز وہ الجھی الجھی سوچوں میں گم لیٹا رہا اور بہت دیر بعد جب ھوا اسے سلا کر کمرے میں آئی تو ہاران سو چکا تھا۔

صبح جب وہ نیند سے جاگا تو اس نے دیکھا' ھوا قالین پر تکیہ لیے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔

اس شادی کی ابتدا ہی عجیب تھی جو معمول بن گئی۔ دن رات ایسے ہی ہوتا' جب بھی وہ دونوں ہوتے' صفورہ مسئلہ بن جاتی پھر ہاران کوئی خوشی محسوس نہ کرتا اور ھوا بھی مضمحل اور پریشان ہو جاتی اور جب صفورہ سو جاتی' ھوا سونے آتی تو ہاران کو لگتا کہ اس کا خیال' اس کی سوچ' سب کچھ بہت دور ہے اور اس کے پاس صرف وجود ہے۔

ہاں' اس کی مسرت کا وقت وہ ہوتا جب صفورہ ان دونوں کے درمیان بستر پر لیٹی ہوتی' تب وہ ہنستی' خوش ہوتی' گنگناتی اور بہت ساری باتیں کرتی' تب ہاران اپنے اضطراب کو دبا نہ سکتا۔ اسے لگتا' کوئی اندر سے کہہ رہا ہے۔

'ہاران......! ھوا کی محبت مشروط ہے۔ تم اس کی بیٹی سے محبت کرو گے' اسے اس کے اور اپنے درمیان میں رکھو گے' تب وہ خوش رہے گی اور تمہیں چاہے گی۔ گویا کہ تم اس کے محبوب ہو نہ اس کی محبت کے حقدار' بس اپنی بیٹی کو خوش رکھنے کے صلے میں وہ تمہیں کچھ وقت دے کر نواز سکتی ہے۔'

یوں باغی خیالات اسے تنگ کرتے' کبھی وہ انہیں دبانا چاہتا اور کبھی محبت کے فلسفے پر غور کرتا تو اسے لگتا' یہ کوئی چیز ہی نہیں۔

ہاں' ھوا کو صفورہ سے محبت ہے اور بس' وہ خود کو سمجھاتا' تسلی دیتا۔

'ہاران......! تم دراصل ماں کی محبت سے محروم اور ناواقف ہو' تم نے نہ ماں کا پیار دیکھا ممتا کی طاقت محسوس کی۔ خدا کے بعد سب سے بڑی طاقت ممتا کی طاقت ہے اور پھر تم صفورہ کے چچا بھی تو ہو تو کیوں نا' اس مسئلے کو محبت سے حل کر دو؟''

یہ سب سوچنے کے بعد وہ اس محفل میں شریک ہوتا' ھوا سے والہانہ پن برتتا' اسے وقت دیتا اور اس کا قرب چاہتا لیکن اچانک ہی صفورہ کی کسی ضد پر محفل درہم برہم ہو جاتی۔ ایسے میں ھوا سب کچھ چھوڑ کر اس کی طرف یوں متوجہ ہو جاتی جیسے اس کا تعلق صرف صفورہ سے ہے وہ پھر بکھر جاتا۔ غرض کہ خود سے لڑنا اور خود ہی کے راستے ڈھونڈنا' اس کے سکون کو پامال کرتا اور وقت گزرتا رہا۔

کہتے ہیں کہ جتنا کم فاصلہ شرافت اور بز... میں ہوتا ہے' اتنا ہی کم فاصلہ فرزانگی اور دیوانگی میں ہوتا ہے۔ منفی یادیں ہی تو ہوتی ہیں جو انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہیں مگر یہ لفظ بھی تو فرزانہ لوگ ہی استعمال کرتے ہیں ورنہ یادیں تو حقیقت ہوتی ہیں اور ہاران کے قلب و ذہن سے بھی کچھ یادیں ٹکرانی شروع ہو گئی تھیں۔ جن باتوں کو ... مثبت انداز میں یاد کیا تھا' اب وہی کچھ ... لگاتیں۔

'ہاران......! وقت جب گزرتا ہے تو ... دے جاتا ہے اور کچھ لے جاتا ہے۔ ہاں' تم... وقت نے ہر شئے لاثان کے بعد دی' شاید ... لیے کہ تمہارے ماں باپ مر گئے تھے اور ... کرنے والا چچا لاثان کو تم سے زیادہ چاہتا ...

اس نے ہر چیز لیں اس کے بعد دی۔ لاثان
نے کھانا کھالیا؟'' جواب۔ ''ہاں۔'' میں ملتا تب
وہ پوچھتا۔

''اور تم نے بھی کھالیا؟'' ''یہ کتاب پہلے
لاثان پڑھے گا پھر تم پڑھ لینا' لاثان نے تیرنا سیکھ
لیا' اب تم بھی سیکھ لو' یہ لباس لاثان کے چھوٹا ہوگا'
اسے تم پہن لو۔''

یہ سب باتیں اسے یاد آتیں تو وہ درہم برہم
ہو جاتا۔ اسے لگتا' وہ عمر بھر لاثان کا جھوٹا کھاتا رہا
ہے اور اب اس کی محبت بھی اسے جھوٹی ہو کر ملی
ہے پھر سوچیں پھیلنے لگتیں۔ وہ کہتا۔

'ھوا......! تمہاری محبت نہیں' اب لاثان کے
بچے کی ماں ہے اور بابا' ھوا کے باپ ہیں۔ اس
گھر میں کوئی تمہارا نہیں۔ تم ایک فالتو شئے ہو یا
پھر ھوا کے چوکیدار اور بابا کے مددگار ہو۔' یہ سب
سوچیں اسے نڈھال کر دیتیں۔ ایسے ہی ایک دن
رات بھر کے اضطراب کے بعد وہ صبح سے دوپہر
تک کا وقت باہر گزار کر ھوا کے قرب کی آرزو لیے
واپس آیا تو صفورہ بدستور رو رہی تھی اور ھوا اسے
بہلانے میں مصروف تھی۔

اس مصروفیت میں اس نے نہ اسے دیکھا' نہ
اس کی آرزو کو محسوس کیا۔ ہاران غصے سے پاگل
ہو گیا۔ اسی کیفیت میں رات گزر گئی تھی اور اب
آدھا دن وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے
اسی طرف بڑھ گیا۔

زینب سہم کر ہٹ گئی اور ھوا دیکھتی رہ گئی اور
ہاران نے آگے بڑھ کر صفورہ کو بازوؤں سے
پکڑ لیا اور بولا۔

''تو ہر وقت کیوں روتی ہے؟''

ہر قسم کی سزا' غصے اور مار پیٹ سے ناواقف
بچی خوفزدہ ہو گئی اور ھوا غصے سے سب کچھ بھول کر
آگے بڑھی۔ پوری قوت سے اس کی گرفت
اسے کھینچا اور بولی۔

''تم کون ہوتے ہو اسے مارنے والے

ہاران نے پہلی بار اسے غیض و غضب
عالم میں دیکھا تھا۔

ان آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔
آمد اور اس کی ہر ضرورت کو نظر انداز کر کے
کے لیے دیوانی ہو گئی تھی۔ اسے ہنسی آ گئی
طنزیہ ہنسی۔ اس نے کہا۔

''ممتا نے جوش مارا ہے؟''

''ہاں' میں اپنی بیٹی کی تکلیف برداشت
کر سکتی۔''

''اور شوہر کی؟'' ہاران نے غصے سے
''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' ھوا نے نا
سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں ہر وقت کا یہ رونا' دھونا اور بے ہنگم
برداشت نہیں کر سکتا۔'' ہاران نے تلخی سے کہا

''تو اپنے کمرے میں بند ہو جایا کرو ور
سے باہر چلے جایا کرو۔'' ھوا کے لہجے میں
سے زیادہ تلخی بھر گئی تھی۔ صفورہ کو سینے سے لگ
جاتے جاتے بولی۔

''صفورہ بچہ ہے' تم بچہ نہیں ہو۔'' وہ چ
اور ہاران اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ دو کے در
جھگڑے میں صلح اور ملاپ مزہ دیتا ہے لیکن
جھگڑے کا باعث تیسرا فرد ہو تو صلح کی گنجائش
ہے نہ ملاپ محبت بڑھاتا ہے۔ اس رات
صفورہ کو سلاتے ہوئے ھوا دکھ سے سوچ
تھی۔

'ھوا......! وہ محبت کرنے والا ہاران
گیا؟ تم زبردستی اس کے بھائی سے بیاہ دی
پھر اس کی بچی کی ماں بن کر بیوہ ہو گئیں۔ اس

تمہارا کیا قصور تھا؟ یہ نفرت کیوں ہے؟ بے زاری کیوں ہے؟' سوچیں پھیلتی رہیں۔ ماضی' حال اور مستقبل گڈمڈ ہوتے رہے اور اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ عین اسی وقت ہاران بھی ان ہی سوچوں میں غرق' گئے وقت پر حیران سا اس تبدیلی پر افسردہ تھا۔ اس نے سوچا۔

'ہاران! یہ حوا وہ نہیں ہے جو تمہاری تھی جسے جدائی کے ہر لمحے تم نے یاد کیا' یہ تو صرف صفورہ کی ماں ہے۔'

یہ تصور صفورہ سے مزید بے زار کرتا رہا اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نہ جانے کیوں ایک عجیب سی آس تھی کہ شاید حوا منانے آجائے اور اسی وقت صفورہ کو سلا کر حوا مضطرب سی کسی آواز' کسی پکار کو سننے کی تمنائی تھی مگر نہ وہ آئی اور نہ ہاران نے اسے بلایا اور رات بیت گئی۔ دونوں بے قصور تھے اور دونوں مجبور۔

انسان کس قدر بے بس ہے' اسے خود بھی اندازہ نہیں۔ کبھی اپنے ہی جذبوں سے ہار جاتا ہے۔ یہی کیفیت ان دونوں کی تھی۔ ایک دوسرے کے لیے اپنے اپنے دلوں کو سمجھاتے مگر اظہار کے وقت دونوں ہی ہار جاتے اور ساتھ ساتھ ہو کر بھی بہت دور ہوتے۔

صفورہ' حوا کے ساتھ سونے کی ضد کرتی لہٰذا اس چیخ و پکار سے بچنے کے لیے حوا اسے اپنے ساتھ سلاتی اور جب اس کی نیند گہری ہوجاتی تو اسے زینب کے پاس چھوڑ آتی۔

اپنے خیال میں وہ دونوں سے انصاف کررہی تھی لیکن ان ہی اوقات میں بستر پر چپ چاپ لیٹا ہوا ہاران بڑے دکھ اور بڑے غم کے ساتھ وہ بات سوچتا جو اس کی انا' خودداری اور مان کو کچل کچل دیتی۔

ہاران......! یہ گھر تمہارا نہیں ہے۔ بابا
در پر پلنے والے لڑکے......! تم تو اس گھر کو چھو
چلے گئے تھے پھر تمہیں کسی نے بھی نہیں بلایا تھ
اب اس گھر کی بنیاد لاثان اور حوا کی محبت ہے
صفورہ اس محبت کی نشانی ہے اور تم؟ تم ایک
مد ہو۔

ان میں سے کسی ایک کو بھی تمہاری ضرو
نہیں۔ بابا کو اپنے تعلیمی سفر پر جانے کے لیے
گھر میں ایک نگہبان کی ضرورت تھی۔ تم وہ ہو

یوں وہ اپنی آنکھوں سے خود گر جاتا اور
حوا' صفورہ کو دوسرے کمرے میں چھوڑ کر آ
مایوس ہو کر وہ آنکھیں موند لیتا۔ دونوں ہی
جگہ سچے تھے مگر ایک دوسرے کو سمجھ نہ سکتے
ان دنوں حالات کا تجزیہ کر کے حوا کئی دن
صفورہ کو سمجھا رہی تھی۔

''صفورہ......! تمہارے پاپا کو رونا اور
پسند نہیں ہے' تم رونا چھوڑ دو۔''

''مگر وہ میرے پاپا نہیں' چاچا ہیں۔'' ص
نے یاد دلایا۔ ''پہلے وہ مجھے پیار کرتے تھے'
نہیں کرتے' ناراض ہوتے ہیں۔''

''جب تم رونا چھوڑ دو گی' انہیں پاپا کہ
تب وہ تمہیں خوب پیار کریں گے۔'' حوا نے
سے سمجھایا تو صفورہ نے اس شخص کو دیکھا جو ا
بھی بہت پسند تھا جس کے آتے ہی وہ اپنے
بھولنے لگی تھی۔ اس نے دیکھا' وہی شخص
چمن میں اپنے نئے آنے والے دوستوں
ساتھ محو گفتگو تھا۔ کسی نے کہا۔

''ہاران! تو نے چپ چاپ شادی کر
یاد رکھ' اب ٹھاٹ دار دعوت کے بغیر بیوی ک
دکھائی نہیں ملے گی۔''

''دیکھو' منہ دکھائی سے فائدہ بیوی کو ہو گ

خوشخبری

سچی کہانیاں بہت جلد اپنے صفحات پر ان لکھاریوں کے
انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر رہا ہے جو طویل عرصے سے
سچی کہانیاں سے جڑے ہوئے ہیں۔ قارئین ان
لکھاریوں کی پسند ناپسند' ان کے زندگی کے بارے
میں تجربے اور تجزیے اور انہوں نے لکھنا کب اور کیسے
شروع کیا جاننا چاہتے ہیں۔

لہٰذا سوچیے مت اور اپنی ایک شاندار سی تصویر کے
ساتھ فوراً ہمیں بھیج دیجیے اپنا تازہ ترین انٹرویو......
نوٹ: یہ انٹرویوز نمبر وار شائع کیے جائیں گے۔

لیعنی پہلے آیئے پہلے پایئے کی

بنیاد پر تا کہ کسی کو بھی شکوہ نہ ہو

دعوت میری جیب خالی کرنے کی۔ ہاران نے قہقہہ لگایا۔ ''کوئی بات میرے فائدے کی کرو۔'' کسی نے کچھ کہا' کسی نے کچھ۔ سب ہی قہقہے لگا رہے تھے۔ دور سے صفورہ کو بھی یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بھی دوڑتی ہوئی اس محفل میں پہنچ گئی اور دور سے ہی چلائی۔

''پاپا......! پاپا......!'' اس کے خیال میں ہاران کو اس بات پر خوش ہونا تھا مگر ہاران کے اندر آگ لگ گئی تھی۔ سب نے اس بچی کو چونک کر دیکھا۔ شادی کی خبر سنتے ہی چار برس کی اولاد اور ''پاپا......! پاپا......!'' کی پکار بڑا خوب صورت مذاق تھا۔ کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔

''کیوں یار' بڑی جلدی باپ بن گئے؟ یہ ''طریقہ'' ہمیں بھی بتا دو؟''

''لگتا ہے کہ تجارت پر جانے سے قبل بنیاد رکھ گئے تھے اور شادی واپس آ کر کی ہے؟'' سب کا ساتھ دینے کے لیے ہاران بھی ہنس دیا۔ ایک زہر خند ہنسی' ایک خطرناک ہنسی۔ صفورہ اب بھی ''پاپا......! پاپا......!'' کر رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اسے لیے ہوئے ھوا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ اس بات سے لاعلم کسی کام میں مصروف تھی۔ ہاران نے اسے دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اسے سنبھالو۔ کیا تم اسے باہر بھیج کر اعلان کرنا چاہتی ہو کہ پچھلی شادی کی نشانی ساتھ لائی ہو یا یہ بتانا چاہتی ہو کہ میں عمر بھر بھائی کا جھوٹا کھاتا رہا ہوں؟'' الفاظ سے زیادہ اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

وہ پلٹ کر چلا گیا اور ھوا حواس باختہ سی دیکھتی رہ گئی۔ تذلیل' توہین اور ذلت کے ہر احساس نے پاگل کر دیا تھا۔ اس نے پاس کھڑی صفورہ کو دیکھا اور ایک بھرپور چانٹا اس کے رخسار پر رسید

کر دیا۔ اس چہرے کو ہی ہوئی پی نے بے یقی دکھ سے اسے دیکھا اور جہاں کھڑی تھی' بیٹھتی گئی اور ھوا نے دو تین بار اس ہاتھ کو جھٹکا او دی اور پھر ہنس دی۔

بے ساختہ ہنسی اور بے ساختہ آنسو ذہنی ص کو مشکوک ظاہر کر رہے تھے مگر کسی کو خبر ہی ن تھی۔ صفورہ اپنی جگہ پڑے پڑے سو گئی اور و کے رخسار پر اپنے ہی انگلیوں کے نشان پر کرتی اور آنسوؤں سے چہرہ بھگوتی رہی ہاران اسے اس کے غصے اور ناگواری پر مح کر کے رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ چند دن ا منتشر حواس کو قابو کرنے کے بعد اس نے گلہ کیا

''ہاران......! مجھے لگتا ہے' تم صفورہ نفرت کرتے ہو؟''

''نفرت ہو جائے تو ہر شئے سے نف ہو جاتی ہے۔'' ہاران نے مضبوط میں کہا۔ ''وہ تو تمہاری بیٹی ہے۔''

''بیٹی تو وہ لاثان کی بھی ہے۔'' ھوا نے کرنے کے انداز میں کہا۔ ''کم از کم اس تمہیں محبت ہونی چاہیے۔''

اس وقت ہاران اسے لمحے بھر غور سے د رہا۔ اسے لگا' ھوا یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑا ہے۔ اس کا دل چاہا' اسے اٹھا کر پھینک د خود اپنا سر دیوار سے ٹکرا دے مگر اس نے ہوئے لفظوں میں کہا۔

''میں نہ تمہاری بیٹی سے محبت کر سکتا ہو لاثان کی کیونکہ محبت سے میرا ایمان اٹھ چکا۔ لگتا ہے' میں تمہاری مجبوری ہوں اور تم نے بھی مجھ سے محبت نہیں کی۔''

''اور تم نے محبت کی ہے یا کرتے تھے؟'' غصے سے پاگل سی ہو گئی اور بولی۔ ''میں

جاتی تم محبت کرنے تھے یا نہیں لاثان کرتا تھا یا نہیں لیکن تم خود مجھے چھوڑ کر اس گھر سے رخصت ہو گئے اور جاتے جاتے مجھ سے ملنا بھی گوارہ نہیں کیا؟''

ان لفظوں سے زیادہ' نظریں زہریلی تھیں۔ ہاران دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے لگا' ھوا کے اندر کا نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ وہ پھر بولی۔

''آج تم اس بچی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لاثان کی بیٹی کو جسے تم نے میری ذات پر' میری محبت پر ترجیح دی تھی' کس محبت کا بدلہ چاہتے ہو تم مجھ سے؟'' اس وقت ہاران کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس پر رحم کھائے یا خود پر؟ محبتوں کی لپیٹ میں محبت آ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں ماضی کی نہیں' حال کی بات کر رہا ہوں۔''

''اونہہ......'' ھوا تلخی اور طنز کے ساتھ ہنس دی۔ ''جب مرد ماضی کی خطاؤں پر کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا تو صرف حال پر آ جاتا ہے۔''

ہاران کو یہ ہنسی مشتعل کر گئی۔ اسے لگا' یہ لڑکی اپنی ذہانت سے اسے زیر کرنا چاہتی ہے۔ وہ غصے سے بولا۔

''چلو' نہ ماضی کی بات کرو نہ حال کی' صرف اتنا بتا دو کہ دو محبتوں میں سے کسے انتخاب کرنا چاہو گی؟ میں تمہاری بیٹی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''یہ لاثان کی بیٹی ہے' ایش بن کالب کی پوتی ہے اور تمہاری بھی کچھ ہے۔'' ھوا نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' ہاران نے اس سے بھی زیادہ تلخی سے کہا۔

''تمہارے سوال کا جواب صرف یہ ہے کہ صفورہ کو میری ضرورت ہے۔ میں اسے نہیں سکتی اور تمہیں تو شاید میری ضرورت بھی نہیں

یہ کہتے کہتے ھوا کا گلہ رندھ گیا مگر آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس نے اپنا رخ لیا اور ہاران کے اندر غم اترتے چلے گئے ج ایک گہرے سانس سے دھکیلتے ہوئے اس نے رخ موڑ لیا۔

اس رات فاصلے اور بڑھ گئے تھے مگر بات تھی' نفرت سے ہی سہی مگر دونوں ہی دوسرے کے لیے سوچ رہے تھے۔ ھوا سوچ تھی۔

'مرد کم ظرف ہوتا ہے' اس کے نز بہترین گفتگو ہمنوائی ہے' اتفاق کا نام ہم ہے' محبت کا نام ہماری چیز۔ خوشی اس کی مرضی ہر بات سہہ لینا اطاعت ہے۔ جب اور جہاں اور نے سر اٹھایا' سارے جذبے دم توڑ د ہیں'

اور اسی وقت ہاران سوچ رہا تھا۔ 'عو خود غرض ہوتی ہے۔ ممتا کے سوا کسی جذبے آشنا نہیں ہوتی۔ وہ ہر سکھ دے سکتی ہے جو خود چاہتی ہے۔' یہ سوچیں نفرتوں کو بڑ رہیں اور دونوں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے رہے اور وقت گزرتا رہا۔

جو لوگ مقرر کردہ راستوں پر نہیں چلتے' لیے خود راستے منتخب کرتے ہیں۔ کبھی کبھی غلط راہ پر نکل جاتے ہیں اور ہاران اسی با عادی تھا۔ اب اسے سمجھوتہ نہیں کرنا تھا' اپن چھیننا تھا یا سب کچھ ٹھکرا کر چلے جانا تھا اور راستہ اب اس کے سامنے تھا' فرار' ایک ط سفر' ایک لمبی جدائی لیکن ھوا کے سامنے اس گھ صفورہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ صفورہ کو چھوڑ دینے

سوا وہ ہاران کے لیے سب کچھ کرسکتی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ چاہتا ہی نہ تھا۔ وہ یہ سوچتی' پاگلوں کی طرح اِدھر سے اُدھر پھرتی' غم کی بات سننے پر ہنسنے لگتی اور ہنسنے کی بات پر رو دیتی نہ محبت پر یقین باقی تھا نہ محبتوں کا یقین دلانے کا وقت باقی رہا تھا۔ بابا تعلیمی سفر سے واپس آنے ہی والے تھے لیکن ہاران انتظار کرنے کو تیار نہیں تھا اور حوا اسے روک لینا چاہتی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ فیصلہ کرچکے تھے۔ یہ آخری رات تھی' بڑی تکلیف دہ' بڑی طویل جو رینگتی رہی۔ وہ دونوں تیاری کرتے رہے...... اور...... حوا جیت گئی۔ اس نے اسے روکنے کا فیصلہ کرلیا ہمیشہ کے لیے' ابد تک کے لیے۔ اس صبح زینب آئی تو حوا کی گود میں ہاران کا سر تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ نیلا ہوگیا تھا۔ حوا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زینب سے کہا۔ ''آہستہ بولو' ہاران کو سونے دو۔'' زینب چیخیں مارتی ہوئی واپس بھاگ گئی اور حوا نے ہاران کو سینے سے لگالیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے علاقے والوں سے گھر بھر گیا۔ کوئی بولا۔ ''ارے' ہاران مر گیا۔'' کوئی چلایا۔ ''اسے تو زہر دیا گیا ہے۔'' حیرت زدہ کہرام مچ گیا تھا۔ عین اسی وقت شور بلند ہوا۔ ''معزز کاہن' ابراہیم بن کالب آ گئے۔'' اس وقت حوا آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ''شور مت کرو' ہاران جاگ گیا تو چلا جائے گا۔''

ہاران کی لاش لے لی گئی۔ ماہر طبیب کا کہنا تھا کہ زود اثر زہر نے اس کے قلب و جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ حوا پکڑی گئی۔ مقدمہ دائر کیا گیا جس کا فیصلہ بیت المقدس کے جلیل القدر کاہن کو کرنا تھا۔ وہ ہاران کا ولی بھی تھا اور اس کا انتقام لینے کا ذمے دار بھی۔ شاید یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا۔ مجمع عام میں اور کاہن بھی تھے' معززین بھی اور تماشائی بھی۔ تمام واقعا
سامنے تھے۔ شہادت' گواہیاں ہاران کی زہر
موت اور حوا کو قاتل ثابت کرچکی تھیں۔ آج
دن ایک باپ کو فیصلہ سنانا تھا اور ایک بیٹی سزا
موت کی مستحق تھی۔ اس وقت رواج کے مطا
ان سب کے سامنے ابراہیم بن کالب کو مجرم
منہ سے جرم کا اعتراف سننا تھا۔ اس نے دکھ
پوچھا۔

''حوا بنت ابراہیم' یہ سب کچھ کیوں ہوا
اس بارے میں کچھ کہنا چاہو گی؟''

''کچھ نہیں ہوا بابا!'' حوا نے بہکے ہو
انداز میں کہا۔ ''پچھلی بار ہاران مجھے بتائے
چلا گیا تھا مگر اب میں اسے نہیں جانے دوں گی

ابراہیم بن کالب نے اسے پاگلوں کی ط
دیکھا۔ بہت سارے پردے اس کی آنکھوں
اٹھ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہا
جس بیٹی کو تمناؤں سے مانگا تھا' عمر بھر علم حا
کرنے اور کائنات کے ذرے ذرے سے
والا عالم' اسی کے جذبات سے ناواقف رہا
جانے وہ اپنی کم علمی پر رو دیا یا اپنی بیٹی پر؟
وقت بہت سے اور لوگ بھی رو رہے تھے۔
وقت پوری طرح حواس کھو دینے کے بعد
کھڑے کھڑے گر گئی۔ شاید اس کی محبت کسی
کسی زہر اور ہتھیار کی محتاج نہ تھی۔ اس ر
علاقے میں دو قبریں پاس پاس بنائی گئیں
بوڑھے کاہن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ا
رخصت کیا۔ وہاں جہاں آج صرف وہ دو
تھے پھر صفورہ کا ہاتھ تھامے اسی ویران گھ
طرف بڑھ گیا جس کے لیے منصب اور اولاد د
تھا' آج وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆......☆☆

سحر ہونے تک

اس کا بھائی پیشہ وارانہ ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے لاپتہ ہوا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور ماں بھی اسی طرح تڑپے جیسے اس کی ماں زندگی کے آخری لمحے تک تڑپتی رہی......

سچے واقعہ پر مبنی خصوصی تحریر سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے

احمد توفیق جیلانی

موٹر کار پر لاڑکانہ سے موہنجودڑو کا فاصلہ تقریباً چالیس منٹ کا بنتا ہے۔ ایئرپورٹ کی خوبصورتی اپنی جگہ لیکن یوکلپٹس سے مزین اپروچ روڈ کا حسن بے مثال مسافر کو گاڑی دھیمی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ قومی ایئرلائن کی فوکر فلائٹ براستہ حیدرآباد مقررہ وقت سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر کے بعد موہنجودوڑو لینڈ کی۔ گنتی کے چند مسافروں کو لے کر سرکاری وین ایئرپورٹ سے روانہ ہوئی، لیکن Acacia اور ببول کے چھدرے جنگل کو عبور کرنے کے دوران اور لاڑکانہ روڈ جڑنے سے پہلے جانے کہاں غائب ہوگئی۔ دو گھنٹے سے منتظر ایئرلائن انتظامیہ نے بالآخر مقامی پولیس کو الرٹ کر دیا۔ نتیجتاً ایک پانچ کی نفری پر مشتمل ریکی کو پٹرول ڈسپیچ کر دیا گیا۔

ایئرپورٹ سے تقریباً ایک کلومیٹر پہلے سڑک کی بائیں جانب پانچ سو گز دور ٹیلے پر واقع یہ گوٹھ اس لیے بھی منفرد نظر آتا کہ خاصی اونچائی پر واقع تھا۔ پولیس پٹرول جب گوٹھ کے عین متوازی پہنچا تو سڑک کے اطراف نشیبی علاقوں سے اس شدید آٹو میٹک فائر کیا گیا۔ عوامی غم و غصہ نفرت کے اظہار کا اندازہ لگایئے کہ ٹیوٹا اپ پر تقریباً چار ہزار سات سو راؤنڈ فائر گئے۔ پانچوں پولیس اہلکار موقع پر ہی جان ہاتھ دھو بیٹھے۔

یہ روداد کمشنر لاڑکانہ اسلم سنجرانی نے بہ نف نفیس آ کر سنائی جو بے تابی سے ٹیلی فون پر را کرنا چاہ رہے تھے۔

ڈپٹی کمشنر خالد سمرو کے ہمراہ ہم موقع پہنچے۔ جائے وقوعہ ایک دردناک ڈرامے کا عن دے رہا تھا۔ خون میں نہائی پک اپ اور پول نفری کے جابجا بکھرے چیتھڑے ایک مرتبہ تو ج آزمودہ فورس کے بھی رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

تمام صورت حال کا جائزہ لیتے میرے ذ میں اِن نکات نے سر اٹھایا۔

☆ پسنجر وین کا Waylay ہونا اور پول نفری کا قتل......

☆ ان دونوں جرائم کا آپس میں کوئی تعلق تھا یا یہ ایک محض Coincidence؟

☆اس طرح کے سنگین جرائم کا دن دیہاڑے یوں سرزد ہونا' ناقابل فہم تھا۔

☆ کیا اونچائی پر واقع گوٹھ 'قاضی' میں ایسے لوگ تھے جو اس گھمبیرتا کے عینی شاہد تھے؟

☆ کیا گوٹھ قاضی کے مکین اس جرم میں بل واسطہ یا بلاواسطہ شریک تھے؟

☆ آخر یہ جرم اتنی دیدہ دلیری یعنی سڑک کے پہلو میں لگے سروٹوں کی آڑ لے کر کیوں دن کے ساڑھے بارہ بجے کیا گیا جو ڈاکوؤں کے طریقۂ واردات کے عین منافی تھا؟

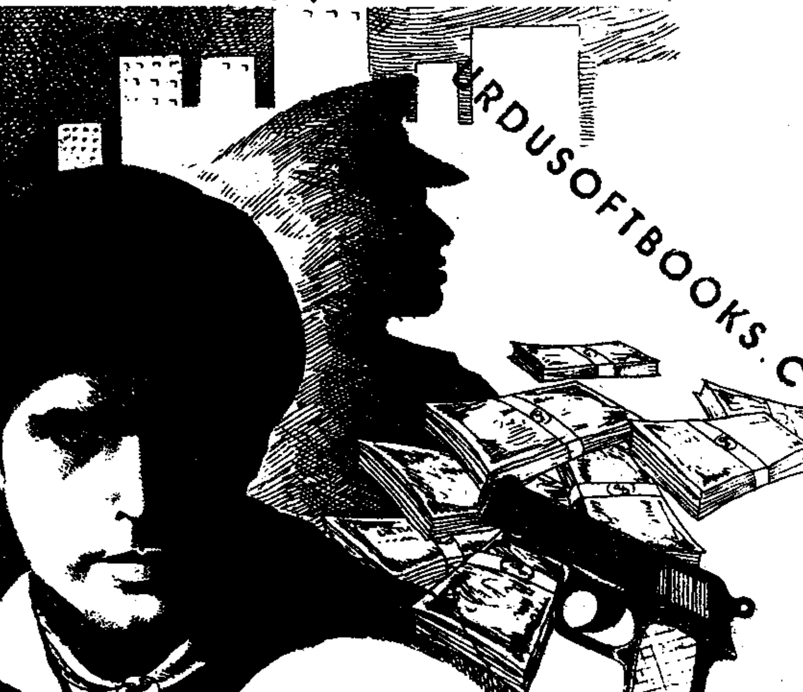
☆ پسنجر ویگن سے تقریباً چھ یا سات مسافر اغواء کئے گئے جن میں سے فقط دو عدد مغوی مالداری کے زمرے میں آتے بقیہ غریب غربا

تھے ان کے اغواء کا کیا مقصد تھا؟

مندرجہ بالا نکتے میرے ذہن میں
کھدبد پیدا کرتے رہے۔

گوٹھ قاضی کی جانب بڑھتے میں نے
کمشنر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے
وقت بہت کم ہے سب سے پہلے تو ہم
Determine کرنا ہے کہ آیا دونوں وارد
کا آپس میں کوئی باہمی تعلق تھا یا نہیں؟ ا
جواب ہمیں اگر گوٹھ قاضی سے نہ ملا تو ترجیحا
مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں پہلے پولیس نفری
قاتلوں کے پیچھے جانا ہوگا۔

یہ ایک 'اور' گاؤں تھا جو زمین سے اونچ
واقع ہونے کے باعث دور دور تک کے علا
Dominate کیے ہوا تھا۔ گوٹھ کے عین بیچ
اونچائی پر ایک خوش نما مسجد کے در و دیوار کو



ثقافت اور [illegible] اور پھیکے رنگوں سے مزین کر رکھا تھا۔ امام مسجد نے نہایت سرد مہری سے ہاتھ ملاتے پہلے تو ہمارے آنے کی وجہ پوچھی۔ پھر خالد سمرو کی خواہش پر گوٹھ کے مرد حضرات کو بذریعہ لاؤڈ اسپیکر اکٹھا ہونے کا بادل نخواستہ اعلان جاری کیا۔ چالیس پچاس حضرات کے اس اجتماع کے چہرے مہرے سے گستاخی، غم و غصہ اور نفرت کے جذبات کا بخوبی اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ باوجود اس کے کہ ڈپٹی کمشنر نے پولیس نفری کے بہیمانہ قتل کا بڑا جذباتی نقشہ کھینچا اور یہ بھی باور کروایا کہ یہ بدنصیب پولیس فورس اغوا کاروں کا پیچھا کرنے جا رہی تھی پر یہ سب سننے کے باوجود، مدد تو کیا اجتماع ٹس سے مس نہ ہوا۔

خالد سمرو نے زچ ہوکر میری طرف دیکھا۔

مائیک سنبھالتے میں نے وہ سب کچھ دوبارہ دہرایا جو خالد سمرو پہلے کہہ چکا تھا۔ جوش خطابت میں یہ بھی کہہ ڈالا کہ گاؤں والوں کی خاموشی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس جرم میں آپ تمام حضرات برابر کے شریک ہیں اور نہ ہی یہ بات قابل قبول ہے کہ کسی نے نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا۔

'نہ دیکھنے والی' بات کو تو شک کا فائدہ دیا جاسکتا تھا۔ لیکن ایک ہزار گز دور سے چار ساڑھے چار ہزار آٹومیٹک فائر کی گھن گرج آپ تک نہ پہنچنا کسی طرح بھی قابل یقین نہیں ہے۔ ساتھ ہی میں نے اپنی نفری سے چار جوانوں کو جائے واردات کی جانب بھیجنے اور وہاں جا کر ہوائی فائر کرنے کے احکامات جاری کیے۔

ڈیمو پارٹی ابھی پہنچی بھی نہ تھی کہ مجلس میں سے ایک صاحب جو پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر

سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ [illegible]

''سائیں پچھلے چاند چوری کی تفتیش کر
پولیس ہمارے گوٹھ میں آئی گھر گھر تلاشی
دوران جو قیمتی شے ہاتھ لگی بحق سرکار ضبط کر
گئی۔ پھر دس مانو (بندے) تھانے لے گئے
ان کی خلاصی کے لیے پانچ لاکھ روپے طلب
کیے۔ غریب مانو پیسہ کہاں سے لاتے مال مویشی
اونے پونے بیچا اور جان چھڑوائی۔

دریں اثناء فائر پارٹی نے موقع پر واردات
پہنچ کر ہوائی فائر کیے۔ نا صرف صاف صاف
آواز آئی بلکہ نفری کو بھی اتنے فاصلے کے باوجود
بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔

سائیں اس سے بھی زیادہ آواز آئی گوٹھ کے
ہر مانو کو پتہ تھا کہ 'دھاڑیل' پولیس پارٹی پر گھات
لگانے کو ہیں۔ لیکن جب ہر غریب کو لوٹا گیا تو
سب بھی اندھے لولے بن گئے۔

گاڑی میں بیٹھتے خالد سمرو سے کہا۔

''پولیس پارٹی پر گھات لگانے کا مقصد مغوی
پارٹی کو بھاگ نکلنے کا موقع دینا تھا۔ لیکن قائم
گوٹھ کی لاتعلقی اور بے حسی آئندہ برے وقت
پیشگی تنبیہ ہے۔ جانے قانون نافذ کرنے وا
ادارے یہ کب سمجھ پائیں گے۔''

کیکر اور ببول کے چھدرے جنگل
گزرتے ہم بالآخر دریائے سندھ کی کئی
شاخوں کے کنارے جا لگے۔ ٹویوٹا ہائی
دلدلی علاقے میں ٹائروں تک دھنسی کھڑی تھی
بدقت دشواری ہم پانی میں اتر گئے۔ گولڈ
چاہوں کی بلاخوف وخطر ڈاریں لاتعلقی سے
بیٹھی اور لانبی چونچوں سے کیچڑ میں چھبو کے
لگا چلوہ مچھلی کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ ڈیڑھ
سے دو فٹ گہرے پانی سے گزرتے ہم

اروں اور دیکھ پاؤں کے قدموں کے نشانات پر چل رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ڈاکو اب تک دریا عبور کر چکے تھے۔ ہوا کے جھونکوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کردیا۔ ہلکے سیاہی مائل بادل تیز رفتاری سے گھرے چلے آرہے تھے۔ میں نے خالد سمرو کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تو بولا۔

''سر اشارے مل رہے ہیں آفات ناگہانی کے......!''

واضح قدموں کے نشانات ابھی تک تو ہمیں صحیح سمت لے جارہے تھے لیکن اس کا رخ دریا کی بجائے بائیں جانب دلدلی علاقے کی طرف تھا۔ ڈاکوؤں کا یہ ایک سمجھ میں آنے والا پیٹرن تھا۔ دشوار گزار اور دلدلی علاقہ آپ کے اندر مایوسی اور بے حوصلگی کے ساتھ ساتھ آپ کو جسمانی طور پر بھی مفلوج کردیتا ہے۔

حدنگاہ ان نیلگوں آب گاہوں اور پر لاتعداد پرندے جو وسطی اور شمالی ایشیاء میں پیدا ہوتے اور پرورش پاتے ہیں اور براستہ افغانستان سندھ کی آب گاہوں پر آکر قیام کرتے ہیں۔ جو ہجرت کرکے آنے والے پرندوں کی سرمائی رہائش گاہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ 'کٹی ویک' سی کل سے ملتی جلتی شوخ اور چلبلی قسم کی مرغابیوں کی ایک ڈار ہم سے کوئی تین سو گز کے فاصلے سے یکدم ہوا میں بلند ہوئی۔ میں نے فورس کو ہش ہش ہش کی آواز سے تنبیہ کرتے پوزیشن لینے کا اشارہ کیا۔ جہاں سے کٹی ویک کی ڈار مضطرب ہوئی تھی وہ گھنے سروٹوں میں گھری ہوئی تھی۔ ایک Uneasiness نے جیسے میرے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ کیا کوئی حرکت دیکھی ہے؟ خالد سمرو نے میری طرف دیکھتے پوچھا۔ جواب دیے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے ساتھ ہی میرا وائرلیس آپریٹر بی
ہوکر وائرلیس کا انٹینا ایڈجسٹ کرنے لگا۔
چیرتی ایک Muffled آواز آئی وا
آپریٹر خاموشی سے زمین بوس ہوگیا' چند لمحوا
لیے میں ہکا بکا رہ گیا۔

نامعلوم گولی کہاں سے آئی؟

سندھ تعیناتی کے دوران سگنلر گل معروف
اول سے میرے ساتھ رہا۔ اس کا یوں جا
ہاتھ دھو بیٹھنا میری سمجھ سے باہر تھا۔ نہ
خون...... فقط ایک چھوٹا سا سوراخ دل کے
بیچ اور بس......!

''ایک چھوٹے ہتھیار سے فائر کردہ گ
نشان ہے۔''

میں نے شہید کے جسد خاکی کو الٹتے
ہوئے کہا۔

''ایک طرف تو چھٹی حس جس نے
بروقت الرٹ کردیا اور دوسری جانب
معصوم جان کا یوں چلے جانا؟'' اُداسی' غم
اور مایوسی نے مجھے گھیر لیا۔

فرسٹریشن میں گل معروف کے ہتھیار کی
میگزین سروٹوں کی طرف فائر کرتے خالی کر
فلک شگاف چنگھاڑ نے ہلکورے لیتی آب گ
اور ان کے کناروں پر اچھل کود میں مص
چہچہاتے چرند پرند کو تتر بتر کردیا۔ انواع و
کی مرغابیاں آسمان پر اضطرابی کیفیت میں
ترچھی اڑنے لگیں۔

گل معروف کی لاش ہیڈ کوارٹر روانہ ک
میں نے بقیہ افسران کے ساتھ صورت ح
جائزہ لیتے تہیہ کیا کہ اپنے 'بنیادی مشن' کو
رکھا جائے گا۔ قارئین کی خدمت میں یہ بھی
کرتا چلوں کے لاڑکانہ سے کوچ کرتے می

[illegible] میں بعد ازاں پار اپنی فورس کو اس [illegible]
واردات اور پولیس نفری کے بہیمانہ قتل کے بارے میں تفصیلی رپورٹ ڈسپیچ کروادی تھی۔ جس کے ردعمل میں فورس کمانڈر نے نہایت دانشمندی کا مظاہرہ کرتے تمام متوقع گزرگاہوں کی ناکہ بندی کردی۔ نتیجتاً ڈاکوؤں نے دریا عبور کرنے کی بجائے وہ دلدلی راستہ اختیار کیا۔ جس پر ہم اُن کا تعاقب کررہے تھے۔

یکا یک ہوا میں خنکی بڑھ گئی۔ بادلوں کی ساخت اوران کے پیٹرن سے صاف عیاں تھا کہ بارش برسنے کو تیار کھڑی ہے۔ فی الوقت اغواء کاروں کے قدموں کے نشان ہماری مدد کررہے تھے لیکن بارش کی صورت میں ہمارے لیے نئے مسائل کھڑے ہوسکتے تھے۔

شام ڈھلنے کو آئی۔ دلدل نے اب چھ سے آٹھ انچ گہرے پانی کی شکل اختیار کرلی۔ کیچڑ، دلدل اور پانی میں چلتے پاؤں کی حالت مخدوش ہوگئی۔ میں چاہ رہا تھا کہ جوتے جرابیں اُتارکران کو ہوا لگاؤں لیکن موقع نہ مل سکا۔ بائیں پاؤں کی ایڑی پر غالباً پانی اور گیلی جراب مسلسل رگڑ لگاتی رہی جس کی بدولت پاؤں پر زور نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے لنگڑاتے دیکھ کر خالد سمرو نے کہا۔

''سر تھوڑا بریک لے لیں۔''

''کہاں؟'' میں نے مسکراتے پوچھا۔

''سر شب بسری کے لیے ہمیں کہیں رُک جانا چاہیے۔'' خالد سمرو نے درخواست کی۔

'' بالکل رک جانا چاہیے۔'' میں نے نقشہ کھولتے ہوئے کہا۔ اگر میں اسے صحیح پڑھ رہا تھا تو یہاں 'دور دور کریس کراس' کرتے آبی گزرگاہوں اور دریائے سندھ کے کٹے پھٹے کناروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کھڑے ہوکر چاروں طرف ایک

[illegible]
میری وژن پر بری طرح اثر انداز ہورہے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے تین چار سو گز کے فاصلے پر دیکھا کہ چند لوگ ہاتھوں میں کچھ تھامے ہماری طرف بڑھتے آرہے تھے۔ پوری نفری زمین سے لیٹتے ہی متوقع معرکے کے تیار ہوگئی۔ ٹھنڈے پانی نے جسم میں کپکپی طاری کردی۔ میں نے دو بین فوکس کی۔

چار بندوں پر مشتمل یہ ٹولی بظاہر مچھیروں کی نظر آتی تھی۔ جو کم پانی میں مچھلیاں پکڑنے والے پنجرہ نما جال سے مسلح تھے۔ تاریکی اگر ہمیں اندھا کیے دے رہی تھی تو ان اندھوں کو بھی تیس بندوں پر مشتمل بندوقیں تانے نفری نظر نہ آئی۔

باہمی فاصلہ سو گز ہی رہا ہوگا جب گھات لگائے نفری ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

چیخ و پکار...... رک...... ہتھ اتے...... خبردار کے پرشگاف نعرے......!

مفلسی، محتاجی اورغربت کے مارے چاروں افراد اس غیر متوقع آفت کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ دو تو فوراً زمین پر لیٹ گئے اور بقیہ دونوں نے ہاتھ ہوا میں بلند کردیے۔

یہ مچھیرے ہی تھے۔

ان کی جامعہ تلاشی لینے کے بعد سمرو نے ان سے گوٹھ، چھپر یا کسی ٹھکانے کا پوچھا جہاں رات بسر کی جاسکتی تھی تو چاروں نے بیک وقت مشرق کی جانب اشارہ کرتے ایک ریسٹ ہاؤس کا ذکر کیا اور رضا کارانہ طور پر راہنمائی کا اظہار بھی کردیا۔

اندھیرا چھا چکا تھا اور اللہ کی رحمت برسنے لگی تھی۔

پانی میں شڑپ شڑپ کرتی نفری مچھیروں

اندیشوں نے آن گھیرا۔ لیکن ہر کس و ناکس ذہنی اور جسمانی طور پر اتنا تھک چکا تھا کہ فوجی ٹریننگ اور اس کے وضع کردہ حفاظتی تقاضوں کو بھی جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔

مکمل تاریکی، پھواری بارش اور ٹخنوں ٹخنوں پانی نے ہمارے حوصلے پست کر دیے۔ یہ عذاب تقریباً ایک گھنٹہ جھیلا۔

سمرو تھک ہار کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔

''میری بس ہو گئی سر!''

''کتنا راستہ اور ہے؟'' میں نے بے دلی سے گائیڈ کی طرف دیکھتے پوچھا۔

''سائیں اساں بنگلو دے متھے کھڑے آہے!'' (جناب اعلیٰ ہم بنگلے کے سامنے کھڑے ہیں)۔

بغور دیکھنے پر مجھے درختوں کی ایک دو رویہ قطار نظر آئی۔ جس کے درمیان گھاس پھوس سے اٹی ایک پگڈنڈی پر چلتے بالآخر ایک غیر نمایاں اسٹرکچر کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ طالب علمی کے دور میں سسپنس ماسٹر ایلفر ڈ ہچکاک کی 'PSHYCO' نامی ایک فلم نے بڑا نام کمایا۔ اس کے Schizophrenic ہیرو کا گھر ایک تاریک اور اونچی جگہ پر تنہا کھڑا فقط اس وقت اجاگر ہوتا جب اس کے پس منظر میں آسمانی بجلی کوندتی۔

جغرافیائی اعتبار سے سندھ کے طول و عرض میں بارانِ رحمت کا کال ہمیشہ سے ہی پڑا رہا۔ اگر کبھی برسنے کا ارادہ بن ہی جائے تو ہر گوٹھ کی گزرگاہ پر کسی بھی اونچے پیڑ کے ساتھ گدھا لٹکا دیا جاتا ہے جو بارش کے روکنے کا ایک آزمودہ ٹوٹکا ہے تاکہ کھجور کی فصل برسات کی تباہی سے بچ

گھن گرج اور کوندے کا کیا کام؟ واللہ ا[...]
اتفاق تھا یا کوئی مافوق الفطرت سرگر[...]
نہایت طاقتور دھماکہ ہوا جس نے پل بھر[...]
بنگلے اور اس کے اطراف کو جگمگا ڈالا۔ [...]
آٹھ سیکنڈ کے اس نور بقۂ نور نے ہم سب[...]
میں ہیبت طاری کر دی۔ خالد سمرو نے ک[...]
ورد شروع کر دیا اور میں تذبذب میں [...]
اندر جایا جائے یا نہیں، اسی ادھیڑ بن می[...]
بادلوں کی اوٹ سے چاند نے سر نکالا ایک[...]
غریب سایہ جو وقت گرہن سورج یا چاند[...]
ہوتا ہے پھیلتے پھیلتے بادلوں میں گڈمڈ ہو گ[...]
ہی چاند نے منہ پھیرا تو بارش باقاعد[...]
ہو گئی۔ حویلی نما لکڑی کے اس محرابی دروا[...]
راستہ روکنے کی خاطر لکڑیوں کے دو بچے[...]
انداز میں ٹھوک دیے گئے تھے جنہیں سمر[...]
پر مچھیروں نے اکھاڑ پھینکا۔

یہ بھوت بنگلہ تھا۔

اچھے وقت کے برے حکمرانوں کے[...]
عشرت کا اڈا!

دھول و مٹی سے اٹی ویرانی اپنی بد نصیب[...]
جگہ صف ماتم بچھاتی نظر آئی۔ لگتا تھا بج[...]
کرنے کے بعد اسے بڑی باقاعدگی سے[...]
تھا۔ بارہ خواب گاہیں اور ان سے متصل با[...]
اور وکٹورین اسٹائل ساز و سامان، جمبو[...]
لاؤنج اور تین عدد مے نوشی کے بار! سبحان[...]

زندہ آباد اسلامی جمہوریہ پاکستان!

''یہاں بجلی کہاں سے آئی؟'' می[...]
مرکزی ہال کے واحد کار آمد بلب کو جلا[...]
سے پوچھا۔

''سائیں بڑے صاحب بہت طاقتو[...]

تھے۔ جب تم چلائے تو جو ہے وہ ہو جاتا!
آتش دان کو پھٹے پھٹیوں اور ٹوٹے پھوٹے فرنیچر سے بھرتے میں نے اس میں آگ بھڑکائی' گیلے کپڑوں سے نجات حاصل کی اور رک سیک سے وردی کا نیا جوڑا نکال کر زیب تن کیا۔ جلدی میں لیا گیا 'لنچ' 'ڈنر' کے وقت استعمال کر کے جان میں جان آئی تو خواب گاہوں سے پلنگ آتش دان کے اطراف گھسیٹتے میں نے پے در پے تین سگریٹ پھونک ڈالے۔ الاؤ کی تمازت سے جانے کب میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

رات کے کسی پہر پالے کی شدت نے نیند اچاٹ کر دی۔ کمزور بلب کی مایوس روشنی میں سمرو سردی سے بچاؤ کی خاطر ردی اخباروں کی تہہ در تہہ کے نیچے دفن بے خبر سو رہا تھا۔ گارڈ ڈیوٹی پر نافذ سنتری کرسیوں پر 'مین ڈور' کے پہلو میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ آگ جانے کب کی مر چکی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے پونے دو بجا چاہتے تھے۔

اوپر کی منزل پر کسی کے تیز تیز قدموں سے چلنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کانچ کے ڈھیر سارے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر یوں لگا جیسے کسی کو گھسیٹا جا رہا ہو۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں نے سمرو کو آہستہ سے آواز دی لیکن جواب نہ پا کر میں اونگھتے سنتریوں کو جگاتے پوچھا۔

"کہ کیا اوپر ہمارے لوگ تو موجود نہیں؟"

"نہیں صاحب سب نیچے سو رہے ہیں اور گارڈ بھی نیچے ہے۔" سیکشن کمانڈر نے جواب دیا۔

"دو آدمیوں کو لے کر آپ اوپر جائیں اور چیک کریں یہ شور کیسا آ رہا تھا۔

اول تو یہ حکم ہی غلط تھا۔ اپنی جان بچاتے دوسروں کو اندھے کنویں میں دھکیلنا کہاں کی لیڈر شپ تھی۔ بعض مرتبہ مجھے اپنی خود غرضی اور بے غیرتی پر حیرت بھی ہوتی لیکن جانے کیوں یہ رویہ کئی کئی بار دہرایا جاتا۔ آخر دل کڑا کرتے میں بھی نفری کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اوپر کے حالات مزید مخدوش نکلے۔ گندگی مکڑی کے جالے اور پرانا کاٹھ کباڑ...... ہم چاروں نے کونہ کونہ چھان مارا نہ تو زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے نہ ہی ٹوٹے برتن یا ان کی کرچیں!

اِدھر اُدھر دیکھتے ہم واپس نیچے اتر آئے۔ نفری کی مدد سے آگ دوبارہ بھڑکائی۔ پلنگ پر دراز ہوتے ہی نیند نے پھر آن لیا۔

بمشکل گھنٹہ ڈیڑھ ہی آنکھ لگی ہوگی کہ شدت سے پلنگ ہلنے پر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر اوپر لڑائی ہو رہا ہے کوئی زنانہ رو ر(ہی) ہے۔" پائنتی کھڑے سنتری نے اطلاع دی۔ چونکہ 'جھاکہ' اتر چکا تھا لہٰذا اس مرتبہ 'ریکی پٹرول' کو لیڈ کرتا اوپر چڑھ گیا۔

ویسے تو صورت حال وہی تھی نہ بندہ نہ بندے کی ذات' لیکن فرش پر بے شمار ٹوٹے برتنوں کے ٹکڑے دیکھ کر اچنبھا ہوا۔

"سر ابھی جب ہم آیا تھا تو ٹوٹے برتن موجود نہیں تھا۔"

ہو سکتا ہے Hallucination ہو لیکن فرش پر بکھری کرچیں ایک شبیہ کا خاکہ بنا رہی تھیں مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ایک عجیب و غریب سا احساس جیسے ڈھیر سارے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہوں۔ میں نیچے اتر آیا۔

خالد سمرو دونوں ٹانگیں پیٹ تک سلوڑے لیٹا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''آخر آپ مستی کرنے سے باز نہ آئے میں سردی سے ٹھٹھرا مرا جارہا ہوں۔''

میں نے پلنگ کی دائیں جانب نظر ڈالی۔ سینکڑوں اخبارات نفاست سے تہہ کیے پڑے تھے۔

یہ وہی اخبار تھے جنہیں چند منٹ پہلے سمرو اوڑھ کر سورہا تھا۔

میری سٹی گم ہوگئی۔

''حاضر سائیں!''

''معاملہ سنجیدہ ہے۔ اٹھ بیٹھیں۔''

تفصیلات سننے کے بعد تشویش زدہ خالد نے تہہ شدہ اخبارات کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اگر ہماری پوری نفری ساری رات بھی لگی رہتی تو بھی اتنے سارے اخباروں کو اتنی خوب صورتی سے تہہ نہ کرپاتی۔''

''آیئے وضو کریں۔ پہلے چاروں کونوں میں اذان دیتا ہوں پھر فجر کی نماز پڑھتے ہیں۔ ٹونٹیوں کے گدلے اور کائی زدہ پانی سے 'اوکھے سوکھے' وضو کیا۔ اذانیں دی گئیں اور بشمول مچھیروں سمرو کی امامت میں نماز ادا کی گئی۔

''آیئے سر اب ذرا اوپر کا سٹی ٹور لیں۔''

''کدھر ہیں کانچ کے برتن اور کدھر ہے وہ شخص جس کی تصویر آپ کو ان میں نظر آرہی تھی؟'' تھوڑی دیر بعد پوری ٹیم گراؤنڈ فلور پر واپس اتر آئی۔

پلنگ کے پہلو طے شدہ اخبارات کا وہی ڈھیر اس بے دردی سے بکھرا پڑا تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اپنا ردعمل ظاہر کیا ہو۔

''ہاں بھئی ہن دس سٹھن پا کے ٹینس کھیڈن والے دو نمبر مولوی؟''

''ہاں بھئی اب بتا شلوار قمیض پہن ک
کھیلنے والے.....''

''ردی اخبار کو پہلے ترتیب اور ا
ترتیب کیا جام صادق علی کر گیا؟''

''سر میں نے آپ کو بتایا نہیں لیکن
دینے کے دوران میرے کاندھوں پر ا
بوجھ تھا کہ الامان والحفیظ!''

ہم بھوت بنگلہ سے باہر نکل آئے
بلڈنگ کا فن تعمیر قابل دید تھا۔ مغلیہ اسٹا
منقش جھروکے اور ان کے اندر جڑے رنگ
وکٹورین دور کی یاد تازہ کررہے تھے۔ مجھ
شب کے ڈراؤنے واقعات کو یاد کر
جھرجھری سی آئی۔

خالد سمرو مچھیروں کو حیلے بہانے ا
دے کر گزشتہ دن کی واردات اور اس میں
جرائم پیشہ افراد کے بارے میں کچھ نہ کچھ ا
کے چکر میں ان سے نہایت سنجیدہ گفتگو کر
پندرہ بیس منٹ کی مغز ماری کے بعد مجھ
کونے میں لے جاتے بولا۔

''ایک اینفلی جنس ملی ہے' ڈاکو اور مغ
وقت 'ڈوڈو مچھ کھنجو' میں موجود ہیں اور کل ص
میں اتر جائیں گے۔''

''چند دن وہیں چھپے رہیں گے جب
پولیس اور حکومت کا جوش و جذبہ ٹھنڈ
پڑ جاتا۔''

اب مسئلہ یہ تھا کہ موجودہ پوزیشن
کھنجو' پہنچنا بہت دشوار تھا۔ جس میں
علاقے کے علاوہ دریائے سندھ کی
Off-Shoots مزاحمت کے لیے
ہوتیں۔


DAWN
BREAD
Health starts from here...
Give your mornings a healthy start with remarkably nutritious Dawn Bread, a bread that keeps you active and energetic throughout the day.
Vitamin

ایک لحاظ سے یہ ایک خوش آئند صورت حال تھی۔ ہمیں براستہ لاڑکانہ جانا تھا۔ جہاں ...... میں نہانا چاہتا تھا اور کھانا چاہتا تھا۔

انسان بھی کیا چیز ہے عمر بھر ہر چیز کے لیے تگ و دو کرتا ہے لیکن End Of The Day ایک بالٹی پانی اور دو روٹیوں کی خواہش کے Beyond نہیں سوچ پاتا۔

نہادھو کر باہر نکلا اسٹاف آفیسر اگلے احکامات کی خاطر منتظر بیٹھے پھیپھڑوں کے سرطان کو دعوت عام دے رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔ میرے پاؤں کی انگلیوں کا بغور معائنہ کرتے بولے۔

مسلسل غلیظ پانی میں چلنے کی بدولت جلدی بیماری نے آپ کی انگلیوں کو بری طرح متاثر کیا ہے انہیں سوکھا اور کھلا رکھیں۔

بورک ایسڈ کی پوری بوتل اپنے جھولے چمڑے میں رکھتے نئی جراب کا جوڑا پہنتے اور فوجی بوٹ کے تسمے کستے۔ اسٹاف آفیسر کی طرف متوجہ ہوا۔

سر نئے فورس کمانڈر جنرل معید تشریف لا رہے ہیں۔''

''کب؟''

''آج دوپہر...... رات ہمارے ہیڈ کوارٹر میں رہیں گے۔ صبح گڑھی خیرو اور ڈوکری' میں' ٹروپس سے ملاقات کریں گے اور وہیں سے دادو سیکٹر چلے جائیں گے۔''

''کیا میرے ساتھ جانے والی فریش نفری تیار ہے؟''

جی ہاں سر گاڑیوں میں بیٹھ چکے ہیں۔

دیکھیے راجہ صاحب......

''آپ جانتے ہیں ہم ڈاکوؤں کے تعاقب میں ہیں۔ اگر میں جنرل صاحب کے پروٹوکول کے تکلفات میں پڑ گیا تو ہماری چوبیس گھنٹے کی محنت ضائع ہو جائے گی۔ ہم نے بڑا رگڑا کھایا ہے۔ اس اسٹیج پر اپنا مشن کینسل نہیں کر سکتا۔ ہم کے ٹی خدا بخش میں کیمپ کر رہے ہیں۔ کمشنر لاڑکانہ ڈویژن اسلم سنجرانی کل ہمسایہ ڈویژن سے کوآرڈی نیشن کی خاطر آ رہے ہیں بہتر ہوگا آپ جنرل صاحب کو فیلڈ میں لے آئیں اور یا پھر کمشنر کے ساتھ آ جائیں۔''

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت کے ہمارا قافلہ 'کچے' کے علاقے کے ٹی خدا بخش جا پہنچا۔ حفاظتی بند کے 'ہوم بینک' سے سامنے کا منظر کچھ اس طرح کا تھا۔

زمین سے تقریباً پندرہ فٹ بلند حفاظتی بند کے دوسری جانب دریائے سندھ کے عین بیچ ایک بیضوی شکل کا جائزہ...... اس کے پار پھر دریا' جنگل اور نوشیر و فیروز کا سرحدی علاقہ۔

آپریشنل ایریا کا ہر پہلو سے جائزہ لیتے میں اس نتیجے پر پہنچا۔

ڈاکوؤں نے 'ڈڈو مچھ کھنجو' کو عارضی 'ہائڈ آؤٹ' کے طور پر استعمال کیا۔ فی الوقت وہ اور مغوی پارٹی دریا عبور کر کے مرکزی جنگل میں روپوش ہیں۔ میرے خیال میں رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہمیں خاموشی سے کھنجو پر قبضہ جما لینا چاہیے تاکہ بعد ازاں اس کے اطرافی علاقے کو Dominate کیا جا سکے۔

☆ دوسرے مرحلے میں 'سرچ آپریشن فورس' کے دریا عبور کرنے کے دوران قبضہ گروپ اسے پروٹیکشن مہیا کرے اور بوقت ضرورت Reinforcement کی ذمہ داری نبھانے کے لیے بھی تیار رہے۔

خالد سمرو کی رائے میں اگر ڈاکو بائے چانس کھنجو میں ہوئے تو 'قبضہ گروپ' کی بند اور کھنجو کے درمیان Vulnerable Movement شدید خطرات میں گھر سکتی ہے۔

اثبات میں سر ہلاتے میں نے سمرو کے تحفظات کی تائید کی اور کہا۔

''مشکل یہ ہے کہ کوئی بھی منصوبہ 'پرفیکٹ' منصوبہ نہیں ہوسکتا اور کہیں نہ کہیں ایسے Loop Holes ضرور موجود ہوتے ہیں جو جانی اور مالی نقصان کا باعث ہوسکتے ہیں۔ ابھی منصوبہ بندی جاری تھی کہ وائرلیس آپریٹر نے پیغام دیا۔

''جنرل صاحب' کمشنر اور میجر راجہ صاحبان ہماری پوزیشن کے لیے لاڑکانہ روانہ ہوچکے ہیں۔''

''سر! مبارک ہو نیا عذاب۔'' خالد سمرو نے حرافہ بھنگن کی طرح شلوار سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

جنرل صاحب انجینئر کور سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر پل کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لینے والے ان صاحب کو جانے کس جرم کی سزا میں مہران فورس کا کمانڈر بنادیا گیا۔ ہیلو ہائے کے بعد 'جاری آپریشن' کی تفصیلات جان کر موصوف نے ترش روی سے منصوبے کو پُر خطر نا قابل عمل اور بچکانہ قرار دیتے کہنے لگے۔

''براہِ مہربانی اس خطرناک پلان کو منسوخ کردیں۔ کھلے دریا میں آپ کو مرغابیوں کی طرح پھڑکا دیا جائے گا۔''

پھر کہنے لگے۔

''جیلانی صاحب پروگرام میں تھوڑی تبدیلی آئی ہے۔ مجھے واپس سکھر جانا پڑ گیا۔ صبح کورکمانڈر تشریف لا رہے ہیں۔ اگلی مرتبہ آپ سے تفصیلاً ملاقات ہوگی۔''

خالد لاسمرو جنرل صاحب کے رو
بہت دلبراشتہ تھا لہٰذا چڑ کر بولا یہ ملک
فوجیوں کا ہی ہے۔

ایک تو آپریشن سے متعلق جنرل صا
دل شکن ریمارکس اور اوپر سے کمشنر کی
پسندانہ رائے کے پس منظر میں ادارے
طرح توہین کی گئی میں نے بھی ترکی بہ ترکی
دیتے ہوئے کہا۔

''اس ملک کی ایسی کی تیسی کرنے میں
جرنیلوں کا ہی ہاتھ نہیں سول سرونٹس بھی
ذمہ دار ہیں۔ فوج نے کتنی مرتبہ ہاتھ کھڑے
ہیں کہ آیئے ہماری مدد کیجیے ہم سے ہمارا
چل رہا۔''

''معافی چاہتا ہوں جیلانی صاح
مقصد ادارے کی تضحیک کرنا نہیں تھا۔ ج
سوچتے میں نے یہ کہہ دیا جو ہرگز کہنا نہیں
تھا۔ آئی ایم سوری۔ کیا اب سب کچھ رو
کرنا ہے؟''

''بالکل نہیں' آپریشن کینسل نہیں کیا
گا۔ آپ کمشنر نوشہرو فیروز سے رابطہ کر
سے چھ کراسنگ پوائنٹس پر ناکہ بندی کر
جن کا ذکر میں نے آپ سے ٹیلی فون پر کیا

کمشنر کو رخصت کرتے میں نے پلا
نوک پلک سیدھی کی۔

اندھیرا چھاتے ہی کشتیوں کو خاموشی سے
میں اتار دیا گیا۔ اللہ کا کرم ہوا بادلوں کی م
نے رات کو مکمل تاریک کر رکھا تھا۔ قبضہ
کے پندرہ منٹ کے اس سفر کے دوران
سمرو بند پر دم سادے لیٹے رہے۔ این وی
مدد سے اطراف کا مسلسل جائزہ لیتے

آنکھیں درد کرنے لگیں۔

خدا خدا کرتے وائرلیس پر Pre-Set-Code Word موصول ہوا۔ جس کے مطابق چوبیس بندوں پر مشتمل نفری زیر کمان میجر عابد کمانڈو خیر و عافیت سے جزیرے پر پہنچ گئی اور کشتیاں واپس کر دی گئیں۔

آئندہ آدھ گھنٹے میں میجر عابد نے آل راؤنڈر دفاعی پوزیشن لیتے اور کھنچو کو Secure کرتے Assault Force کو گرین سگنل دے دیا۔ ایروہیڈ فارمیشن اپناتے میں اور کالد اپنی فورس کے ہمراہ دریا میں کود پڑے۔ 'متعدل کرنٹ' کے باوجود تینوں کشتیاں 'ماسکڈ فلیش لائٹس' کے اشاروں کے باوجود تقریباً دوسو گز دور دائیں جانب کنارے لگیں انہیں جنگل کے اندر کھینچ لیا گیا۔

پہلے مرحلے کی کامیاب تکمیل پر میجر عابد اور اس کی ٹیم کو شاباش دیتے دوسرے مرحلے کی تفصیلات کو ایک مرتبہ پھر ٹھوک بجایا گیا۔

شب کے نو بج چکے تھے۔

پیکٹ بند کھانے کے بعد تمام Wrappers اور اخباری کاغذوں کو احتیاط سے ایک جگہ اکٹھا کرتے مٹی میں دبا دیا گیا۔ یہ احتیاط ماضی کے ایک Misadventure سے سبق سیکھتے اپنائی گئی۔ جب جنگل میں حملے سے پہلے دوپہر کا کھانا کے بعد تقریباً آٹھ سو آدمیوں نے کھانے کے خالی پیکٹ اور پلاسٹک دریا برد کر دیے۔ Down Stream بہتے ہزاروں کی تعداد میں پلاسٹک بیگ نے ڈاکوؤں کو الرٹ کر دیا جو شام سے پہلے پہلے موقع سے فرار ہو گئے۔

ہزار ڈیڑھ ہزار گز کے اس ننھے سے جزیرے کو مختلف اقسام کے گھنے درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مہیب چمگادڑوں اور 'گوہ' نما سبز چھپکلیوں کے علاوہ مجھے کوئی اور جاندار چیز نظر نہ آئی۔

دس بجے میں اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

خالد سمرو کے درد بھرے خراٹے رات بھر دائیں بائیں کیٹی فورس کے لیے اذیت کا باعث بنے رہے۔

پو پھٹنے سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل ڈیوٹی سنتری نے 'ویک اپ جھٹکا' دیا۔ حملہ آور فورس نے تیاری پکڑنی شروع کی۔

آدھ گھنٹہ بعد 'سب اچھا' کا سگنل ملا۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔ سیا بادلوں کی دبیز چادر نے مکمل اندھیرا تان رکھا تھا۔

سرکاری طور پر سورج نکلنے میں آدھ گھنٹہ موجود تھا۔

میجر عابد سے ہاتھ ملاتے میں اور خالد سومر لیڈنگ کشتی میں سوار ہو گئے۔ میرے انداز میں ابھی تک اللہ کے حکم سے یہ ایک Perfect Movement تھی۔

دریا کی Main Stream میں پہنچتے تمام کشتیوں کی سمت برقرار رکھنا کٹھن ہو گیا۔ خدا کرتے کنارے لگے ماسوا کشتی نمبر 3 جو سے تقریباً پانچ سو گز دور جا کر سنبھلی۔ جنگل میں اترنے کا یہ بالکل صحیح وقت تھا۔ فورس کو از سر ترتیب دیتے میں نے آفیسران کو احکامات دوہرائے۔

☆ ڈاکو جنگل میں تو ہیں لیکن کہاں' یہ معلو کرنے کے لیے فورس کو تین حصوں میں بانٹ د گیا ہے۔ جو خاموشی سے اپنی آنکھ اور کان کھ رکھتے ذمہ داری کے علاقہ پر کڑی نگاہ رکھیں گے

☆ مقابلے کی صورت میں مغوی پارٹی کی ہر صورت حفاظت کی جائے۔

☆ اپنے وائرلیس سیٹ کھلے رکھیں لیکن اس وقت تک استعمال نہ کریں جب تک ایکشن شروع نہ ہو جائے۔

دم سادھے جھاڑیوں کی اوٹ میں لیٹے لیٹے دوپہر ہونے کو آئی۔

خالد سرو نے 'شوشو' کی خاطر چھوٹی انگلی اٹھائی اور کہنیوں کے بل کرالنگ کرتا ایک طرف نکل گیا۔

شام کے چار بج گئے۔ مجھے سگریٹ کی طلب ہونے لگی لیکن دل پر جبر کرتے خاموش لیٹا رہا۔

نہ کوئی آواز نہ شور نہ کوئی حرکت حتیٰ کہ چرند پرند کو بھی چپ لگی رہی۔ ہوسکتا ہے ڈاکو یہاں سے جا چکے ہوں۔ یا سرے سے ان کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے مچھیروں نے افواہ اڑا کر بلاوجہ کی سنسنی پیدا کر دی ہو۔

خیالات......وسوسے......اندیشے۔

میں نے خالد سرو کی جانب دیکھا جو کمر کے بل بانہوں کا تکیہ بنا کر آنکھیں موندے پڑا تھا۔

وائرلیس ریسور پر ہینڈسی کی دو مرتبہ ٹک ٹک نے یکدم الرٹ کر دیا۔ یہ میجر جمیل تھا جو بات کرنا چاہ رہا تھا۔

میں نے دبی آواز میں اسے گو...... ہیڈ دیا۔

"کچھ آوازیں آپ کی لوکیشن کی جانب بڑھ رہی ہیں۔"

بائیں جانب کسی درخت سے پرندے اپنی دلفریب آواز میں ایک لمبی تان چھیڑی۔

میں نے اپنی توجہ اس طرف کر دی جس طرف سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ انتظار کی گھڑی ختم ہوئی۔

پانچ اشخاص آپس میں باتیں کرتے
سامنے سے گزرے۔

یہ کہیں سے بھی ڈاکو نہیں تھے۔ خامو
ہلہ بولتے ان کو قابو کر لیا گیا۔ حواس باختہ ا
ساتھ بولتے سب گریہ وفریاد کرنے لگے۔

ایئر لائن شٹل سروس والی اس ٹولی کا
دیکھ کر ترس آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ یہ
سناتے۔ دائیں جانب سے آٹومیٹک فائر کھل

اس کا جوابی فائر جب ہمارے سر
سے ذپ ذپ کرتا گزرا تو نفری ایک دم
لیٹ گئی۔ مغویوں نے زور زور سے چیخ
شروع کر دیا۔

خالد سرو نے وہیں سے ڈانٹتے انہیں
رہنے کا کہا۔ کراس فائر کی شدت کم ہوتے
بالکل ختم ہوگئی۔

وائرلیس پر بار بار رابطہ کرنے کے
ملاپ نہ ہوسکا مجھے پریشانی ہونے لگی۔

ہم میجر جمیل کی پوزیشن کی جانب چل

گہرے آسمانی رنگ کی شلوار قمیض میں
دو ڈاکو خون میں لت پت پڑے تھے۔ ا
پاؤں کی جانب بقیہ تین مغوی خوف اور حیر
ملے جلے تاثر لیے کبھی لاشوں اور کبھی آ
طرف دیکھتے زار و قطار روتے رہے۔ میج
اور اس کی فورس کو زندہ سلامت دیکھ کر میر
میں جان آئی۔

"انکاؤنٹر" کی تفصیلات دیتے جمیل
بتایا۔

ٹوٹل سات مغوی تھے۔ غیر سود من
آدمیوں کو آزاد کر دیا گیا جو بھٹکتے آپ کی
پر جا نکلے۔ اپنے ساتھ تین آدمی لیتے
طرف نکل گیا جس سمت

مغوی آئے تھے۔ غالباً کمین گاہ چھوڑنے کی تیاری کی جارہی تھی جب دونوں پارٹیوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم نے پہل کی۔ دو فوراً ڈھیر ہوگئے۔ بقیہ جان بچاتے دریا کی طرف نکل بھاگے۔ پیچھا کرنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آئے۔

دائیں بائیں ایک تنقیدی نظر ڈالتے میں نے تجویز دیتے کہا۔

''یہاں سے فوراً نکل چلیں۔ میجر عابد کو پیغام دیں کہ ہماری واپسی کی Movement کو کور کرے۔ دو کشتیاں لے کر آپ پہلے نکل جائیں۔ میں آخر میں آؤں گا۔''

تقریباً سوا بارہ بجے لاڑکانہ پہنچے۔ خالد سرو رخصت چاہتے کہنے لگا۔

''سر میرا آئندہ بہتر گھنٹے سونے کا پروگرام ہے۔ اب مجھے بھول جائیں آپ تو جانے کیا کھا کر اس دنیا میں آئے تھے۔''

☆......☆......☆

''عاجز'' فوجی ملازمت سے سبکدوش ہوکر شعبۂ کارسازی سے منسلک ہو چکا تھا بوجہ سرکاری مصروفیات بھی کبھی کبھار کراچی جانا ہوتا۔ لاہور واپسی پر ایک دن ڈیپاچر لاؤنج میں شہزاد عرف مغوی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ چپکا بیٹھا مجھے پہچاننے کی کوشش میں تھا۔ جانے کیوں انجان بنتے میں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرلیا۔

اس طرح کا رویہ عموماً وہ طوائف اپناتی ہے جو دھندے سے توبہ کے بعد نیک نامی کی زندگی بسر کررہی ہو اور اتفاقاً پہچانے جانے پر نظریں چرانے لگے۔

''السلام علیکم جناب عالی میں شہزاد ہوں۔ آپ کیسے مجھے نظر انداز کرسکتے ہیں آپ ہی نے تو مجھے دوسری زندگی بخشی۔ عاصمہ یہ ہیں وہ کرنل 'جان وین' جن کا اکثر تذکرہ ہوتا ہے۔''

''سر آپ یقین کیجیے صبح شام ماں نماز میں آپ کے لیے دعا گو ہوتی ہے۔ آپ کا حصار کرتی ہیں۔ آپ کی ترقی کے لیے منتیں مانتی ہیں۔

اب تک تو آپ بریگیڈیئر بن چکے ہوں گے؟ لیکن آپ کی ذات کے ساتھ کرنل کا ٹائٹل زیادہ بجتا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''جس دن میں آپ کے ہاں سے رخصت ہوا تو میجر انجم مجھے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے گئے۔ میرے استفسار پر انہوں نے پوری روداد سنائی۔

''جناب اگرچہ اس واقعے کو ایک عرصہ بیت چکا ہے لیکن مجھے وہ اذیت ناک دور جس میں میں کبھی بیہوش اور کبھی ہوش میں آتا تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی مجھے آپ کا بے ڈھب شکاری لباس میں ملبوس ہیولا اچھی طرح یاد ہے۔ پُراعتماد اور فیصلہ کن رویے اور مختصر بیانی کے باوجود آپ کے اہلکار آپ کی عزت بہت کرتے تھے۔ ایک چیز جس کی گتھی میں سلجھا نہیں سکا وہ یہ ہے کہ آپ تو مرغابیوں کے شکار کے لیے نکلے تھے پھر یکدم آپ نے مجھے قید سے نجات دلانے کا فیصلہ کیونکر کرلیا اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ آپ کے پاس بہت کم ہتھیار اور نفری تھی کیا آپ مجھے اس راز سے آگاہ کریں گے؟''

شہزاد نے گویا میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

''درحقیقت روح میں پوشیدہ زندگی کے المناک واقعات اور اُن کا دکھ تنہائی میں آنسو بہانے کا جواز بنتا ہے ان میں غیروں کو حصہ دار بنانے پر دل نہیں مانتا۔''

چند منٹ اپنے ضمیر سے اُلجھتے میں نے شہزاد اور اس کی جواں سال شریک عذاب کی طرف بغور دیکھتے پوچھا۔

"گزر گئی گزران...... گڑے مردے دوبارہ اکھاڑنے کا فائدہ؟

"سر ہوسکتا ہے میں ان واقعات کو کتابی صورت میں قلمبند کروں۔"

اُس نے ایک اشتیاق سے کہا۔

گردن گھما کر میں نے انفارمیشن ڈسپلے بورڈ پر دسویں مرتبہ نظر دوڑائی۔ متعلقہ پرواز کی روانگی کے کالم کے آگے 'تاخیر' جانے کب سے ڈسپلے کی جارہی تھی۔ میرے عقب میں کوئی Well Informed صاحب کسی کو بتا رہے تھے کہ جہاز ابھی آیا ہی نہیں۔ جب آئے گا صفائی ہوگی' ایندھن بھرا جائے گا اور پھر کہیں جا کر اڑے گا۔

"سمجھو دو گھنٹے گئے۔" پہلو میں بیٹھے مسافر نے بےزاری کا اظہار کیا۔

میرے بالکل سامنے موتیا رنگ کے ایک باوردی ہوا باز کسی سے موبائل پر گلا پھاڑ پھاڑ کر گفتگو کر رہے تھے۔

ایک شخص نے لقمہ دیا۔

"اتنی اونچی آواز تو خود بخود پہنچ جاتی موبائل کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے شہزاد کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آیئے وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں قدرے پرسکون جگہ پر بیٹھ کر میں نے ایک گہری سانس لی اور اُسے بتایا کہ دھمیال ایئر بیس پر میرے بڑے بھائی میجر طاہر محمود بطور ایجوٹنٹ آرمی ایوی ایشن ونگ میں خدمات سر انجام دے رہے تھے۔ 27 جون 1970ء میں اطلاع آئی کہ میجر طاہر دریائے اٹک پر مشقوں

کے دوران ڈوب گئے ہیں۔ باوجود اس
اس سرچ آپریشن پر ان کا جانا سرکاری ذ
نہیں تھی۔ انہوں نے اس مشن پر خود ج
ٹھائی اور پھر وہ کبھی واپس نہ لوٹے۔

فوج نے ان کی گمشدگی کی اطلاع پر ز
فضائی سرچ آپریشن شروع کیا۔ جس کا
بڑھتے بڑھتے دو ماہ تک محیط ہوگیا لیکن ک
کوئی کامیابی نہ ملی۔ حتیٰ کہ کوئی ایسا شاہد
جس نے جہاز کو زمین پر گرتے یا دریا میں
دیکھا ہو۔ اس سانحہ نے ہمارے خاندان ک
اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا۔

اگر جہاز کا ملبہ یا اس میں ہلاک
(میجر طاہر محمود شہید کے ساتھ ایک میجر بشی
اس مشن میں ان کے ساتھ گئے تھے)
ہوجاتے تو لواحقین کی کچھ عرصہ بعد غم کی ش
ہوجاتی۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

میں اس وقت فوج میں کیپٹن تھا اور
سے ایک مختصر کورس پر راولپنڈی آیا ہوا تھا
اس المناک سانحہ کے وقت اپنی فیملی کے
تھا۔ میں نے سرچ آپریشن میں شمولیت
درخواست کی۔ مگر فضائی مشن کے لیے
تحفظات اجازت نہ ملی۔ لیکن زمینی سرچ آ
میں مجھے شامل کر لیا گیا۔ صبح پو پھٹنے سے
شام کے دھندلکے میں واپسی کے دوران
اٹک اور کیمبل پور کا چپہ چپہ چھان مارا جہاں
جیپ نہیں جاسکتی تھی ہم پھیل کر پیدل چل د
دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے
ریوڑ بانوں اور مقامی خانہ بدوشوں سے پو
کی گئی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ روز روز کی اس
میں ہم کئی مرتبہ رات گئے اپنے کیمپ میں
لوٹتے تھکاوٹ سے چکنا چور...... غم و غص

بھرے ہوئے اور ناامید ہوتے۔ ان حالات میں والدہ کا سامنا کرنا سب سے زیادہ کٹھن مرحلہ ہوتا۔ دکھ اور غم کا ایک اپنا اظہار ہوتا ہے۔ چیختی خاموش راتیں بے انتہا لمبی ہوگئیں اور دن سکڑ کر رہ گئے۔ جب آنکھوں کے آنسو تھم گئے تو پھر دل رونے لگے۔ فوج تھک ہار گئی اور سرچ پارٹیاں بددل ہوگئیں۔ ناامیدی اور ناکامیوں کے اثرات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ حقیقت سے سمجھوتہ نہ کرسکنے پر روح تار تار ہوجاتی ہے۔ غم کے تسلسل نے سب کو چڑچڑا کر دیا۔ اس تناؤ میں مجھے قدرت کا یہ فیصلہ کسی طور پر سمجھ نہ آیا۔

وہ جو کہتے ہیں مصیبت اکیلے نہیں آتی وہ اس طرح درست ثابت ہوا کہ اس برس مون سون معمول سے زیادہ برسی۔ زمین جل تھل ہوگئی۔ فوجی جوان دوران تلاش کیچڑ میں لت پت ہوجاتے اور بمشکل چند کلومیٹر چلنے پر تھک ہار جاتے۔ پھر فیصلہ کیا گیا کہ غوطہ خوروں کی مدد لی جائے کہ شاید جہاز کا ملبہ دریائے سندھ کے پانیوں میں دفن ہو اور اس میں سے ہوابازوں کے لاشے نکالے جاسکیں۔ اسپیشل سروسز کے غوطہ خوروں نے اپنی زندگی داؤ پر لگاتے اور زیرِ آب تند و تیز لہروں کا مقابلہ کرتے سر توڑ کوشش کی لیکن سب کچھ بے سود۔

پھر اس سانحہ کے دوران پہلی عید آگئی۔

اپنے بیڈروم میں لیٹا سامنے گارڈن کالج روڈ پر نئے زرق برق لباس میں بچوں اور بڑوں کو عید گاہ کی جانب جاتے تکتا رہا۔ لیکن عید کی نماز کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکا۔ ان حالات میں کیسی عید اور کیا خوشی؟ میرے لیے یہ سب بے معنی ہو کر رہ گیا۔ میں تیار ہو کر دور افتادہ ان بیابانوں میں نکل گیا جہاں کبھی میں بھائی صاحب کے ساتھ شکار کے لیے جایا کرتا تھا کہ شاید ا کے ساتھ بیتے لمحات کی یاد میری روح کی تسکین ک باعث بن سکے۔

بالآخر فوج نے تلاش بسیار کے بعد یہ سانح اس ریمارک کے ساتھ Missing Believed Killed فائل داخل دفتر کردی

یہاں سے ناامید ہونے کے بعد ہم پیروں فقیروں کے ڈیروں پر دستک کی کہ شا وہاں سے کوئی معجزہ رونما ہو لیکن ناامیدی کے کچھ نہ ملا۔

اس واقعہ نے ہم سب کو بے حد حسا کردیا۔ گھر کا کوئی فرد جب توقع اور معمول ک مطابق واپس نہ آتا تو سب پریشان ہوجاتے۔

اس جانکاہ حادثہ کو پیش آئے پینتیس بر بیت چکے ہیں۔ لیکن اب بھی میری وال ہر جاڑے کی آمد پر بھائی کی وردیاں ٹرنک س نکال کر اسے دھوپ میں رکھتی ہیں اور انہیں پی سے سہلاتی رہتی ہیں' شاید وہ اب بھی ایک امید دیا جلائے بیٹھی ہیں۔ یہ ماں کی محبت کے اظہ اور بے پایاں انتظار کی بے مثل شہادت ہے۔"

ایک لمبا سانس بھرتے میں خاموش ہوگیا۔

چپکے چپکے آنسو بہاتے عاصمہ نے ایک مر بھی کچھ پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ رندھی آواز م شہزاد نے میری توجہ 'پرواز' کی جانب کروائی ج کا اعلان کیا جارہا تھا۔

تھکے ماندے انداز میں کھڑا ہوتے میں اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"میں نے یہ فیصلہ محض اس لیے کیا کہ مجھ م یہ حوصلہ نہیں تھا کہ ایک اور ماں لامتناہی انتظار ک کرب میں مبتلا رہے۔"

☆☆......☆☆

آگہی کا عذاب

بے شک بعض اوقات نا جاننا ہی اچھا ہوتا ہے' زرمینہ بھی جان کر کرب میں مبتلا ہوگئی جواب ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا......

سیمیں غزالہ نہاں

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رشتوں کی زنجیر سے باندھ رکھا ہے سب سے پہلا رشتہ تو خالق اور مخلوق ہی کا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے ماؤں سے ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ نہایت رحمان اور رحیم ہے۔ بندوں کے برے سے برے گناہ کو بھی بخش دیتا ہے۔ بشرطیکہ یہ بندہ بھی دل سے گناہوں سے تائب نہ ہوکر اللہ سے مغفرت اور رحمت طلب کرے)

ہر مشکل وقت میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کی مدد کرتا ہے۔ پھر اپنے شکر گزار اور صبر دار بندوں کو نوازتا بھی بے حد وحساب ہے۔

دنیا میں ہمیں اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے زیادہ کوئی اور عزیز نہیں...... بدقسمتی سے اگر کسی کے ماں باپ مرجائیں تو وہ یتیم اور لاوارث ہو جاتا ہے...... اس طرح اگر کسی کی اولاد مرجائے تو ماں باپ اُس کو کبھی نہیں بھولتے۔ ہمیشہ اس کا دکھ دل میں رکھتے ہیں۔ موت تو قانون قدرت کا فیصلہ ہے۔ موت کے

ذریعے اگر کوئی اپنا بچھڑ جائے تو قدرت
کو قبول کر کے صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن ا
زندگی میں بچھڑ جائے تو یہ صدمہ نہیں بھلا سک

میں بچپن ہی میں اپنے والدین سے
طور پر بچھڑ گئی تھی۔ جی ہاں...... میں بچپن
اغواء ہوگئی تھی۔ اغواء کرنے والوں نے
مقصد کے لیے اغواء کیا تھا۔ یہ تو پتہ نہیں
مگر مجھے اللہ نے اُن کے چنگل سے نکال
ہاتھوں میں پہنچا دیا اور پھر میری پرورش ا
لوگوں نے کی۔ جنہوں نے مجھے اغواء کارو
بچایا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی سگی اولاد کی
پالا۔ مجھے تمام گھریلو امور سکھائے اپنے
کی زبان کے ساتھ تمام رسم و رواج
دیے۔ اور اب مجھے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ
کے علاقے کی نہیں ہوں...... وہ لوگ
علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور میرا تعلق
اسپیکنگ فیملی سے ہے۔

اب مجھے کوئی پہچان نہیں سکتا کہ می

کراچی سے اور اردو بولنے والوں سے ہے۔ میں شکل وصورت اور جسامت کے لحاظ سے بالکل سرحدی پٹھان لگتی ہوں۔ اور فراٹے سے پشتو بولتی ہوں۔ میرے شوہر گل شیر خان (جو مجھ سے عمر میں تین گنا بڑے ہیں) نے مجھے بڑی عزت اور محبت دی ہے۔ مجھے چادر اور چار دیواری کا تحفظ دیا ہے اور وہ میرے بچوں کے باپ ہیں۔

گل شیر خان بھی میری طرح اپنے والدین سے بچپن ہی میں بچھڑ گئے تھے۔ مگر ان کے والدین اتفاق سے ایک ساتھ ہی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ ان کی پرورش ان کی ایک بے اولاد بیوہ خالہ نے کی۔ مگر میں تو زندہ سلامت اپنے والدین سے بچھڑ گئی۔

انہوں نے اپنے ملنے جلنے والوں میں یہ مشہور کر دیا کہ میں ان کے دور پرے کے بھتیجے کی بیٹی ہوں...... جنہوں نے اسپیکنگ فیملی میں شادی کی تھی۔ اور ایک ع سے ہمارا ملنا جلنا نہیں تھا مگر ان کے انتقال بعد چونکہ میرا کوئی اور وارث نہیں تھا اس اپنے پاس لے آئی ہیں۔

یہ کہانی انہوں نے مجھے بھی ازبر کروا میں بھی اپنے ملنے والوں کو یہ ہی بتاتی ...... میرا اللہ جانتا ہے یہ جھوٹی کہانی سناتے ہو دل کیسے روتا تھا۔ میں ان میں یوں گھل مل میری والدہ بے حد حسین تھیں جبکہ والد وا شکل کے مالک تھے۔ میری والدہ کا حسن کس خطے سے تعلق رکھنے والوں جیسا تھا لہٰذا ہم بہن بھائی ماں کے ہی حسن کا نمونہ تھے۔



اس لیے میں بھی اسی قبائلی علاقے کی لگتی تھی۔ پھر ان کے رسم و رواج اور ان کی زبان اپنا کر تو میں سچ مچ انہی کے علاقے کی بن گئی۔ مگر اس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کے باوجود اور کافی عرصہ گزارنے کے بعد میں اپنے والدین کو نہیں بھول سکی۔

مجھے یقین تھا کہ ایک دن میرے بچھڑے والدین ضرور ملیں گے۔ یوں ہی اپنوں سے ملنے کی آس میں زندگی گزار رہی تھی۔ اپنوں سے ملنے کی خوشی کا احساس مجھے مایوس ہونے نہیں دیتا تھا۔ میں دن رات اپنے اللہ سے دعائیں کرتی تھی کہ وہ مجھے اپنوں سے ملا دے۔

اور پھر ایک دن اللہ نے میری دعائیں سن لیں میرے بچھڑے والدین مجھے مل گئے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ جن کے ملنے کی آس میں، میں تڑپ رہی ہوں وہ ملن کی خوشی میرے لیے ایسا دکھ لے کے آئے گی جو مجھے زندگی بھر رُلاتا رہے گا۔

پہلے ایک آس تھی...... ملنے کی خوشی کا احساس تھا۔ مگر ملنے کے بعد ایک دکھ تڑپ اور خلش کا احساس جاگ گیا۔ کاش میں اپنے والدین سے کبھی نہیں ملتی۔ میں اپنی زندگی اسی آس میں گزار دیتی کہ ایک دن میرے اپنے مجھے مل جائیں گے۔ یہ احساس ہی مجھے خوشی دیتا تھا۔ مگر ملنے کے بعد جو ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی ہوں۔ یہ دکھ مجھے زندگی بھر رلائے گا۔

مثل مشہور ہے کہ اپنا مارے گا بھی تو چھاؤں میں رکھے گا' مگر میں ہمیشہ اُس کی نفی کیا کرتی تھی۔ میں کہتی تھی کہ اپنا مارے گا ہی کیوں؟ اور مارے گا تو اپنا کب ہوگا؟' میں یہاں ایک بات بتادوں کہ جب میں اپنے والدین سے جدا کر دی گئی تھی تو اس وقت میں چھٹی جماعت میں پڑ... تھی۔ اور پڑھائی میں بہت اچھی بہت ذہین تھی میں چھٹی جماعت میں پہنچنے تک اردو کے بہ... سے ناول پڑھ چکی تھی۔ مطالعے کے شوق نے ... اردو ادب اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وجہ میرے ... کا تعلیمی ماحول بھی تھا۔ میری والدہ ٹیچر تھیں ... والد بہت اچھی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ گھ... ماحول بے حد سادہ اور تعلیم پر توجہ دینے والا تھا اسی لیے ایک عرصے سے تعلیم کا سلسلہ ختم ہو... کے باوجود مجھے اردو پر دسترس ہے اور میرا مطا... بہت وسیع تھا۔ میں پشتو کے ساتھ اردو زبان ... بہت اچھی طرح بولتی ہوں۔ خیر اب جبکہ ... والدین سے ملنے کے بعد دوبارہ ہمیشہ کے ... بچھڑ گئی ہوں۔ تو یہ کہاوت مجھے یاد آ رہی ہے ا... میری دلیل بھی سچ ثابت ہو رہی ہے کہ 'اپنا ... مارے گا تو اپنا ہی کب ہوگا' میرے اپنوں نے مجھے مار کے چھاؤں سے گھسیٹ کر تپتی دھوپ میں کے کھڑا کر دیا ہے۔ میرے سر پر سے چھاؤں ا... گئی ہے اور اب ہمیشہ کے لیے میں تپتی زمین ... آبلہ پا ننگے پاؤں چلتی رہوں گی۔ کاش...... اپنوں سے کبھی نہ ملی ہوتی۔ میرے لیے وہ ... خبری بہت اچھی تھی جب مجھے اپنے لوگوں کا ... نہیں تھا۔ اب میں اپنوں سے مل کر آگہی ... عذاب جھیل رہی ہوں۔

☆......☆......☆

میں اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ سعو... عرب میں مکہ کے نواحی گاؤں میں رہائش پذ... ہوں۔ یہاں کا ماحول میرے شوہر کے قبا... علاقے سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور اکثریت پٹھان فیملی کی ہے جو یہاں کاروبار کرتے ہیں میرے شوہر ٹیکسی ڈرائیور ہیں...... ان ...

خاندان کے زیادہ تر مرد ڈرائیور کے پیشے سے منسلک ہیں۔ یوں میرے شوہر بھی اپنے آبائی پیشے سے تعلق رکھے ہوئے ہیں۔ یہ آج سے دس پندرہ سال پہلے کی بات ہے...... ہم لوگ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آئے ہوئے تھے۔ یہاں ہماری ملاقات ایک پاکستانی فیملی سے ہوئی جو ایک میاں بیوی پر مشتمل تھی۔ شوہر کافی ضعیف تھے اور بیوی ابھی جوان اچھی صحت کی نظر آتی تھیں۔ جبکہ شوہر ضعیفی کے ساتھ بیمار بھی نظر آتے تھے۔ میرے شوہر اپنی نیک فطرت کی وجہ سے ان کی بہت مدد کرتے اور ان کے ضروری کام کردیتے۔ یوں وہ ہم لوگوں سے گھل مل گئے۔ آنٹی مجھے بہت پیار کرنے لگیں اور میرے بچوں کو بھی خود سے مانوس کرلیا۔

اس سارے معاملے میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ آنٹی کی شکل حیرت انگیز طور پر مجھ سے ملتی تھی۔ اور وہ اکثر مجھے غور سے دیکھتی رہتی تھیں۔

حج کے ارکان شروع ہوئے تو میرے شوہر نے اُن کی بہت مدد کی۔ حج کے ارکان پورے ہوکر حج مکمل ہوگیا تو ہم واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ آنٹی کی واپس فلائٹ میں ابھی چند روز تھے۔ ہم نے انکل اور آنٹی کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا اور اپنے گھر لانے اور واپسی کی ذمہ داری بھی گل شیر نے اٹھائی تھی۔

دعوت والے دن میں نے جلدی جلدی کھانا تیار کیا اور فارغ ہوکر اُن کا انتظار کرنے لگی۔ گل شیر ان کو لینے گئے ہوئے تھے اور میں بچپن سے ان کی آمد کی منتظر تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگا جیسے ان دونوں سے بڑی انسیت محسوس ہوتی تھی۔

آنٹی میرے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میرے پکائے ہوئے کھانے کی بھی بہت تعریف کی اور
بنائی ہوئی ایک مخصوص ڈش کو دیکھ کر تو بہت ح
ہوئیں۔

"یہ تو ہماری فیملی کی مخصوص ڈش ہے۔ تم
کہاں سے سیکھی۔" انہوں نے پوچھا۔

"آنٹی یہ میری بچپن کی یادوں میں سے
چیز ہے جو میں بس یادداشت کے سہارے
ہوں۔"

"مگر تم نے تو بالکل صحیح اور بہت اچھی
ہے۔"

"شکریہ آنٹی آپ کو پسند آئی؟" اُ
تعریف سن کر میں خوش ہوگئی۔

"کاش آج میری زینت ہوتی
تمہارے جتنی ہی ہوتی۔" انہوں نے ٹھ
سانس بھر کے حسرت سے کہا تھا۔

"زینت......!" میں بری طرح چونک
یہ نام تو میرے لاشعور میں محفوظ تھا۔

"آنٹی! زینت کون ہے اور کہاں
میں نے تجسس سے پوچھا تھا۔

"زینت میری بیٹی تھی بہت پیاری
تمہاری طرح۔" انہوں نے مجھے غور سے
ہوئے کہا تھا۔

"تھی کیا مطلب آنٹی! خدانخواستہ اب
دنیا میں نہیں ہے کیا؟"

"نہیں بیٹی ایسا نہ کہو! یقیناً وہ جہاں
زندہ سلامت ہوگی۔ یہ میرا دل کہتا ہے اور
دل کبھی غلط نہیں کہتا۔ یہ ہی بات تمہارے ا
علم بھی کہتا ہے۔"

"جی؟ میں کچھ نہیں سمجھ پائی۔"

"تمہارے انکل علم الاعداد جانتے ہیں
اِن کے حساب میں میری بیٹی کی زندگی کا اشا

ہے۔ اِن کے حساب میں یہ تو پتہ چلتا ہے کہ وہ زندہ ہے مگر کہاں ہے یہ پتہ نہیں چلتا۔'' انہوں نے تفصیل سے بات بتائی تھی۔

''آنتی آپ بتائیں آپ کی زینت کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟'' میں نے انہیں مزید کریدا تھا۔

''یہ ہی تو ہمیں نہیں معلوم ہوسکا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟ وہ بس اچانک ہی غائب ہوگئی اور آج تک پتہ نہیں چلا کہ اس کوزمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ مگر مجھے آج بھی امید ہے کہ ایک نہ دن وہ مجھے ضرور ملے گی۔''

''اس وقت وہ چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ میرے چھ بچوں میں اس کا تیسرا نمبر تھا۔ تمہیں میں نے بتایا تھا کہ میں ٹیچر ہوں اور اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اب میں ریٹائرڈ ہوں...... اُس دن میں نے اسکول سے چھٹی کی تھی۔ گھر کا کام کافی جمع ہوگیا تھا۔ تو میں نے چھٹی لے کر کام نپٹانے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے اُس دن جلدی جلدی گھر کی صفائی کی' کھانا پکایا اور واشنگ مشین لگائی۔ اتنی دیر میں اسکول کی چھٹی کا وقت ہوگیا اور سب بچے گھر آگئے سب سے پہلے زینت نے ہی بھوک بھوک کا شور مچایا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''یونیفارم تبدیل کرکے منہ ہاتھ دھولو' اتنی دیر میں میں یہ کپڑے سوکھنے کے لیے اوپر ڈال آؤں تو کھانا لگادیتی ہوں۔''

سب کپڑے دھل گئے تھے میں اُن کو لے کر اوپر گئی دھوپ میں الگنی پر ڈال کے نیچے آکر دستر خوان بچھایا اور کھانا لگادیا۔

سب بچے دستر خوان پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ مگر زینت نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا تو میں پریشان ہوگئی۔ گلی کا دروازہ کھلا دیکھ کر میں آس پڑوس کے گھروں می گئی جہاں اُس کی ہم عمر دوست رہتی تھیں مگر وہا بھی اُس کا پتہ نہیں چلا۔''

اچانک میری چھوٹی بیٹی نے بتایا۔

''آپا تو برابر والی آنٹی کے گھر گئی تھیں... وہ بلانے آئی تھیں۔''

''کیوں؟'' یہ کہتی ہوئی میں پڑوس میں گئ پڑوسن نے بتایا۔

''میں تمہیں بلانے تمہارے گھر گئی تھی زینت نے کہا کہ امی اوپر کپڑے ڈالنے گئی ہیں میں نے اس سے کہا تھا کہ امی کو بتا دینا کپڑے بیچنے والی آئی ہے آکر دیکھ لیں، وہ کپڑے دیکھ کے شوق میں میرے ساتھ میرے گھر آئی تو تھ مگر ذرا دیر میں واپس چلی گئی تھی۔''

ان دنوں کچھ افغان عورتیں گھر گھر جا کپڑے بیچتی تھیں اور عورتوں کا سب سے محبو مشغلہ یہ ہی ہوتا تھا کہ کسی ایک گھر میں ان بٹھالتیں اور پڑوس کی عورتیں اس گھر میں آ کپڑے جیولری اور کراکری وغیرہ خریدتیں اُ کے مرد کراکری اور مشینیں لیے باہر کھڑے رہ تھے۔

پڑوسن نے جب یہ بتایا تو میرا دل پریشا ہوگیا کیونکہ اُن دنوں بچے بچیوں کے اغواء ک کیس بھی ہورہے تھے۔ پھر تو میں نے سارا مح چھان مارا مگر زینت کو ملنا تھا نہ ملی۔ پڑوس ک سارے لڑکے اور مرد بھی اِدھر اُدھر اُس کو تلا کرنے نکل گئے۔ اُس کے ابو کو بھی آفس ۔ بلوالیا گیا۔ تلاش کرتے کرتے رات ہوگئی۔ مگر نہیں ملی۔

کسی نے پولیس میں رپورٹ کرنے کو کہا گ اُس کے ابو تیار نہیں ہوئے بس جب سے آ

تک ہم اُسے تلاش کر رہے ہیں۔

''آنٹی! اس سے آگے کی داستان میں سناتی ہوں کہ آپ کی زینت کے ساتھ کیا گزری تھی۔''

میں بے اختیار بول اٹھی تھی۔

''تم ...... تم کیسے جانتی ہو؟'' آنٹی نے حیران بلکہ پریشان ہوکر پوچھا تھا۔

''آنٹی پہلے سن تو لیں۔ آپ کی زینت جیسے ہی پڑوس کے گھر سے نکلی اور اپنے گھر کے دروازے تک پہنچی تو پتہ نہیں کہاں سے ایک برقع پوش عورت آگئی اور مجھ سے پوچھنے لگی۔

''بیٹی ...... یہاں پر قریب میں کوئی ڈاکٹر کا کلینک یا اسپتال ہے؟ میرے بچے کی طبعیت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ ہم لوگ یہاں نئے آئے ہیں۔ یہ سامنے کونے والے گھر میں...... ہمیں ابھی راستوں کا پتہ نہیں ہے۔''

اس کونے والے گھر میں کرایہ دار آتے جاتے رہتے تھے اور ابھی چند دن پہلے بھی نئے لوگ آئے تھے۔ میں نے اُس برقع والی عورت سے کہا۔

''آنٹی وہ سامنے روڈ پار کر کے ایک کلینک ہے' وہاں چلی جایئے۔''

''اچھا بیٹی بہت شکریہ۔ یہ گلی پار کر کے میری گاڑی کھڑی ہے۔ تم چل کر میرے بھائی کو بتا دو کلینک کس طرف ہے تو مہربانی ہوگی۔''

اُس عورت نے بہت محبت سے کہا تو زینت گلی میں نکل کر تھوڑا آگے بڑھی۔ بس پھر اُسے پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ کیونکہ ایک بہت تیز خوشبو اُس کی ناک سے ٹکرائی اور وہ ہوش سے بیگانہ ہوگئی۔''

اُس سے آگے کی کہانی آپ مجھ سے سنیں۔''

گل شیر جو اتنی دیر سے خاموش رہے تھے میرے چپ ہوتے ہی بول پڑے تھے۔

''میں اُس وقت کراچی میں ایک بنگلے ڈرائیور تھا۔ پھر سعودی عرب سے ڈرائیوروں ضرورت کا اشتہار اخبار میں دیکھ کر میرے دوس نے اپنے ساتھ میری بھی درخواست بھیج دی ا ہم دونوں کا تقرر ہوگیا میں نے بنگلے کی نوکر چھوڑ دی اور اپنے گاؤں واپس جانے لگا۔ کیون دو ہفتوں کے اندر مجھے سعودی عرب میں ڈیو جوائن کرنی تھی میرے والدین کا تو انتقال ہو تھا اور میں اپنی بیوہ خالہ' جو بے اولاد بھی تھیں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ میں جو کماتا تھا خالہ کو د دیتا تھا خالہ میری شادی کی تیاری بھی کر ر تھیں۔ میرا ایک دوست ٹرک ڈرائیور تھا۔ قبائلی علاقے میں غلہ اور دوسرا سامان اپنے ٹر کے ذریعے پہنچاتا تھا۔ اس نے پیش کش میرے ساتھ چلو...... تم اپنے علاقے کے قریب اتر جانا اور میں آگے چلا جاؤں گا میں نے اس بات مان لی تھی۔''

''ہم لوگ طویل سفر کے بعد ایک چھو سے گاؤں میں ٹرک کے اڈے پر چائے وغ پینے کے لیے رُکے تو وہاں میں نے دیکھا کہ ا عورت اور یک مرد کے ساتھ دس گیارہ سال ایک بچی بے ہوش تھی۔ وہ دونوں اسے ا درخت کے نیچے لٹا کر ہوش میں لانے کی کوش کر رہے تھے۔ اُن کا حلیہ اور بچی کے حلیے بہت فرق تھا۔ یہ بات ہمیں مشکوک لگی۔ ہم ذرا سختی سے بچی کے بارے میں پوچھا تو انہو نے کہا تھا۔

''یہ ہمارے مالک کی بیٹی ہے...... ہمار مالک پشاور اپنے رشتے داروں کے پاس آئے تھے کہ اُن کی اچانک طبیعت خراب ہوگ

وہ اسپتال میں ہیں...... ہم بچی کو لے کر ان کے پاس جارہے تھے مگر بچی بھی اچانک بے ہوش ہوگئی ہے تو ہم بس سے اُتر کر اِس کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

ہمیں اب ان پر شک ہی نہیں پکا یقین ہوگیا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور بچی کو اغواء کرکے لے جارہے ہیں۔ کیونکہ یہاں سے پشاور کی طرف کوئی مسافر بس نہیں جاتی تھی۔ ہم نے سختی سے کہا کہ وہ سچ بتائیں کیا معاملہ ہے ورنہ پولیس کے حوالے کردیں گے تو وہ لوگ ڈر گئے شاید وہ کوئی اناڑی اغواء کار تھے۔

میرے دوست کے پاس اسلحہ بھی موجود تھا جو وہ طویل سفر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ شاید وہ اُس سے بھی خوفزدہ ہوگئے اور ہمیں کہا۔

"وہ سامنے گاؤں میں ہمارے کچھ رشتہ دار رہتے ہیں ہم اُن کو بلا کر لاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایسے گئے کہ واپس نہیں آئے۔ ان کو گئے ہوئے جب کافی دیر ہوگئی تو میرے دوست نے مشورہ دیا کہ بچی کو اٹھا کر ٹرک میں لٹادو اور اپنے گاؤں لے جاؤ جب اس کو ہوش آجائے تو اُس سے پوچھ کر اس کے گھر پہنچا دینا۔

میں نے اپنے دوست کا مشورہ مان لیا اور اس بچی کو گھر پہنچا کر خالہ کو سب کچھ بتادیا۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے بچی کو کون سی نشے کی چیز دی تھی کہ اُس کو ہوش میں آنے میں بہت وقت لگا' ہوش میں آنے کے بعد بھی اُس کا ذہن ماؤف تھا اور وہ ہمیں صرف کراچی اور وہاں کے ایک علاقے فیڈرل بی ایریا کے علاوہ اور کچھ نہیں بتاسکی تھی۔

اُدھر میرے سعودی عرب جانے کے دن قریب آگئے تھے تو میں نے مجبوراً اُس کو خالہ کے پاس چھوڑ کر ملازمت پر چلا گیا تھا۔

"میری ملازمت کی شرائط میں تین سال بعد گھر آنے کی چھٹی ملنی تھی۔ مگر میں کسی وج پانچ سال بعد گھر گیا تو اُس بچی کو دیکھ کر حیرا گیا۔ اب وہ پندرہ سولہ سال کی ہوگئی تھی اور سے بھی نہیں لگتی تھی کہ یہ ہمارے علاقے کی ہے۔ اس کی زبان اس کا لباس سب کچھ ہما علاقے جیسا ہوگیا تھا۔ خالہ نے اُس کو اپنی دار کہہ کے سب سے تعارف کروایا تھا۔ لو نے اِس کی کہانی پر یقین بھی کرلیا تھا۔ گھر میں نے سوچا تھا کہ اب لڑکی کو اُس کے وار تک پہنچادوں مگر خالہ نے مجھے منع کردیا تھا۔ کہنا تھا۔

"لڑکی جب ایک بار گھر سے نکل ج چاہے اِس میں اُس کا کوئی قصور نہیں ہو تو د اس کے گھر والے اُس کو کبھی قبول نہیں کر ہمارے یہاں تو ایسی صورت میں لڑکی کو گو دی جاتی ہے۔ ویسے بھی مجھے اس لڑکی سے محبت ہوگئی ہے۔ میں اس کو کسی تکلیف میں دیکھ سکتی۔ اس کے گھر والے مل بھی گئے اور قبول نہ کیا تو یہ کہاں جائے گی بہتر ہے اس شادی کردی جائے مگر ہمارے گاؤں میں اِس قابل کوئی لڑکا نہیں ہے یہ بچی بہت معصوم بہت اچھی فطرت کی ہے' بہتر ہے تم اس سے کرلو ویسے بھی یہ نامحرموں کے ساتھ نہیں ر میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

میں خالہ کی بات سن کر حیران ہوگیا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ ابھی بہت چ ہے۔ پھر میں نے ایسا سوچا بھی نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم اچھی طرح سوچ لو' و بھی ہمارے یہاں عمروں کا فرق نہیں دیکھا ج' خالہ نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا

"میرا دل کسی طرح نہیں مان رہا تھا' لڑکی پندرہ یا سولہ سال کی تھی اور میں چوالیس سال کا ہو رہا تھا' ایسے میں اتفاق سے خالہ کی طبیعت اچانک کافی خراب ہوگئی اور انہوں نے مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ تم اِس لڑکی کے محرم بن جاؤ' خالہ اُس لڑکی کو کسی ایسے ویسے کے ساتھ بیاہنا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارے علاقے میں اکثریت جاہل لڑکوں کی تھی وہ بھی کسی نہ کسی رشتے داروں کے یہاں منسوب تھے۔ میں تو تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا اور بہت اچھا کما بھی رہا تھا' ہمارے روراج کے مطابق غیروں سے رشتہ کرنے میں ایک بڑی رقم بھی خرچ کرنا پڑتی تھی۔

تو بہت سوچ سمجھ کے میں نے اُس سے نکاح کر لیا اور نکاح کے صرف دو دن بعد خالہ کا اوپر سے بلاوا آ گیا' ایسا لگتا تھا جیسے وہ صرف لڑکی کی حفاظت اور میری شادی کی خاطر زندہ تھیں۔ بہرحال جو اللہ کی مرضی تھی وہی ہوا۔ پھر میں اِس کو لے کر یہاں سعودی عرب آ گیا' اب میرے تین بچے ہیں' یہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے اب میں خالہ کے فیصلے پر اللہ کا سو بار شکر ادا کرتا ہوں۔"

آنٹی اور انکل چپ چاپ ہماری داستان سنتے رہے تھے۔ گل شیر کے خاموش ہونے کے بعد آنٹی نے کہا۔

"مگر میں کیسے مان لوں کہ یہ وہی میری بیٹی زینت ہے جبکہ تم اِس کا نام زرینہ بتا رہے ہو؟"

"میں شاید آپ کو بتانا بھول گیا' ہوش میں آنے کے بعد اس نے جب اپنا نام بتایا تو خالہ نے اسی وقت اس کا نام اپنے علاقے کی طرح زینت سے بدل کر زرینہ رکھ دیا تھا۔ تاکہ کسی کو یہ شک بھی نہ ہو سکے کہ یہ کوئی غیر علاقے کی لڑکی ہے۔" گل شیر نے جواب دیا تھا۔

"جی ہاں میں وہی زینت ہوں جو زرینہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔" میں ڈگمگاتے دل کے ساتھ کہا تھا۔

"میرے پاس ایک ثبوت ہے' جس کو د شاید آپ کو یقین آ جائے گا۔ اس ثبوت کو نے زرینہ سے بھی لاعلم رکھا ہے۔ اور اس کی صرف یہ تھی کہ اس کو دیکھ کر زرینہ کو اپنے د احساس زیادہ نہ ہو جائے۔" گل شیر یہ کہ الماری سے ایک لاکٹ نکال کر لائے اور کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولے۔

"اِس لاکٹ پر شاید ان اغوا کرنے وا کی نظر نہیں پڑی تھی۔ ورنہ سب سے پہلے وہ ا اتار لیتے۔"

میں بھی حیران ہو گئی مجھے یہ لاکٹ یاد تھا ج دم میرے گلے میں رہتا تھا۔ اس کی چین بڑی تھی تاکہ یہ گلے میں نیچے تک رہے اور سے کسی کو نظر نہ آئے۔

آنٹی نے لاکٹ کو ہاتھ میں لے کر بیتابی اس کو درمیان سے دبایا تو اس کا اوپر کا حصہ ڈ کی طرح کھل گیا' اس میں ایک تصویر تھی' جس ایک چھوٹی سی بچی اُن آنٹی اور انکل کے درم بیٹھی تھی۔

آنٹی نے میری بچی کہہ کر مجھے زور سے ل تھا۔ اور بولی تھیں۔

"میرا دل کہتا تھا میری بچی! ایک دن سے ضرور ملے گی۔" انکل نے بھی مجھے پیار کر ہوئے کہا تھا۔

"میرا علم بھی یہ ہی بتاتا تھا کہ میری ز زندہ ہے۔" میں بھی امی ابو کہہ کر اُن کے سے لگ گئی تھی۔

"ہمارے اِس کسی فلمی کہانی کی طرح ہونے والے ملاپ پر بچے بھی حیران تھے' اور ہم لوگوں کو روتا دیکھ کر وہ بھی زار و قطار رونے لگے تھے اور جب اُن کو سمجھایا تھا کہ یہ تمہارے حقیقی نانا نانی ہیں تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ پھر ابو اور امی نے روایتی طریقے سے گل شیر کو بطور داماد ایک بڑی رقم سلامی میں دی تھی۔ بچوں کو بھی بہت سارے تحفے دیے تھے۔ اور دوبارہ ملنے اور پاکستان بلانے کی امید دلا کر واپس چلے گئے تھے۔

"جس دن ابو اور امی کی واپسی والی فلائٹ تھی' ہم لوگ اُن کو چھوڑنے ایئر پورٹ گئے تھے۔ اب مجھے صرف یہ انتظار تھا کہ ہمیں اُن کی طرف سے بلانے کا دعوت نامہ کب آتا ہے' ہم لوگوں نے تمام تیاری مکمل کر لی تھی' گل شیر نے اپنی کمپنی میں چھٹی کی بات بھی کر لی تھی۔ اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور میری امی کی طرف سے مجھے ایک طویل خط ملا' اس لفافے میں وہ تصویر بھی تھی' جو میرے لاکٹ میں تھی' امی نے لکھا تھا۔

میری عزیز بیٹی

خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے

تمہیں یہ خط لکھتے ہوئے میرا قلم کانپ رہا ہے اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ تمہاری جدائی میں جو عرصہ میں نے جس طرح گزارا ہے وہ میں جانتی ہوں۔ میرا ایک ایک لمحہ یہ دعا کرتے ہوئے گزرا ہے کہ اللہ تمہیں مجھ سے ملا دے' میری دعائیں قبول ہوئیں اور اللہ نے میری بچھڑی بیٹی کو مجھ سے ملا دیا' تم سے مل کر جہاں میری ممتا کو تسکین ملی۔ وہیں یہ آگاہی بھی ہوئی کہ...... اللہ تو اپنے بندوں کا بھلا چاہتا ہے...... مگر بندے کسی کا بھلا نہیں چاہتے......

مجھے بہت افسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ تمہیں

تمہارے بہن بھائی قبول کرنے کو تیار نہیں ہ
تمہاری بہن کا کہنا ہے کہ اُس کے سسرال وا
کو تمہاری گمشدگی کا علم نہیں ہے۔ اور اگر تمہار
ملنے کی کہانی اب اُن کو بتائی جائے گی تو پہلے
بات پر اعتراض کریں گے کہ ان کو اتنی بڑی
سے لاعلم کیوں رکھا گیا۔ دوسرا اعتراض یہ ہو
گھر سے نکلی ہوئی لڑکی کا کوئی اعتبار نہیں کہ و
ہاتھوں میں رہی ہوگی۔ تمہاری کہانی تم
پاکیزگی پر کسی کو یقین نہیں ہوگا۔ تمہارے بھا
کو تمہاری کہانی پر اول تو یقین ہی نہیں ہے
اس لاکٹ کے ثبوت کو ماننے پر تیار نہیں' ان
ہے کہ اتفاقیہ طور پر اُن کے ہاتھ لاکٹ آ گیا
اور اب وہ جائیداد ہتھیانے کے لیے یہ فرضی
بیان کر رہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے ک
تعلیم یافتہ اور بڑے عہدوں پر فائز تمہا
بھائیوں کو یہ بات سرے سے قبول ہی نہیں
کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور اور معمولی انسان
بہنوئی بن کر ان کے سامنے آئے اور ان کے
بیٹھے۔

میرا اور تمہارے ابو کا اب بڑھاپا ہے...
اس بڑھاپے میں بیٹوں کو چھوڑ کر کہاں ج
گے۔ کیونکہ تمہارے بھائیوں سے کہہ دیا ہے
تم کو ہرگز قبول نہیں کریں گے اور نہ اپنے
دہلیز پر آنے دیں گے۔ میری اور تمہارے
تمام جائیداد کا بٹوارہ ہو چکا ہے۔ اور اب گ
کا ہے انہی کا راج ہے ہم تو صرف اپنی
گزار رہے ہیں۔

مجھے تمہاری محرومیوں کا احساس
تمہارے دکھوں پر ہم بھی دکھی ہیں۔ ہ
تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ تم میری اولاد ہ
عرصہ بچھڑے رہنے کے بعد ملی ہو۔ مجھے تم

گل شیر کی باتوں کا پورا یقین ہے۔ ہم نے تمہیں دل سے قبول کیا ہے۔

اسی کے ثبوت کے لیے میں تمہارے بچپن کی وہی تصویر بھیج رہی ہو جو تمہارے لاکٹ میں محفوظ ہے۔ اُس کی ایک کاپی میرے پاس تھی جس کو میں نے تمہاری گمشدگی کے بعد دل سے لگا کر رکھا تھا۔ تم اپنے گھر میں مطمئن ہو ہمارے لیے یہ خوشی کی بات ہے میری اپنی کچھ جائیداد ہے جس کا تمہارے بہن بھائیوں کو علم نہیں یہ۔ ایک چھوٹا سا پلاٹ کچھ سیونگ سرٹیفکیٹ اور میرے زیورات یہ سب تمہارا ہے۔ میں نے وصیت بنا کر رکھی ہے اس کی کاپی اور جائیداد کے کاغذات میں تمہیں بھیج رہی ہوں یہ تمہارا حق ہے۔ باقی یہ کہ اب تم ہمیں بھول جاؤ۔ اب دوبارہ ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ خدا تمہیں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش رکھے۔

تمہاری بدنصیب ماں

یہ خط پڑھ کے جہاں میرا انتظار ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔ وہیں ہمیشہ کے لیے میرے دل میں ایک مستقل درد بھی بیٹھ گیا ہے دکھ کا احساس بھی شدید ہو گیا ہے۔

میرا قصور کیا تھا۔

مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں ملی۔

کیا عورت ہونا جرم ہے۔ جو ناکردہ گناہ بھی اسی کے کھاتے میں ڈال دیے جاتے ہیں۔

تمام محرومیاں میرے حصے میں کیوں آئیں۔

نارسائی کا دکھ مجھے ہی کیوں ملا۔

میں اپنی مرضی سے تو اغوا نہیں ہوئی تھی۔

میں تو دودھ کی دھلی ہو کر بھی گناہ گار ثابت ہوگئی۔

کاش میں لڑکی نہ ہوتی۔

خدا اُن کو ہمیشہ خوش رکھے جو غیر ہو ہوئے بھی میرے اپنے بن گئے۔ اب میں وقت انہی کے لیے دعائیں کرتی ہوں۔ میں بالکل بھول گئی ہوں کہ میں کون ہوں۔ میرا ت کہاں سے ہے؟ میں اب خود کو قبائلی علا بتاتی ہوں' میں خود سے عمر میں تین گنا بڑے ش کے ساتھ بہت خوش ہوں..... میں ان کے علا کے لوگوں کو اپنا سمجھتی ہوں اور ان سے مل کر خ ہوتی ہوں ان ہی کی زبان بولتی ہوں۔ میں گل شیر کے مشورے پر جائیداد کے کاغذات کو واپس کر دیے ہیں اور اپنے ٹیکسی ڈرائیور ش کے ساتھ بہت مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں..... جب مجھے ا سگے رشتوں کی محبت کی دولت نہیں ملی تو م دولت کی کیا ضرورت ہے۔

مجھے گل شیر کی خالہ کی بات اب بھی یاد ہے

" جب لڑکی ایک بار گھر سے باہر چلی جا چاہے اس میں اس کا کوئی قصور بھی نہ ہو تب گھر واپسی کے دروازے اس پر بند ہو جا ہیں۔ اس کے اپنے بھی کبھی قبول نہیں کرتے

" میں مطمئن ہوں کہ گھر سے نکلنے میں کوئی قصور نہیں تھا اور شکر ادا کرتی ہوں کہ میر عزت اور زندگی سلامت رہی بلکہ مجھے چادر چار دیواری کا تحفظ بھی مل گیا۔ مگر دکھ ہے تو صر اس کا کہ مجھے میرے اپنے کبھی نہ ملتے' نہ آگاہی کا دکھ ملتا' میں ہمیشہ بے خبر ہی رہتی' سے ملنے کی امید کی خوشی تھی ان سے مل کر ہ کے لیے دکھ کا احساس ہو گیا ہے۔

"آپ ہی بتائیں میرا قصور کیا ہے؟"

☆☆.....☆☆



غیر مسلم خاندان کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ صدقہ زندگی کے لیے کس قدر ضروری ہے...... انتہائی حساس تحریر جو صدقے کی اہمیت سے پڑھنے والوں کو آگاہ کرے گی......

وسیم احمد

1970ء میں ریبا کی برائن سے شادی ہوئی۔ اس وقت ریبا کی عمر اٹھارہ برس اور برائین کی بیس برس تھی۔ دونوں ہائی اسکول میں کلاس فیلو تھے اور اسی دوران انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا جیون ساتھی چن لیا تھا۔ نو شادی شدہ جوڑا بڑی خوش وخرم زندگی بسر کرتا رہا۔ حسین وخوابناک وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ وہ دونوں اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے۔ برائین اپنی بیوی سے بڑی محبت کرتا تھا اور کام کے بعد جو وقت بچتا' وہ دونوں اکٹھے گزارتے تھے۔

آخر کار 1974ء میں خدا نے انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔ اس گول مٹول بال جیسے بچے کا نام انہوں نے رینڈی تجویز کیا۔ رینڈی بڑا پیارا اور سمجھ دار بچہ تھا۔ وہ شرارتیں ضرور کرتا' لیکن ایسی نہیں جو بدتمیزی کی حدود میں داخل ہو جائیں۔ ابھی رینڈی تین برس کا تھا کہ خدا نے انہیں ایک بچی دی۔

میاں بیوی اس گڑیا کو پا کر پھولے نہ ساتے تھے۔ اس کا نام لارین تجویز کیا گیا۔ اب ان نقطہ نظر سے ان کا خاندان پورا ہو چکا تھا' ایک اور ایک بیٹی......!

برائین اب ایک ذمے دار شوہر اور باپ چکا تھا' چنانچہ اس نے چھاپہ خانے میں ملازم چھوڑ دی۔ وہ اپنے بچوں کا مستقبل تابناک چاہتا تھا اور پھر وہ طباعت کے ہر شعبے کا ماہر اس نے اپنے گھر کے گیراج میں ایک چھوٹ چھاپہ خانہ لگا کر ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ چھ خانہ خریدنے کے لیے اس نے بینک سے قرض لی تھی۔

آدمی محنتی اور کاری گر تھا' پھر سب سے ب کر بے حد خوش اخلاق بھی تھا' چنانچہ چند ہی میں کاروبار چل نکلا اور ملازمت سے کہیں ز آمدنی ہونے لگی۔ لیکن ابھی وہ اس قابل نہیں کہ کوئی ملازم بھی رکھ سکے۔ اس نے اپنے مستق کے لیے بڑے بڑے منصوبے بنا رکھے تھے اسے یقین تھا کہ محنت کے ذریعے وہ کچھ عر

میں اپنا خاص مقام بنالے گا اور آخرکار ایک بہت بڑا پرنٹنگ ہاؤس قائم کرلے گا۔

پھر ایک روز صبح کے وقت جب برائین کام پر جانے والا تھا کہ ریبا نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا، اور ریبا گلنار چہرہ لیے کچن کی طرف بھاگ گئی۔

اسے معلوم تھا برائین اسے چھیڑے اور ستائے گا۔

19 ستمبر 1980ء کو ان کے ہاں تیسرے بچے کی پیدائش ہوئی۔ پیدائش کے وقت بچہ بے حد صحت مند تھا۔ اس کا وزن آٹھ پونڈ اور نو اونس تھا۔ ماں باپ نے خوب سوچ سوچ کر اس کے لیے فلپس کا نام تجویز کیا۔ ریبا کا کہنا تھا کہ فلپس ہمارے گھر کی روشنی اور آنکھوں کا نور ہے۔

رینڈی اور لارین بھی اپنے نئے بھائی کی آم
بے انتہا خوش تھے۔

ابھی ریبا اسپتال سے رخصت نہیں ہو
پائی تھی کہ ایک صبح ڈاکٹر اس کے کمرے میں آ
اس نے ریبا کا کیس کیا تھا، لیکن آج اس
چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ یہ خبر ریبا پر بجلی
کر گری کہ فلپس سانس کے مرض میں مبتلا ہو
ہے اور اس کے پھیپھڑے صحیح طور پر کام نہ
کررہے۔

ریبا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یا خدا! میری مدد کر میرے بچ
بچالے۔" بچے کی نازک حالت تھی۔ اسپتال
بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ فوراً برائین کو اطلاع دی
وہ کام چھوڑ کر اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹروں کی ا



نیم فلپس کی دیکھ بھال کررہی تھی۔ انہوں نے برائین کو بتایا کہ فلپس کے بچنے کے امکانات کم ہیں۔

ریبا کی حالت بڑی خراب تھی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی اور خدا سے اپنے بچے کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

''اے خدا! تو ہی زندگی اور موت پر قادر ہے۔ خداوند! میرے بچے کو زندگی دے دے۔''

برائین اسے طفل تسلیاں دیتا رہا۔

''ریبا! فکر مت کرو' بس خدا سے دعا کرتی رہو۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

برائین شام تک اسپتال میں رہا۔ فلپس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسے مصنوعی نظام تنفس کے ذریعے سانس بہم پہنچایا جارہا تھا' لیکن ریبا کے اصرار پر برائین کو گھر واپس آنا پڑا۔ رینڈی اور لارین کی دیکھ بھال بھی اب اس کے ذمے تھی۔

ریبا نرسری کے شیشے سے لگی فلپس کو دیکھتی رہی اور زیرلب دعائیں پڑھ کر اس پر پھونکتی رہی۔

''دیکھنے میں تو اتنا صحت مند ہے' پھر یہ مرض اسے کیسے آلگا......'' وہ سوچتی رہی۔

میامی کے اس اسپتال میں ایک پاکستانی لیڈی ڈاکٹر غزالہ بھی شعبہ اطفال میں کام کرتی تھی۔ اس نے نرسری کے شیشے سے لگی ایک خاتون کو روتے اور دعائیں مانگتے دیکھا تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئی۔

ریبا نے غزالہ کو اپنی درد بھری داستان سنائی۔ غزالہ نے کہا۔

''مسز برائین! ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے اگر
کے بچے کی زندگی ہے تو دنیا کی کوئی بیماری فلپ
آپ سے جدا نہیں کرسکے گی۔ آپ بھی
ماننے والی ہیں۔

خدا سے دعائیں جاری رکھیے اور ہاں
مواقع پر ہم مسلمان 'صدقہ' دیتے ہیں یعن
ضرورت مند کو اس کی ضرورت کی شے مہیا کر
ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو فلپس کا
بھی دے دیں۔''

''میں ایسا ضرور کروں گی بلکہ میں
برائین کو فون کرتی ہوں۔ وہ پڑوس میں
والے بوڑھے ٹام کو دس ڈالر دے دے۔''

ریبا تمام رات شیشے کے ساتھ لگی کھڑ
سے دعائیں مانگتی رہی۔ صبح کاذب سے ذ
ڈاکٹر غزالہ پھر آئی اور زبردستی ریبا کو اپنے ک
میں لے گئی۔ وہاں اسے سکون آور دوائی
سلا دیا گیا وہ خواب میں بھی وہ فلپس کو
رہی۔

صبح کے وقت جب ریبا کی آنکھ کھلی تو
دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔

''فلپس......!'' اس کے دل سے آوا
اور وہ باہر کی جانب بھاگی۔ دروازے میں
ٹکر نرس سے ہوئی۔ نرس نے گود میں فلپس
رکھا تھا۔ وہ پیارا سا بچہ قدرتی انداز میں
لے رہا تھا اور ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

اور پھر کمرے میں ڈاکٹروں کی بھیڑ لگ
سب لوگ حیران تھے کہ فلپس راتوں را
طرح مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا۔

''یہ تو میڈیکل ہسٹری میں ایک نئ
ہے۔'' ایک ڈاکٹر نے کہا۔

''اول تو ایسے مریض بچتے نہیں اور

جائیں تو صحت یاب ہونے میں انہیں مہینے لگ
جاتے ہیں۔ یہ راز میری سمجھ سے باہر ہے کہ
راتوں رات......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ڈاکٹر......!'' ریبا نے کہا۔

''تمہیں خالق کائنات پر یقین ہے یا نہیں؟
وہ چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا؟ اور ہاں' وہ ایک
پاکستانی ڈاکٹر ہے......گزالہ......وہ کہاں ہے؟''

''گزالہ...... وہ رات کو ڈیوٹی پر ہوتی
ہے۔'' ریبا مسکرائی۔

''اس سے پوچھ لینا فلپس راتوں رات کیسے
تندرست ہوگیا۔ اس نے اس سلسلے میں میری
رہنمائی کی تھی۔'' پھر وہ زیرلب بڑبڑائی۔

''سدکہ......!''

اور پھر دس دن بعد سارا خاندان ہنستا کھیلتا
خوشیوں اور مسرتوں سے معمور اپنی اسٹیٹ کار
میں اسپتال سے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔
برائین کار ڈرائیو کررہا تھا اور اس کے ساتھ ریبا
گود میں فلپس کو لیے بیٹھی تھی۔ رینڈی اور لارین
عقبی نشست پر اچھل کود کررہے تھے۔ ان سب کی
خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔

گھر واپس آنے کے چند روز بعد زندگی
اپنے معمولات پر آگئی۔ فلپس کی پیدائش اور
صحت یابی کی خوشی میں پڑوسیوں' عزیز و اقارب
وغیرہ کی شاندار ضیافت کی گئی۔ چند ماہ میں
برائین کا چھاپہ خانہ پہلے سے بھی زیادہ چل نکلا۔
اب ان کے گھر میں کچھ خوشحالی آتی جارہی تھی اور
یہ خاندان محبت و یگانگت کی مثالی زندگی گزار رہا
تھا۔

لیکن ابھی کئی آزمائشیں باقی تھیں۔ چھ ماہ
بعد ان کی پُرسکون زندگی میں پھر تلاطم پیدا ہوا۔
صبح کا وقت تھا۔ مارچ میں میامی کا موسم انتہائی
رومان پرور ہوتا ہے۔

ریبا نے بچوں کو ناشتا کرانے کے بعد
روانہ کیا اور برائین اپنے کام پر چلا گیا۔
معمول کے برخلاف ابھی تک بیدار نہیں ہ
ریبا گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔
دیر بعد اسے فلپس کے رونے کی آواز سنائی
وہ کام چھوڑ کر اس کی طرف بھاگی۔ فلپس
بخار سے جل رہا تھا اور وہ مسلسل روئے جا
تھا۔

اسے چپ کرانے کی ہر کوشش رائیگا
آخر کار ریبا نے فون پر شوہر سے مشورہ
روتے ہوئے فلپس کو کمبل میں لپیٹ کر
اسپیشلسٹ کے ہاں جا پہنچی۔

ڈاکٹر نے فلپس کا معائنہ کیا۔ بچے کو خا
بخار تھا۔ ڈاکٹر کی تشخیص یہ تھی کہ بچے کے کا
انفیکشن ہے' معمولی بات ہے لہٰذا گھبرانے
ضرورت نہیں۔ اس نے اینٹی بائیوٹکس د
لکھ دیں۔ ریبا نے گھر واپسی پر میڈیکل
سے ادویات خریدیں اور بچے کو گھر لا کر
تندہی سے اس کی دیکھ بھال میں جت گئی۔
بخار ٹوٹ گیا اور وہ تین چار دن میں رفتہ رفتہ
ہوتا گیا۔

اب فلپس معمول کے مطابق سوتا جا
دودھ پیتا تھا' لیکن چھٹے روز وہ پھر بیمار تھ
مرتبہ اس کے منہ میں اور رانوں کے اندر
سفید دانے نکل آئے تھے۔ چھوٹا سا بچہ
تکلیف کی بنا پر رو بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر
کا علاج شروع کردیا۔

اگلے دو تین ماہ خاندان بھر کے لیے
جان سے کم نہ تھے۔ فلپس کو نت نئی بیمار
گھیرتی۔ یوں ریبا کو روزانہ ڈاکٹر کے پا

پڑتا۔ گھر کا سارا انتظام ملیٹ ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت جھنجلائی رہتی۔ رینڈی اور لارین سہمے سہمے رہتے اور برائین اپنے کام پر پوری توجہ مبذول کرنے سے قاصر تھا۔ اس طرح اس کی آمدنی روز بروز گھٹنے لگی۔

خاندان کی خوشیوں کی ڈور جیسے ختم ہو گئی تھی اور ایک بیزاری' افسردگی اور نامعلوم سے خوف نے انہیں گھیر لیا تھا۔ دوسری طرف فلپس کی بیماری پر اٹھنے والے اخراجات میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کا بل' مختلف مہنگے مہنگے ٹیسٹ' نت نئی بیش قیمت دوائیں' برائین خاصا چڑچڑا ہو چکا تھا۔

ازدواجی زندگی میں پہلی بار ایک رات ان دونوں میں شدید تکرار ہوئی۔ قصور کسی کا بھی نہ تھا لیکن بے بسی' عدم تحفظ اور ایک اَن جانے خوف نے انہیں کئی ماہ سے گھیر رکھا تھا یہ اس کا ردعمل یا نکاس تھا اگرچہ بظاہر جھگڑے کی وجہ بڑھتے ہوئے اخراجات اور گھٹتی ہوئی آمدنی تھی۔

''میں نے یہ پریس چالیس ہزار ڈالر قرض لے کر لگایا تھا۔'' برائین پوری قوت سے دہاڑا۔

''اور اب میں' گھر کی ضروریات ایک طرف رہیں سود کی ماہوار قسط بھی ادا نہیں کر سکتا۔ زندگی جہنم کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔''

صبح جب دونوں کا موڈ نارمل ہوا تو ریبا نے تجویز پیش کی۔

''برائین! یہ ہمارا خون ہے۔ ہمیں اس کی زندگی کے لیے آخری سانس تک جدوجہد کرنی ہے۔ ہمیں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم اجازت دو تو میں آمدنی میں کچھ اضافے کے لیے اسکول میں ملازمت کر لوں۔''

برائین نے اسے ملازمت کی اجازت دے دی اور خود بھی اپنے اوقات کار میں اضافہ کر د
وہ بے چارہ علی الصبح کام میں جت جاتا اور ر
رات گئے تک کام کرتا رہتا۔ سر توڑ محنت کے سب
وہ بے حد کمزور ہو گیا' لیکن میاں بیوی کی جدوجہ
کے باوجود ان کے اخراجات آمدنی سے بڑھ
ہی چلے گئے۔ فلپس کو روز ایک نئی بیماری گھیر
اور اس کے لیے مہنگی سے مہنگی ادویات خرید
پڑتیں جو اگلی صبح تک بیکار ہو جاتیں۔ کیونکہ
سورج فلپس کے لیے ایک نئی بیماری لے کر طلو
ہوتا۔

اپنے علاقے کے ڈاکٹروں سے مایوس ہو
ریبا نے کسی ایسے ڈاکٹر کی تلاش شروع کر دی
بچے کے اصل مرض کی تشخیص کر کے اس
باقاعدگی سے علاج کر سکے۔ اس نے دور درا
سفر کیا اور بڑے بڑے نامور ڈاکٹروں سے مش
کیا۔ انہوں نے فلپس کا خوب ٹھونک بجا
معائنہ کیا۔ منہ مانگی فیسیں وصول کیں مگر نتیجہ و
ڈھاک کے تین پات' پھر ستم ظریفی یہ کہ ہر ڈا
کی تشخیص دوسرے سے یکسر مختلف تھی' چنانچ
ایک مختلف دواؤں کا مشورہ دیتا۔

ریبا نے ہر ڈاکٹر کی بتائی ہوئی دوا استعمال
اور تمام ہدایات پر عمل کیا لیکن فلپس کی بیما
بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ گول مٹول سا بچہ ہڈیوں
ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔ رینڈی اور لارین معلوم نہ
کیوں اس سے خوف کھانے لگے۔ وہ اس
نزدیک جانے سے بھی کتراتے تھے۔ صرف
کی مامتا تھی جس نے بچے کو سہارا دے رکھا تھ
بعض اوقات اسے یہ خوف دامن گیر ہو جاتا ک
فلپس کو کچھ ہو گیا تو...... لیکن وہ ایسے خیالات
دماغ سے جھٹک دیتی اور خدا سے اس کی درا
عمر اور صحت یابی کے لیے خشوع وخضوع

دعائیں مانگتی تھی۔

ایک دن وہ گھریلو سودا سلف خریدنے اسٹور پر گئی۔ وہاں اچانک ڈاکٹر غزالہ کو دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر غزالہ اس سے بڑی محبت سے ملی تھی۔ اسے ریبا اور فلپس اب تک یاد تھے حالانکہ روزانہ اس کا واسطہ کتنے ہی مریضوں سے پڑتا ہوگا۔ اس نے بچے کا حال دریافت کیا تو ریبا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر غزالہ اسے بڑی محبت سے برابر والے کیفے میں لے گئی اور اس کی دردناک داستان سنی۔ وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

"پہلے تو آپ کچھ صدقہ دیں۔" ریبا کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ یہ بات تو اس نے بالکل ہی فراموش کر دی تھی۔ اسے پہلے ہی اس طرف توجہ دینی چاہیے تھی۔ غزالہ کہہ رہی تھی۔

"ہمارے پیارے نبیؐ کی حدیث ہے کہ سب سے بہتر صدقہ یہ ہے کہ آپ کسی بھوکے کو کھانا کھلائیں، چنانچہ اگر آپ میری بات مانیں تو کسی بے کس اور لاچار انسان کو دو وقت کھانا کھلا دیا کریں۔"

"لیکن گزالہ......!" ریبا نے حیرانی سے کہا۔

"ہمارے ملک میں بھوکا کہاں سے ملے گا؟ یہ تو دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ یہاں ہر شخص کو ضروریات زندگی میسر ہیں۔"

"ریبا......!" غزالہ سنجیدگی سے بولی۔

"اپنے گھر کے ماحول سے باہر نکل کر دیکھو۔ تمہیں کتنے ہی ننگے بھوکے انسان مل جائیں گے۔ ان میں سے کسی کو دو وقت کھانا کھلا دیا کرو۔ اور ہاں، میں ایک ڈاکٹر کا نام اور پتہ لکھ دیتی ہوں۔ کل فلپس کو اپنے ساتھ لے جانا اور اس ڈاکٹر سے بھی مشورہ کر لینا۔"

غزالہ نے ایک کاغذ پر اسے ایک نا میامی کی میڈیکل یونیورسٹی کا پتہ لکھ دیا۔ گھر آتے ہی ریبا سب سے پہلے بوڑھے ٹام گئی۔ یہ سیاہ فام بوڑھا ایک مکان کی عقبی کو میں رہتا تھا۔ ستر برس کے لگ بھگ عمر تھی کام کاج کرنے کے قابل نہ تھا۔ سب سے یہ کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔

ٹام سے اسے پتہ چلا کہ امریکہ جنت جہاں کوئی بھوکا نہ ہو۔ وہ اکثر اوقات بھوک تھا۔ کون تھا جو اس کی پرواہ کرتا اس کو کھانا دی

ریبا نے ٹام سے کہا۔

"انکل! آپ روز ہمارے گھر آ کر کھا لیا کریں۔" اور ٹام کے چہرے پر ممنو کے تاثرات ابھر آئے۔ اسے یقین تھا بر ایک بوڑھے کے کھانے پر اعتراض نہیں ک گا۔

اگلے روز وہ فلپس کو میڈیکل یونیورسٹی گئی۔ یہاں اسے ماہر امراض اطفال اسکاٹ سے ملنا تھا۔ ڈاکٹر خوش اخلاق عمر شخص تھا۔ اس نے بڑی شفقت سے فلپس کا احوال سنا، ضروری سوالات کیے اور پھر اس پرانی رپورٹیں دیکھیں۔ اس کے بعد اس نے ٹیسٹ از سر نو کرائے۔

ان ٹیسٹوں کے نتائج چھ ہفتے بعد مو ہوئے۔ اس دوران ٹام روزانہ اس کے گھر کھانا کھاتا اور اسے ڈھیروں دعائیں د رخصت ہو جاتا۔ ایسے میں ریبا کو ایک انوکھی انجانی سی خوشی محسوس ہوتی۔ اس کی توقع کے مطابق برائین نے ٹام کے کھانا کھا اعتراض کرنے کے بجائے خوشی کا اظہار کیا تھا

ٹیسٹ کی رپورٹس موصول ہونے کے بعد ڈاکٹر اسکاٹ نے ریبا اور برائین دونوں کو بلوالیا۔ وہ انہیں اپنی تشخیص سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ اس نے بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ خدا نے انسانی جسم میں ایسے دوست جراثیم پیدا کر رکھے ہیں جو امراض کا مقابلہ کرتے ہیں اور چھوٹی موٹی بیماریوں کو بڑھنے سے قبل کنٹرول کرلیتے ہیں۔ یہی جراثیم اس وقت کام کرتے ہیں جب انسان شدید بیمار ہو۔ اس صورت میں کچھ کام ادویات کرتی ہیں باقی کام یہ از خود سر انجام دے لیتے ہیں اور انسان کو صحت مند و توانا رکھتے ہیں۔ یہ جراثیم مل کر انسان کا مدافعتی نظام تشکیل کرتے ہیں لیکن فلپس پیدائشی طور پر اس نظام کے دو اہم اجزاء سے محروم تھا۔ طبی اصلاح میں اس بیماری کو قلت مدافعت کہا جاتا ہے۔ اس کے باعث انسان ہر قسم کے جراثیم سے فوراً متاثر ہو جاتا ہے اور پھر کوئی بھی مرض مہلک صورت اختیار کرسکتا ہے۔

اس مرض کا مختصراً احوال بتا کر ڈاکٹر اسکاٹ نے فلپس کے بارے میں بتایا کہ اس کی ہڈیوں کا گودا وہ خلئے نہیں بنا رہا جن سے مدافعتی گلوبین بنتا ہے اور پھر اس گلوبین سے وہ اجزا بنتے ہیں جو انسانی جسم کو امراض سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ریبا اور برائین یہ سن کر سناٹے میں آگئے۔

''ڈاکٹر کیا یہ مرض ایڈز ہے؟'' برائین نے پوچھا۔

''ایڈز نہیں، لیکن اس کا بھائی سمجھ لو۔''

''تو پھر اس کا علاج بھی ناممکن ہوگا؟'' برائین بے حد مایوس تھا۔ ڈاکٹر مسکرایا۔

''خدا کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اس کا علاج موجود ہے، لیکن بڑا ٹیڑھا ہے۔ بہرحال کل سے علاج شروع کرتے ہیں۔''

اگلے روز ڈاکٹر اسکاٹ نے فلپس کو ا خون کے انجکشن دینے شروع کیے جس امراض کے خلاف مزاحمت کی قوت بدرجہ موجود تھی۔ اس علاج نے اثر دکھایا اور فلپس ٹھ ہونے لگا۔ چند ماہ اسی حالت میں گزرے فلپس کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہوتی گئی۔

ادھر بوڑھا ٹام ہر روز کھانا کھانے کے ریبا کو دعائیں دیتا رخصت ہوتا۔ خاتون درخواست پر وہ فلپس کی درازی عمر کی دعائیں کرتا۔

فلپس کی حالت بہتر ہو رہی تھی کہ اچا ایک دن اسے نمونیا ہوگیا۔ جب اس کو مق اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا تو ا 105 درجے کا بخار تھا۔ ریبا اس کی زندگی مایوس ہوچکی تھی۔ فلپس ایک علیحدہ کمرے میں تھا اور وہ لاؤنج میں کرسی پر بیٹھی رو رو کر خدا دعا کر رہی تھی۔

''اے کائنات کے خالق! اے خدا! میر معصوم بچے کو زندگی کی بھیک دے دے۔''

کئی دنوں کے مسلسل علاج سے فل تندرست ہوکر گھر واپس آگیا، لیکن اب اس وزن محض پندرہ پونڈ باقی رہ گیا وہ کھا پی سکتا تھ ہاتھ ہلا سکتا تھا۔ ریبا کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا، بہرح جب تک سانس تب تک آس۔

سالگرہ سے ایک ماہ قبل فلپس پھر شدید پڑ گیا۔ سارا دن اسے قے آتی رہی اور شا جب اسے ایمرجنسی روم پہنچایا گیا تو وہ بالکل م نظر آ رہا تھا۔ دس گھنٹے تک ریبا اور برا ایمرجنسی روم کے باہر بے چینی سے ٹہلتے رہے وہ نہ معلوم کیا کیا دعائیں مانگتی رہی۔ بہرحال

کے قریب انہیں اطلاع ملی کہ بچہ اس بحران سے بھی زندہ سلامت نکل آیا اور اب وہ رو بہ صحت ہے۔

ریبا اور برائین نے اسپتال کے کیفے ٹیریا میں ہلکا سا ناشتہ کیا اور پھر ڈاکٹر اسکاٹ سے ملنے روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر نے تمام حالات سن کر کہا۔

''دراصل فلپس کے مرض کا ایک ہی حل ہے۔''

''وہ کیا ڈاکٹر؟'' دونوں بے تابی سے بولے۔

''بچے کی ہڈیوں میں صحت مند گودے کی پیوند کاری کی جائے لیکن یہ گودا ایسے انسان کی ہڈی کا ہونا چاہیے جو جسمانی طور پر فلپس سے ملتا جلتا ہو' میرا مطلب ہے خون کے گروپ کے سلسلے ہی میں نہیں بلکہ اور کئی چیزوں میں بھی' یہ فیصلہ تمام ٹیسٹ لینے کے بعد کیا جاسکتا ہے۔''

''اس پیوند کاری سے کیا فائدہ ہوگا؟'' برائین نے پوچھا۔

''کیا فلپس تندرست ہوجائے گا؟''

''ضروری نہیں لیکن یہ آخری امید ہے۔ اگر ہمیں کوئی موزوں شخص مل جائے جس کا گودا فلپس کی ہڈیوں میں داخل کیا جاسکے تو امید کی جاسکتی ہے کہ جسم اسے قبول کرلے گا اور یہ گودا ضروری اجزا کی پیداوار شروع کردے گا جو جسم کا مدافعتی نظام کہلاتی ہیں۔ ہم اپنی کوشش کریں گے' آپ خدا سے دعا کریں۔ ماں باپ کی دعاؤں میں بہت اثر ہوتا ہے اور خدا یہ دعائیں قبول کرتا ہے۔''

چنانچہ ریبا اور برائین نے فوراً اس آپریشن کی منظوری دے دی۔ سب سے پہلے ماں باپ کے ٹیسٹ لیے گئے لیکن اس کا گودا فلپس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ بہرحال فلپس کی بہن لارین جس کی عمر اس وقت محض پانچ برس تھی' اس مقصد کے لیے مناسب پائی گئی۔

ڈاکٹر نے ابتدائی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد نیویارک کے میموریل سلوان کینسر سینٹر سے رابطہ قائم کیا۔ امریکہ میں ایسے آپریشن صرف چند اسپتالوں میں ہوتے ہیں جن میں یہ اسپتال ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بھی ایسے آپریشن کے لیے صرف سات بستر ہیں۔ فلپس کو ایک ماہ بعد داخلے کی تاریخ دی گئی۔

اس دوران فلپس کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ریبا نے اس کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا اور ڈاکٹر غزالہ کے ساتھ ساتھ ٹام کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ٹام کی زندگی میں ایسی دعوت میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ بے حد خوش تھا اور ریبا کو مسلسل دعائیں دیے جا رہا تھا۔

پارٹی کے اختتام پر ریبا نے ڈاکٹر غزالہ سے پوچھا۔

''مجھے کوئی اور طریقہ بھی بتاؤ' سدکہ تو میں مسلسل دے رہی ہوں۔'' غزالہ نے کہا۔

''ہر وقت خدا کو یاد کرتی رہو اور اس سے مدد مانگتی رہو۔ ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ خدا رحمٰن و رحیم ہے۔''

اور ریبا نے غزالہ کی یہ نصیحت گرہ سے باندھ لی۔

آخر کار فلپس کو نیویارک کے اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ فلپس کے کمرے کا روزانہ کرایہ 1500 ڈالر تھا۔ اس میں کرائے کے علاوہ دیگر سہولتیں بھی شامل تھیں جیسے جراثیم سے پاک فضا' پانی' خوراک وغیرہ' حتیٰ کہ اسے کھلونے تک ایسے فراہم کیے جاتے تھے جو جراثیم سے پاک

ہوئے۔

ریبا نے اپنی رہائش کے لیے اپنی کزن کا گھر منتخب کیا جو اسپتال سے 80 میل دور تھا۔ وہ روز صبح اپنی کار میں وہاں آتی اور شام کو واپس چلی جاتی۔

اِدھر برائین کو لارین کے بارے میں فکر لاحق ہوئی کہ ہڈی کے گودے کا عطیہ دینے سے کہیں بچی کو کوئی نقصان نہ پہنچے' چنانچہ اس نے کئی ماہرین سے رابطہ قائم کیا تاہم سب نے ایک ہی جواب دیا۔

''گودے کا عطیہ دینے والے کو کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ اس کا جسمانی نظام ازخود یہ کمی پوری کرلیتا ہے۔''

اسپتال میں ریبا' فلپس کے کمرے میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ شیشے کی دیوار کے پار کھڑی اسے دیکھتی اور انٹرکام پر اس سے باتیں کرتی رہتی اور زیرِ لب خدا سے اس کے لیے دعائیں کرتی۔ نیویارک میں اس نے بعض بے حد غریب و نادار افراد بھی دیکھے اور وہ حتیٰ الامکان 'سدکہ' کے خیال سے ان کی مدد کرتی رہی۔ اسے برائین کا بھی خیال تھا جو دن رات محنت کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی دیکھ بھال بھی کررہا تھا۔ اندازہ تھا کہ اس آپریشن پر تیس سے چالیس ہزار ڈالر تک صرف ہوں گے۔ گو ان میں سے 80 فیصد میڈیکل انشورنس سے مل جانے تھے۔ تاہم دیگر اخراجات بھی تو تھے۔

پھر ایک اور مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ نیویارک کے اسپتال میں لارین کے ٹیسٹ سے پتہ چلا کہ اس کا گودا فلپس کے لیے قابل قبول نہیں اور میامی کے اسپتال میں غلط نتائج اخذ کیے گئے تھے۔ ریبا تمام رات روتی اور خدا سے رحمت کی دعائیں کرتی

رہی۔

اگلے روز ڈاکٹروں نے بتایا کہ فلپ
بڑے بھائی رینڈی کا گودا بالکل مناسب
گا۔ ریبا یہ خوش خبری سنتے ہی بے اختیار
کے بل جھک گئی۔ اس کے منہ سے یہ الف
رہے تھے۔

''اے غزالہ کے خدا! میں تیرا کس
شکرادا کروں۔ تو واقعی رحمٰن ورحیم ہے۔''

جب رینڈی کو گودے کا عطیہ د
متعلق مطلع کیا گیا تو اس نے بڑے یقین
کہا۔

''امی! بھیا کے لیے میرے جسم کا
چاہیے لے لیں۔''

24 نومبر 1981ء کو صبح آٹھ بجے نر
رینڈی کو وہیل چیئر پر بٹھایا اور آپریشن ت
طرف لے گئیں۔ رینڈی نے بڑی ب
دکھانے کی کوشش کی' لیکن اس کے چہر
خوف اور پریشانی عیاں تھی۔ ریبا کا دل کر
گیا۔ اس کا بڑا بیٹا بھی خطرے کے منہ میں
جارہا؟ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پھر
دیر بعد اسے غزالہ کے الفاظ یاد آئے اور و
کرسی پر بیٹھ کر لفظ 'گاڈ' کا ورد کرنے لگی۔ ا
دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں بند کی خدا
کررہی تھی۔ اس کی تمام پریشانی ہوا ہوچکی تھ

اِدھر آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹروں نے
اور رینڈی کو بے ہوش کررکھا تھا۔ رینڈی
کولہے کی ہڈی میں سے ایک لمبی سرنج کے ذ
گودا نکالا گیا اور پھر یہ نرم تجلجلا گودا فلپس کی
میں ایک شریان میں داخل کردیا گیا۔ ری
لیے یہ دن بے حد صبر آزما ثابت ہوا۔ وہ کبھی
بیٹے کے کمرے کی طرف بھاگتی اور کبھی دو

بیٹے کے کمرے کی طرف اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ خدا کو یاد کیے جارہی تھی۔

آپریشن کے تیسرے دن فلپس کو 105 درجے کا بخار ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہوسکتا ہے اس کے جسم نے پیوند کاری قبول نہ کی ہو اور اگر ایسا ہوا تو اس کا نتیجہ موت کی صورت میں برآمد ہوسکتا ہے۔ بات اب ان کے اختیار سے باہر تھی۔

ریبا نے جلدی جلدی ڈاکٹر غزالہ کے نمبر ڈائل کیے۔ اتفاق سے وہ مل گئی۔ ریبا نے جملہ صورتِ حال بتا کر اس سے پوچھا کہ ان حالات میں وہ خدا کی خوشنودی کے لیے کیا کرے؟ ڈاکٹر غزالہ نے جواب دیا کہ میں اگرچہ آپ کے مذہبی عقائد میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتی، لیکن اتنی درخواست کروں گی کہ آپ مزید صدقہ دیں اور مسلسل یہ الفاظ دہراتی جائیں۔

''اے خدا! زندگی موت تیرے ہاتھ میں ہے، میرے بچے کو زندگی کی بھیک دے دے۔''

ریبا نے غزالہ کے مشورے پر پوری طرح خلوص دل سے عمل کیا۔ وہ مسلسل دو دن اور دو راتیں یہی الفاظ دہراتی رہی۔ اسے اردگرد کی کوئی خبر نہ تھی۔ نرسیں بڑی مشکل سے اسے کچھ کھلا پلا دیتیں ورنہ وہ استقبالیہ کمرے میں ایک کرسی پر گم صم بیٹھی یہی الفاظ دہراتی رہتی۔

اور پھر اچانک جیسے اس کے ذہن میں ایک اجنبی آواز گونجی۔

''فلپس ٹھیک ہوگیا ہے۔''

وہ چونک کر اٹھی۔ شام کا وقت تھا۔ استقبالیہ کلرک نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ تیزی سے باہر بھاگی۔ سامنے ہی ایک غریب سا بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا جارہا تھا۔ وہ دس ڈالر کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھماتی ہوئی بولی۔

''فلپس کا صدقہ۔'' اب اسے خود بھی بھوک محسوس ہورہی تھی۔

کھانا کھا کر جب وہ اسپتال واپس آئی تو نرس اس کا انتظار کررہی تھی۔ فلپس کا بخار ٹوٹ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت درست ہوتی گئی۔ اس کی ہڈیوں نے گودے کا عطیہ قبول کرلیا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ وہ جان پکڑتا جارہا تھا۔ آخرکار 30 دسمبر 1981ء کو وہ دن آن پہنچا جب اسے رخصت ہونا تھا۔ اسپتال کی نرسوں نے رینڈی، فلپس اور ریبا کے اعزاز میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا۔ پارٹی میں فلپس نے خوب کھایا پیا اور شور مچایا۔

جب وہ اسپتال سے رخصت ہونے لگے تو ایک نرس، جس نے فلپس کی دیکھ بھال کی تھی ریبا سے بولی۔

''مسز برائین! یہ بچہ بڑا خوش قسمت ہے جو بچ گیا ورنہ ایسے مریض زندہ نہیں رہتے۔'' ریبا نے جواب دیا۔

''فلپس کی زندگی کی دو وجوہات ہیں۔ خدا جو بہت رحمٰن و رحیم ہے اور دوسرا اسد کہ......!''

اور وہ فلپس کو گود میں اٹھائے رینڈی کا ہاتھ پکڑے کار کی طرف چل دی۔ کار میں برائین اور لارین ان کے منتظر بیٹھے تھے۔

اس خاندان کی خوشیاں پھر لوٹ آئی تھیں۔ ریبا نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ ڈاکٹر غزالہ سے مل کر اس کے مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کرے گی اور اگر اس مذہب پر کوئی کتاب مل سکی تو اس کا مطالعہ کرے گی۔

☆☆......☆☆

سلطان راہی اور سدھیر

اپنے وقت کے بے تاج بادشاہ
جنہوں نے فلم انڈسٹری پر راج کیا......

م۔ش۔خ

بے شک ہمیں اپنے رب ذوالجلال کی طرف لوٹنا ہے۔ جو نیک کام کرتے ہیں زندگی میں کر لیں کیونکہ رب کی طرف تو لوٹنے کے بعد بقا کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور انسان ایصال ثواب کا منتظر



رہتا ہے۔ کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں
زندگی کے ناطے کئی زندگیوں کے چراغ
ہوتے ہیں اور جب اُن کی زندگی کا چراغ
ہے تو اس چراغ کے بجھتے ہی کئی زندگ
چراغ مدھم ہو جاتے ہیں کیونکہ اِن چرا
محبت کے تیل کی کمی ہو جاتی ہے ماضی م
فلمی صنعت میں دو فنکار ایسے بھی گزرے
کی وجہ سے فلمی صنعت کے سیکڑوں مزدو
گھروں میں امید کی روشنی ہوتی تھی۔
رب کی ذات دیتی ہے مگر رب کے توسط
رب کے بندے زمین پر نیک کام کرر
ہیں ان میں دو نام سرفہرست ہیں۔ سلط
مرحوم اور سدھیر مرحوم سلطان راہی تو فن
تھے شہید اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ اُس
کسی سے دشمنی نہیں تھی وہ تو لوگوں کے
روز اسٹوڈیو میں محنت کرتا تھا اس فلمی صن
ایک دور ایسا بھی آیا کہ اردو فلمیں نہ ہو
برابر تھیں اور جو فنکار تھے وہ اپنی فلمی ز

یا پھر اپنی پروڈکشن شروع کردی۔اس وقت واحد اداکار سلطان راہی مرحوم تھے جن کی وجہ سے ایورنیو اسٹوڈیو اور شباب اسٹوڈیو میں رونقیں بحال ہوئیں انہوں نے کولہو کے بیل کی طرح مزدوروں کے لیے کام کیا کہ ان کے گھر کے چولہے جلتے رہے کبھی کسی فلم ساز سے معاوضے کے حوالے سے بحث یا جھگڑا نہیں کیا جس نے جو دیا خاموشی سے لے لیا کبھی پروڈیوسر سے بقایا واجبات نہیں مانگے منافقت سے ہمیشہ کوسوں دور رہے وہ پاکستان کے واحد اداکار یا ہیرو تھے جو عمر رسیدہ ہونے کے باوجود کم عمر ہیروئن کے ہیرو بنے اور فلمیں سپر ہٹ ہوئیں۔1970ء سے لے کر 1996ء تک انہوں نے پنجابی فلموں کے حوالے سے انڈسٹری پر حکومت کی پروڈیوسرز حضرات ہاتھ جوڑ کے اُن کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے مگر اُس نیک آدمی تھے کبھی غرور نہیں کیا شکل اور جسمانی لحاظ سے وہ ہیرو نہیں لگتے تھے۔ 1990ء کے بعد عمر رسیدہ بھی ہوگئے تھے مگر پاکستان میں اُن کے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں تھی۔جن میں صوبہ پنجاب کا ذکر ہے جنوری 1996ء میں کچھ لٹیروں نے چند سکوں کی خاطر اُن سے اُن کی زندگی چھین لی راقم کی تفصیلی ملاقات کراچی میں شوٹ ہونے والی فلم 'سڑک' کے دوران ایک انٹرویو کے لیے مقامی ہوٹل میں ہوئی اُس دن شہر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا تھا جس کی وجہ سے سڑک کی شوٹنگ کینسل ہوگئی اور پھر یہ ملاقات تقریباً چار گھنٹے رہی دوپہر کا کھانا مرحوم کے ساتھ کھایا دوران انٹرویو راقم اُن کی خوش گفتاری اور خوبصورت اردو سننے کے بعد حیرت زدہ تھا کہ



پنجابی فلموں کے سپر ہٹ ہیرو اور اردو ا
لاجواب میں نے اُن سے پوچھا۔

''راہی صاحب آپ کی اردو بہت لاجوا
ہے۔'' زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

''میاں کمال کرتے ہو میری مادری زب
اردو ہے اور ہمارا تعلق یو پی سے ہے ج
پاکستان بنا تو میں دس سال کا تھا ہجرت کر
پنڈی آگئے ہمارا ایک غریب گھرانے سے تعلق
پنڈی سے میٹرک کیا اور پنڈی کے صدر بازار
ایک دکان میں سیلز مین کی نوکری کرلی۔دکان

لک فرحت صاحب نیک آدمی تھے۔ وہ میرا ہت خیال رکھتے تھے اور پھر زندگی 1969ء تک شکل راتوں کے تحت گزرتی رہی اور پھر فلمی منعت کا رخ کرلیا۔ یہاں اخلاق احمد انصاری رحوم نے مجھے رہائش دی اور پھر لاہور کا ہی ہوکر رہ گیا۔ فلم 'باغی' میں مسرت نذیر اور سدھیر کے ساتھ کام کیا سدھیر بادشاہ آدمی تھے جونیئر سے ہت محبت سے پیش آتے تھے۔ سدھیر صاحب نے اقبال کاشمیری سے میری سفارش کی اور میں فلم 'بابل' میں کاسٹ ہوگیا اور اس فلم نے میری فنی زندگی کو ایک نئی زندگی دی میرے دل میں سدھیر صاحب کے لیے بہت احترام ہے وحید مراد مرحوم نے میری ملاقات ہدایت کار اسلم ڈار سے کرائی ورانہوں نے 'بابل' میں میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے وحید مراد کے کہنے پر فلم 'بشیرا' میں مرکزی کردار دیا اس فلم نے تو میری تقدیر بدل دی میں سلم ڈار اور وحید مراد کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا اور پھر فلم 'مولا جٹ' نے تو مجھے سپر اسٹار کی صف میں لاکھڑا کیا کچھ فنکاروں کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ سدھیر بہت اچھے انسان تھے پیار سے ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے۔ اقبال یوسف کی فلم 'ان داتا' میں اُن سے کئی مرتبہ ڈانٹ کھانے کا اتفاق ہوا وہ اور محمد علی اپنی مثال آپ تھے۔ علی جیسا سخی انسان میں نے نہیں دیکھا اور اتفاق سے ہم سب نے غربت کو بہت قریب سے دیکھا برخوردار تمہیں میری اردو سن کر حیرت ہورہی ہے جب آسیہ نے میرے ساتھ مولا جٹ میں کام کیا تو اُن کے پنجابی کا تلفظ سن کر میں اسی طرح حیرت زدہ ہوتا تھا جیسے تم ہورہے ہو آسیہ کی مادری زبان بھی اردو تھی اُن کے والدین نے لکھنؤ سے ہجرت کی تھی جبکہ ممتاز کی اردو بہت خوبصورت تھی اور وہ واحد اداکارہ تھی جو بہت کم میک اپ میں آیا کرتی تھیں۔ انہوں نے فلم 'کالیا' میں جب کام کیا تو ہم ہنستے تھے کہ گوری لڑکی 'کالیا' میں کام کررہی ہے۔ اُن کے والدین نے آگرہ سے ہجرت کی تھی جبکہ آسیہ اور ممتاز پنجابی فلموں کی سپرہٹ ہیروئن تھیں ۔ اُن سے طویل ملاقات ہوئی تھی مگر قارئین آپ کو مختصر بتاتا ہے سلطان راہی نماز پرہیزگار انسان تھے اُن کے ماتھے پر رب کے نور کا نشان تھا اسٹوڈیو میں مسجد بنوائی اور اکثر امامت کے فرائض انجام دیتے رمضان میں اسٹوڈیو میں بڑی افطاری کا اہتمام کرتے 'نعت پڑھنے کا اُن کا اپنا ایک خوبصورت انداز تھا پیار سے انہیں فلمی صنعت میں آغا جانی کہا جاتا تھا۔ مرحوم نے 500 کے قریب فلموں میں اداکاری کی جن میں بیشتر نے ڈائمنڈ جوبلی' پلاٹینم جوبلی' گولڈن جوبلیاں منائیں جبکہ سلور جوبلی فلموں کی تعداد تو سینکڑوں میں ہے اُن کے چہلم کے موقع پر راقم لاہور میں تھا ہم نے اپنی آنکھوں سے اُن کی یاد میں کتنے لوگوں کو آنسو بہاتے دیکھا رب اُن کی مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا اداکار سدھیر مرحوم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں سدھیر کا اصل نام شاہ زمان خان آفریدی تھا۔ 1922ء میں لاہور کے علاقے شیرانوگیٹ میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں راگنی کے ساتھ فلم فرض میں ہیرو آئے پھر 1949 میں ہدایت کار داؤد چاند کی فلم 'ہچکولے' میں نجمہ کے مقابل ہیرو آئے یہ پاکستان کی دوسری فلم تھی جبکہ پاکستان میں پہلی فلم 'تیری یاد' تھی جس کی ہیروئن آشا پوسلے تھیں جو بہت اچھی گلوکارہ بھی تھیں۔ (یاد رہے کہ انڈیا کی آشا پوسلے نہیں) یہ پاکستانی خاتون تھیں۔ فلم گلفام' مارچ 1954ء میں ریلیز

ہوئی پاکستان کی پہلی پنجابی گولڈن جوبلی فلم تھی جس کے ہیرو سدھیر اور ہیروئن صبیحہ خانم تھیں۔ باغی پاکستان کی پہلی فلم تھی جس کی نمائش چین میں ہوئی یہ سپرہٹ فلم 1956ء میں ریلیز ہوئی ان کی پہلی فلم بلبل جو پنجابی زبان میں بنی جس کی ہیروئن آشا پوسلے تھیں۔ آشا پوسلے جب 75 سال کی تھیں 1995ء کی بات ہے تو راقم سے اُن کی پہلی ملاقات اداکارہ ہدایت کارہ شمیم آرا نے کروائی تھی۔ آشا پوسلے مرحومہ نے بتایا کہ سدھیر صاحب کی پنجابی فلم 'دلا بھٹی' سپرہٹ فلم تھی اس فلم نے اتنا بزنس کیا تھا کہ آغا جی اے گل مرحوم نے ایورنیو اسٹوڈیو کی تعمیر کی جو اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا اسٹوڈیو ہے اس فلم کے ایک گیت نے پاکستان میں دھوم مچا دی تھی جس کے بول تھے' واسطہ ای رب دا تو جاویں رے کبوترا' جبکہ اُن کی فلم 'ماہی منڈا' نے اتنا بزنس کیا کہ باری صاحب نے باری اسٹوڈیو تعمیر کروایا 1958ء میں سدھیر کی پنجابی فلم 'جٹی' نے اتنا بزنس کیا کہ اس فلم کی آمدنی سے لاہور کا مبارک سینما تخلیق ہوا آخری ایام میں سدھیر کے گھر راقم سے ملاقات آشا پوسلے نے 1995ء میں کروائی سدھیر فلم انڈسٹری کی بے حسی سے بہت نالاں تھے انہوں نے فلمی صنعت کے لوگوں سے اور شوبزنس کے صحافیوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ بڑے اُداس لہجے میں راقم کو بتایا کہ شوبزنس میں بے وفائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے تم بھی شوبزنس پر لکھتے ہو اس قافلے سے زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرنا راقم اُن کی بات سے اتفاق کرتا ہے یہ صرف وقت کو سلام کرتے ہیں دورانِ گفتگو اُن کی بیگم اور ماضی کی ہیروئن شمی چائے لے کر اندر آئیں تو آشا پوسلے کو پیار کرتے ہوئے کہا کہ



آج ہماری یاد کیسے آ گئی آشا پوسلے نے
راقم کا تعارف کرایا کہ یہ کراچی سے آ
اور صحافی ہیں اُن کے اخلاق سے ہم بہ
ہوئے اور محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ بھی
سپرہٹ ہیروئن رہی ہیں وہ ہمیں بالکل
خاتون لگیں جبکہ سدھیر نے اداکارہ زیبا
شادی کی تھی مگر یہ شادی طلاق پر ختم ہوئی
گرامی آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ سد
صنعت کے رویے سے اتنے مایوس تھے ک
نے بے اختیار کہا کہ ایک وقت ایسا آئے گا
صنعت میں تالا پڑ جائے گا کہ یہاں بے ح
مجسمے رہتے ہیں اور واقعی گزشتہ دس سال
انڈسٹری میں تالا لگ گیا ہے۔

جنوری 1996ء میں سلطان راہی اور
1997ء میں سدھیر اپنے رب کی طرف
گئے' ماضی کے ان دو بے پناہ بڑے فنکار
اللہ مغفرت فرمائے۔

☆☆......☆☆

حرماں نصیب

ایسی لڑکی کی داستان جو محبت کے نام پر بار بار دھوکا کھاتی رہی کچی عمر میں فریب کو حقیقت ماننے والی لڑکیوں کی داستان عبرت......

جاوید راہی

جس طرح ایک فلم دیکھنے سے پہلے اس کے سٹر کو دیکھ کر بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں سی طرح جوانی کی آمد سے پہلے عالیہ نے اپنے س پاس جوانی کے ان چلتے پھرتے پوسٹروں کو یکھ کر بہت سی خیالی معلومات حاصل کر لیں تھیں جنی وہ معلومات صرف سوچ کی حد تک محدود تھیں۔ زندگی کی کسی تجربہ گاہ میں وہ آپریشن کیلئے پہنچی تھی۔ زندگی میں جو پہلا سرجن اس کے قریب آیا وہ بڑا بے باک تھا۔ اس کے اندر کی سانسیں سننے کیلئے اسٹیتھیسکوپ کو اس کے سینے پر رکھ کر ہاتھ اُٹھانا بھول جاتا تھا۔ عالیہ بھی سب کچھ بھول کر صرف اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتی رہ جاتی تھی۔ اس ہاتھ والے کی شخصیت اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے دل میں تہہ با تہہ اُترتا چلا گیا۔ اس کی قربت میں ایسی دیوانگی تھی کہ فاصلوں کا وجود باقی نہ رہا۔

ان دنوں عالیہ جاگتی آنکھوں سے بڑے سنہرے بڑے بڑے سلسلے سپنے دیکھتی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اقبال پاشا کو پا کر زندگی کو فتح کر لیا ہے۔ فاصلوں کا وجود مٹا تو وقت سے پہلے ہی اس کے اندر کی عورت بالغ ہو گئی۔ مرد اور عورت کے رشتے کی پہچان اسے اقبال پاشا نے کروائی۔ یہ رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے جدا تھا۔ اب سے پہلے عالیہ ماں باپ اور بہن بھائی کے پیار کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی لیکن اقبال کی محبت کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

یہ روز کا معمول ہو گیا اقبال کو جب بھی دوسرے مریضوں سے فرصت ملتی وہ اپنی اسپیشل مریضہ کے اسپیشل کمرے میں چلا جاتا اور اسپیشل توجہ سے اس کا علاج کرتا اور اسے تجربوں سے سمجھاتا کہ اس کی سوچ سیلاب سے متاثر ہونیوالوں کیلئے نہیں ہے۔

جب وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر اپنے والدین کے ساتھ اپنے گھر جانے لگی تو اس سے پہلے اقبال نے اس سے بہت سے وعدے کیئے کہ وہ اس کے یہاں آیا کرے گا اور ان رنگین

ملاقاتوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دے گا۔ اس کا وعدہ ایک ماہ تک قائم رہا دوسرے ماہ عالیہ کے یہ سُن کر ہوش اُڑ گئے کہ وہ دوسرے دیس سے آنیوالا پنچھی اُڑ گیا ہے اور اسے بتائے بغیر اپنے وطن واپس چلا گیا ہے۔ سپنوں کے سارے شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ ایک تو اس کی بیوفائی کا دُکھ تھا دوسرا صدمہ اس بات کا تھا کہ اس کا جھوٹا پیار اس کے وجود میں پل رہا تھا۔ وہ بدنامی کے ڈر سے کپکپا اُٹھی۔ اقبال دکھوں اور بدنامیوں کا جو ہار اس کے شانے پر ڈال گیا تھا اس کے تلے آ کر اس کا وجود کچلا جا رہا تھا۔

جب اس بات کا علم اس کے گھر والوں کو ہوا تو اس کے ماں باپ غصے، توہین اور شرم سے تلملانے لگے غصہ اس بات کا تھا کہ جوان بیٹی نے بوڑھے والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی، توہین اس بات کی تھی کہ عیاش آدمی ان کی
سے کھلونے کی طرح کھیل گیا تھا اور شرم
کی تھی کہ اب وہ دنیا والوں کے سامنے
سکتے تھے۔ ایک لڑکی کے غلط قدم اُٹھ
پورے خاندان کا غرور مٹی میں مل گیا تھا

ماں باپ نے فوری فیصلہ کیا کہ لڑ
سے دور سمندر کے ساحل پر لے جا
جہاں ان کا ذاتی کاٹج ہے۔ جب تک بچ
اس وقت تک وہ اسے وہاں چھپا کر رکھیں
بچے کو سمندر میں ڈال کر بیٹی کو گھر لے آ
سمندر کے کنارے جب وہ کاٹج میں پہنچ
اپنے والدین کے بھیانک فیصلے کا علم
ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

''وہ میرا بچہ ہوگا میں اسے نقص
پہنچانے دوں گی میں اسے لے کر کہیں



اؤں گی"۔

لیکن ایسی ممتا کا درد کون سمجھتا ہے؟ ایسی ورت کے جذبوں کو کون پہنچانتا ہے جو چور استوں سے ماں بنتی ہے جب وہ ڈاکٹر کی آغوش یں تھی تو جوانی کے جوش میں ماں بننے کی خواہش ہیں تھی مگر جب ماں بننے لگی اس وقت سمجھ آیا کہ چہ چاہے بن بلائے آئے مگر ڈائن بن کر اسے نہیں کھا سکتی۔ کوئی اس کے دل سے پوچھے جو اپنے جود کو چھلنی کر کے ایک ننھی سی خوشبو کو چھانتی ہے ھر ایک پھول کی طرح اس خوشبو کو اپنے سے جدا ہیں ہونے دیتی۔

لیکن عالیہ کو اس کے ماں باپ نہ سمجھ سکے۔ ٹی کتنے ہی طوفانوں سے گزر جائے ماں باپ تو سے نادان بچی ہی سمجھتے ہیں۔ اپنے سامنے کھلی ہو ی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ اب وہ نادان بچی ہیں رہی ہے۔ کلی سے پھول بننے کے تجربے سے گزر چکی ہے اور اس دنیا کی تخلیق میں ہر ماں کے برابر حصہ لے رہی ہے۔ اس لئے ہر ماں کی طرح اس کے اپنے جذبات بھی ہوں گے مگر کوئی سے نہ سمجھ سکا۔

وہ باغیانہ انداز میں سوچنے لگی کہ اس کالج سے نکل بھاگے گی۔ کوئی دن رات اس پر پہرے نہیں بٹھا سکتا تھا مگر گھر کی چوکھٹ سے نکلنے کے خیال سے ہی ہر سو گھور اندھیرے میں کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آتا تھا جس پر چل کر وہ اپنے بچے کو جنم دے سکے۔

عورت گھر سے تنہا نکلے تو چاروں طرف اندھیرے ہی منڈلاتے رہتے ہیں اور وہ روشنی کی تلاش میں ساری عمر بھٹکتی رہتی ہے۔ کچھ اس طرح کہ روشنی کی تلاش میں بھٹکتی بھی ہے اور روشنی سے چھپتی بھی ہے اس لئے کہ روشنی میں اس کا گناہ گار وجود عریاں ہو جاتا ہے اور اندھیرے بہت سے عیبوں کی پردہ پوشی کر لیتے ہیں اور اس جیسی عورت جو بیوی بننے سے پہلے ماں بن رہی ہو اس کے مقدر میں تو سدا اندھیرا ہی ہوتا ہے اور روشنی اسے ڈراتی رہتی ہے۔

کالج سے بھاگنے کا فیصلہ کمزور پڑ گیا۔ اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ سوچا کہ وہ بچے کو اسی کالج میں جنم دے گی لیکن اسے ظالم ہاتھوں تک پہنچنے نہیں دے گی۔ صرف ایک دن کی بات ہوگی جس دن بچہ ہوگا اس دن وہ تمام درد اور تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے اسے لے کر وہاں سے نکل جائے گی۔ جب تک وہاں سے نکلے گی تب تک اپنی ماں کو بھی اپنے بچے کے قریب نہیں آنے دی گی۔

اس فیصلے سے مطمئن ہونے کے بعد وہ وقت کا انتظار کرنے لگی۔ اس دوران وہ اپنی ماں کو سمجھاتی رہی کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد فوری الگ نہ کیا جائے کم از کم اسے ایک بار سینے سے لگا کر پیار کرنے کا موقع دیا جائے۔ ماں نے اسے سمجھایا۔

"تم اسے پیار کرو گی تو پیار بڑھتا رہے گا اگر تم آنکھیں بند رکھو گی اور یہ سمجھو گی کہ وہ اس دنیا میں آتے ہی واپس چلا گیا ہے اور اس کی عمر صرف چند گھڑیوں کی تھی تو تمہیں زیادہ صدمہ نہیں پہنچے گا۔"

اس نے ماں سے پوچھا

"کیا مجھے پیدا کرتے وقت آپ ایسا سوچ سکتی تھیں؟ کیا آپ مجھے مار سکتی تھیں؟ مجھے جیتے جی سمندر میں پھینک سکتی تھیں؟ آپ عورت ہو کر کیوں عورت کی فطرت کے خلاف بات کر رہی ہیں"؟

اس کی باتوں سے پریشان ہو کر وہ وہاں سے
چلی جاتی۔ قتل کرنا سب سے بڑا گناہ ہے مگر کبھی
کبھی عزت اور ناموس کی خاطر ایک عورت
دوسری عورت کی ممتا کی قاتل بن جاتی ہے اسی
لیے اس کی ماں بھی مجبور تھی اپنی بیٹی کو نہیں مار سکتی
تھی مگر اپنی بیٹی کی ممتا کو قتل کر سکتی تھی۔

عالیہ کو زندگی کے سارے نشیب و فراز کا علم
نہیں تھا اس نے بڑے عزم سے یہ فیصلہ کر لیا تھا
کہ بچے کی پیدائش کے وقت بہت زیادہ محتاط
رہے گی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ پیدائش کے وقت
عورت پر کیسی قیامت ٹوٹنے لگتی ہے جب زچگی کا
وقت قریب آ گیا تو بچہ وجود میں آنے سے پہلے ہی
ماں کے وجود میں زلزلے کے جھٹکے پہنچاتا
رہا۔ اسے ایسی اذیتوں میں مبتلا کرتا رہا جس کا اس
نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ درد اور تکلیف سے
تڑپتی رہی اس کے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے
رہے۔ جو عزم و استقلال تھا وہ اس کے اندر ٹوٹ
ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ بس اسے اتنا ہی ہوش رہا کہ
اس نے نوزائیدہ بچے کی چیخ سنی تھی۔ اس کے بعد
وہ ہوش کی دنیا سے دور ہوتی چلی گئی۔

جب وہ ہوش میں آئی تو اپنے آس پاس کے
ماحول کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی پہلے تو اس کی سمجھ
میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں
ہے پھر اچانک ہی وہ چیخ کر بولی۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟"

اس کی ماں نے قریب آ کر اس کے سر پر
ہاتھ پھیر کر تسلی دی۔

"میری بچی اسے بھول جاؤ۔ وہ مردہ پیدا ہوا
تھا"

عالیہ غصے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ جھوٹ بولتی ہیں، وہ مردہ نہیں تھا میں
نے اس کی چیخ سنی تھی۔ کہاں ہے وہ؟
عورت ہو؟ کیا تمہارے سینے میں عور
نہیں ہے؟ میں نے تم سے التجا کی تھی ک
ایک بار اسے دیکھنے دینا مگر تمہیں میری
بھی ترس نہ آیا۔"

اب ماں باپ کو اس پر ترس آ رہا تھا
جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے کر چکے تھے۔ ا
سے ہمدردی کرنی تھی۔ اسے تسلیاں د
تھا کہ اب وہ نئی زندگی کا آغاز کرے او
بھول جائے لیکن ماضی کہاں بھلایا جا سک
ماں اپنے بچے کو کہاں بھول سکتی ہے؟ و
کے باوجود چیختی چلاتی رہی جب تھک گئی
لگی جب روتے روتے تھک گئی تو سو گئی۔

دوسرے دن اس کی آنکھ کھلی تو اس پ
جنون سوار ہو گیا وہ اپنے بچے کو پکارتی ر
باپ اس کے سامنے آتے تو اسے ان کی
سے خون ٹپکتا محسوس ہوتا اور وہ انہیں قا
پکارنے لگتی۔ پھر یہ جنون بھی آہستہ آ
پڑنے لگا۔ اس نے جنون میں آ کر کھا
سے انکار کر دیا۔

اب وہ تھک ہار کر اپنے بستر پر بیٹھ
تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے جا
سمندر کی لہریں دور دور تک چمک رہی تھیں
کے احساسات بدل گئے تھے۔ ان لہروں ک
اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ننھے کے آ
رہے ہوں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھلتی جا ر
سمندر کی لہروں میں طوفان کا شور تھا اور
نئے طوفان کی زد میں آ کر یہ فیصلہ کر چکی تھ
یہاں اب قاتلوں کی سر پرستی میں نہیں
گی۔ کہاں جائے گی؟ وہ خود نہیں جانتی تھ

مرنے سے گھبراتی تھی مگر چاہتی تھی کہ باہر سے کوئی اسے مار ڈالے۔ پھر وہ بستر سے اُٹھ کر اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ اس نے دوسرے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے دیکھا اس کے ماں باپ ابھی تک جاگ رہے تھے اس کی ماں بستر پر بیٹھی رو رہی تھی اور آنچل سے آنسو خشک کرتے ہوئے بول رہی تھی۔

''میں ایک بیٹے کی آرزو کرتے کرتے بوڑھی ہوگئی خدا نے اس عمر میں ایک نواسہ دیا تو کلیجے سے نہ لگا سکی، آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔ نہ میری بچی کے جذبات کا خیال کیا نہ ہی میرے ارمانوں کا خیال آیا۔ کیا ہم اسے دنیا والوں کی نظروں سے چھپا کر نہیں رکھ سکتے تھے؟ کیا اس طرح ایک بیٹے کی آرزو پوری نہیں ہوسکتی تھی؟''

اس کے باپ نے بگڑ کی سخت لہجے میں کہا۔

''فضول باتیں نہ کرو۔ انسان عزت کی خاطر اپنی اولاد کو قربان کر دیتا ہے پھر وہ اولاد تو ایسی تھی جس پر ہم فخر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ہماری زندگی میں اور اس کے بعد ہمیشہ بدنامی کا سبب بنی رہتی۔ میں نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ تم عالیہ کے سامنے صبر سے کام لے رہی ہو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ تمہیں اسی طرح صبر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں دیکھتیں کہ عالیہ بھی کسی حد تک اس صدمے کو برداشت کرتی جارہی ہے''۔

عالیہ وہاں سے ہٹ کر دبے پاؤں چلتی ہوئی کاٹج سے باہر آ گئی۔ اس کے دماغ میں ماں کی بات گونج رہی تھی کہ ان کے ہاں نواسہ ہوا تھا یعنی اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔

آہ! کہاں ہے میرا ننھا منا۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ تاروں بھرے آسمان کو دیکھنے لگی۔ کہاں ہے میرا ننھا منا؟ ایک بار میرے پاس آئے۔ میں اسے پھولوں کی طرح اُٹھاؤں گی اور خوشبو کی طرح گلے لگاؤں گی۔ وہ روتی ہوئی اور دوڑتی ہوئی وہاں سے دور جانے لگی۔

جوان مرد ساری عمر دھکے کھاتے ہیں مگر انہیں کوئی سہارا نہیں دیتا ہمدردی کی ایک نظر بھی نہیں ڈالتا۔ اس کے برعکس جوان عورت کو قدم قدم پر سہارا مل جاتا ہے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک میل تک گئی تو پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

''رک جاؤ۔ کون ہو تم؟''

اس کے قدم رُک گئے۔ وہ جیسے خیالات سے چونک گئی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ زمین پر چل رہی ہے یا ہواؤں میں اُ رہی ہے۔ بس رات کی تاریکی میں اس کی نظروں کے سامنے ایک چھوٹا بچہ تھا جو اسے اپنی طرف بلا رہا تھا اور وہ اس کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ کسی اجنبی کی آواز سن کر وہ ایک دم چونک گئی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

تاروں کی روشنی میں ایک صحت مند اجنبی کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ ماچس کی تیلی جلا کر اپنا سگار جلانے لگا تو اس کی روشنی میں اس کی صورت واضح ہوگئی۔ اس کے چہرے پر زندگی کی پختگی تھی اچھی خاصی عمر کا آدمی تھا۔ اس کی دونوں انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں جس سے پتا چلتا کہ وہ کافی دولت مند ہے۔ عالیہ بس اتنا ہی د سکی پھر اس کا سر چکرانے لگا کیونکہ وہ زچگی سے اُٹھی تھی۔ بہت زیادہ کمزور اور کاٹج سے ایک میل دور تک دوڑتی ہوئی کبھی چلتی ہوئی گئی۔ حالات نے اسے بری طرح رگیدا تھا کہ وہ چک کر ریت کے فرش پر گر پڑی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بہت ہی خوب صورت بیڈروم میں پایا جو قیمتی

سے سجا ہوا تھا۔ اس کا بدن فوم کے نرم و ملائم بستر میں دھنسا ہوا تھا اور اوپر سے مخمل کا لحاف اوڑھا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ چپ چاپ پڑی رہی اس اجنبی ماحول کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کس کا گھر ہے اور وہ یہاں تک کیسے پہنچ گئی۔ پھر اسے گزری رات والا اجنبی یاد آیا جو ماچس کی تیلی جلا کر سگار سلگا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس کی صورت نظر آئی پھر وہ آگے کچھ نہ دیکھ سکی تھی، لڑکھڑا کر گر پڑی تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ شاید وہ اجنبی ہی اسے یہاں لے کر آیا ہے۔ یہ سوچتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے وہ لحاف کے اندر بے لباس ہے۔ اس نے جلدی سے خود کو ٹٹولا اپنے آپ کو اِدھر سے اُدھر چھو کر دیکھا واقعی اس کے بدن پر کپڑا نہیں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ خیال اسے پریشان کر رہا تھا کہ کس نے اس کا لباس اُتارا ہے؟ کیا اس اجنبی نے؟

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ لحاف کو اپنے اطراف لپیٹ کر کمرے میں نظریں دوڑانے لگی کہ وہاں کوئی موجود تو نہیں ہے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے کوئی اسے دیکھنے والا نہیں تھا وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک صوفے پر اس کا لباس بکھرا ہوا پڑا تھا۔ وہ چند لمحے تک دروازے کی طرف دیکھتی رہی کہ کوئی آ نہ جائے پھر فوراً ہی لحاف سے الگ ہو کر تیزی سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی اندر سے چٹخنی لگائی پھر اپنا لباس پہننے کیلئے صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

لباس پہننے کے دوران وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ اور کس کے مکان میں ہے؟ کہیں سے کسی کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بڑی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لباس پہنن[...] بعد اس نے سرہانے دیکھا دودھ کا گلاس ر[...] تھا اس کا حلق خشک ہو رہا تھا وہ پلنگ کے سر[...] بیٹھ کر اس دودھ کے گلاس کو اُٹھا کر پینے گ[...] گلاس کے نیچے ہی ایک چھوٹی سی پرچی پڑ[...] تھی اس نے پرچی کھول کر دیکھا اسمیں لکھا [...]

"تمہارے سرہانے کیسٹ ریکارڈ [...] ہے اسے آن کرو"۔

اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر ر[...] پلگ لگا دیا پھر اسے آن کر کے اس قریب بی[...] چند لمحوں بعد اس میں سے ایک اجنبی مرد ک[...] اُبھرنے لگی۔

"تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ [...] دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے تم س[...] کی نگری سے اُتر کر سمندر کے ساحل پر ٹہل[...] آ گئی ہو۔ تم بہت پریشان تھیں اور ایک طر[...] دیوانگی کی حالت میں آگے بڑھتی جا رہی تھ[...] بہت دیر سے تمہارا پیچھا کر رہا تھا جب می[...] دیکھا کہ تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے تم [...] تنہا ہو تو میں نے تمہیں آواز دی، تم نے مجھے [...] لیکن کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا اسی وقت [...] کر ریت پر گر پڑیں۔ میں تمہیں اُٹھا کر [...] لے آیا۔ سمندر کی لہروں نے تمہارے لباس [...] دیا تھا تمہیں گیلے کپڑوں میں چھوڑ دینا منا[...] نہیں تھا لہٰذا تمہارا لباس اُتارنے کی گستاخی [...]

تم ایک بے مثال حسین لڑکی ہو۔ لڑکی [...] بلکہ عورت ہو کیونکہ میں نے تمہارے سینے [...] دودھ کے چشمے اُبلتے دیکھے جس سے پتہ چل[...] کہ تم نے ایک بچے کو جنم دیا ہے وہ بچہ کہاں [...] تم اپنے بچے کو چھوڑ کر کہاں جا رہی تھی اس [...] میں تمہارے حسین مکھڑے کو دیکھتا جا رہا ہوا[...]

یہ باتیں ریکارڈ کرتا جا رہا ہوں۔ میں اس کے بعد ایک ضروری کام سے چلا جاؤں گا۔ واپسی کب ہوگی یہ میں خود نہیں جانتا۔ تمہارے سرہانے میز پر اس مکان کے ہر کمرے کی چابیاں رکھی ہیں بیڈ روم کے دروازے کو میں نے باہر سے لاک کر دیا ہے تم چاہو تو اس چابی سے دروازے کو کھول سکتی ہو مگر میں تم سے درخواست کروں گا کہ تنہائی، بے بسی، بے چارگی و بے مددگاری کے عالم میں تمہیں اس مکان سے باہر نہیں جانا چاہئے مجھ پر بھروسہ کرو یہاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کچن میں کھانے پینے کا تمام سامان موجود ہے جب میں واپس آؤں گا تو تمہارے پہننے کیلئے کپڑے لے آؤں گا یہاں تمہیں کسی بات کی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں جب یہاں آؤں گا تو پتا نہیں کہ تم جاگ رہی ہو گی یا سو رہی ہو گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے حالات اس کیسٹ میں ریکارڈ کر دو اور ریکارڈ کرنے کے بعد اسے دوسرے کمرے میں رکھ دو۔ میں آ کر تمہارے حالات سنوں گا اور یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کن حالات کے تحت تم گھر سے بے گھر ہو گئی ہو مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے اور اگر تم میرے دل کی بات جاننا چاہو گی تو میں سچ کہوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تم برا نہ ماننا۔ میرے جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ اگر میں کوئی برا آدمی ہوتا تو باہر سے مکان کو اچھی طرح بند کر کے چلا جاتا۔ تمہارے لئے اس مکان کی چابیاں چھوڑ کر نہ جاتا۔ یہاں تمہارے لئے سب کچھ موجود ہے تم اگر بھروسہ نہ کرنا چاہو تو بیرونی دروازہ کھول کر جا سکتی ہو۔ اگر بھروسہ کرو گی تو مجھے اپنا سب سے بڑا اور سب سے مضبوط سہارا پاؤ گی۔ میں تمہارے مقدر کی تاریکی دور کر سکتا ہوں، وعدہ کرتا ہوں۔ میرا نام عادل ہے"۔

اس کے بعد کیسٹ خاموش ہو گیا۔ عالیہ نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر سوئچ آف کر دیا۔ اس کے بعد بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ تھکن اور کمزوری سے بر حال تھا وہ سب کچھ بھول کر بس آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہتی تھی مگر اب اس اجنبی کی آواز دماغ کے گنبد میں گونج رہی تھی۔ بڑی بھاری بھرکم اور متاثر کرنے والی آواز تھی۔ سیدھی دل کو چھو لیتی تھی وہ تھوڑی دیر بعد گھبرا کر سوچنے لگی۔

"میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں۔ اس اجنبی سے میرا کیا رشتہ ہے؟ کوئی رشتہ نہیں میں نے ا اس کی ایک جھلک دیکھی ہے اور اس وقت دیکھی ہے جب سر چکرا رہا تھا مگر اب دھیمی دھیمی سی روش میں وہ چہرہ نظر آ رہا ہے اس کی آواز اس کے چہرے سے بھی کیا لینا ہے؟ میں اس کے بار میں کیوں سوچ رہی ہوں۔"

اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی مگر اس کروٹ میں بھی وہ یاد آتا رہا۔ اس کی باتیں دماغ میں گونجتی رہیں۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ اس نے شرافت کا ثبوت دیا تھا اس کیلئے مکان کے تما کمروں کی چابیاں چھوڑ کر گیا تھا اور اسے فیصل کرنے کی پوری آزادی دے گیا تھا کہ وہ اس پر بھروسہ کرے یا اس کی عدم موجودگی میں وہاں سے چلی جائے۔

مگر وہ کہاں جا سکتی تھی۔ کمزوری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ننھے سے بچے کی یاد اسے او کمزور بناتی جا رہی تھی۔ اس مکان سے باہر جا تو پھر اس بھری دنیا میں خود کو تنہا پاتی۔ پتا نہیں کو اتنی شرافت سے اسے پناہ دیتا یا نہیں۔

بہت سی سوچیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں سوچ کر تو وہ شرم سے کٹی جا رہی تھی کہ ایک اجن نے اس کے کپڑے اُتارے ہیں۔

وہ بستر پر لیٹی اپنے اندر حوصلے پیدا کرتی رہی کہ وہ باہر جا کر اتنی بڑی دنیا میں تنہا زندگی گزار لے گی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بستر سے اُٹھ گئی۔ باہر آ کر اس نے مکان کے دوسرے تمام کمروں کو دیکھا اپنے بستر کے سرہانے سے وہ چابیاں لے کر آئی تھی۔ اس نے ایک چابی سے بیرونی دروازے کو کھولا پھر برآمدے میں آ گئی باہر بہت ہی صاف ستھرا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ دور دور تک شاندار کوٹھیاں اور باغیچے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ اپنے شہر میں اس نے یہ علاقہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں بہت دور چلی آئی ہے۔ وہ الجھ کر رہ گئی کہ کیا کرے۔؟ کہاں جائے؟ یہ جگہ ہی انجانی تھی۔ تمام راستے انجانے تھے اور یہاں سے وہاں تک یعنی جہاں تک وہ جا سکتی تھی کہ کوئی ایسا شناسا نہیں تھا پھر وہ اس کمزوری کی حالت میں کتنی دور تک چل سکتی تھی اس کا سر پھر گھومنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کا سہارا لیتی کمرے میں واپس آ گئی اور پھر وہاں سے جانے کا فیصلہ کمزور پڑ گیا۔

وہ شام تک بستر پر پڑی رہی۔ سوچ ہی سوچ میں کس طرح وقت گزر گیا اسے پتا ہی نہیں چلا جب بھوک کا احساس ہوا تو وہاں سے اُٹھ کر کچن میں گئی۔ وہاں گیس کے چولہے پر دودھ کی ہنڈیا رکھی تھی۔ فریج میں دنیا بھر کے پھل اور میوے رکھے ہوئے تھے۔ کچا گوشت بھی تھا اور تازہ سبزیاں بھی تھیں۔ اسٹور میں دال، چاول، آٹا سب کچھ تھا مگر وہ پکانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے نعمت خانے میں سے ڈبل روٹی کے چند سلائس لئے پھر اسے جیلی کے ساتھ کھانے لگی۔ چولہے کے پاس ہی دودھ کی دیگچی کے اوپر ایک چھوٹی سی پرچی رکھی ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد جب اس نے اس پرچی کی طرف دھیان دیا تو اسے ک[...]
پڑھا اسی اجنبی کی تحریر تھی اس نے لکھا تھا

"تم بے حد کمزور ہو، میرا پرخلوص مشو[...]
کہ رات کو سونے سے پہلے ایک گلاس دو[...]
لینا مجھے امید ہے کہ تم میرے مشورے پر عمل [...]
اور اپنی صحت کا خیال کرو گی۔ تمہارا عادل"

وہ پرچی پڑھنے کے بعد پھر سوچ میں [...]
گئی۔ وہ کون ہے؟ اس سے اتنی ہمدردی ک[...]
کیوں کر رہا ہے؟ کسی بھی مقصد کیلئے کر ر[...]
ابھی اسے آرام پہنچانے کیلئے جتنے بھی اقد[...]
تھے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کی بھلائی[...]
ہے اور اسے جلد از جلد صحت مند دیکھنا چاہت[...]
یوں بھی اگر وہ دودھ پینے کا مشورہ نہ دیتا تو [...]
ضرور پیتی، وہ بچپن ہی سے سوتے وقت [...]
پینے کی عادی تھی۔

اس نے ایک گلاس میں دودھ لیا اور پھ[...]
اُٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دودھ ابھی [...]
اس نے اسے سرہانے کی میز پر رکھ دیا [...]
رات جاگنا چاہتی تھی کیونکہ اسے اجنبی کا ا[...]
مگر تھکن ابھی گئی نہیں تھی اس کا دل چاہ رہا [...]
بستر پر گر کر سو جائے اس نے خود کو مصروف [...]
کیلئے کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا اور پھر خود [...]
آہستہ بولنے لگی۔

"عادل صاحب! آپ کی مہربانیوں ک[...]
بہت شکریہ۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی آ[...]
جاگتی رہوں اور آپ سے ایک بار مل کر یہاں [...]
چلی جاؤں میں آپ جیسے محسن کو ناراض کر کے [...]
جانا چاہتی۔ میں آپ کے انتظار میں جاگنا [...]
ہوں لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں زیا[...]
جاگ نہیں سکوں گی اسی وجہ سے میں اپنی [...]
ریکارڈ کر رہی ہوں۔ میرا نام عالیہ ہے بس [...]

دینا کافی سمجھتی ہوں۔ اپنے ماں باپ کا نام بتا کر میں اپنے ماضی کی طرف لوٹنا نہیں چاہتی۔ ہاں آپ نے درست سمجھا ہے میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا لیکن میں ایسی بدنصیب ہوں کہ اس کی صورت نہیں دیکھی کیونکہ...... کیونکہ...... نہیں میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتی جو کہ مجھ پر گزر چکی ہے۔ میں اسے نہیں دہراؤں گی میں اتنی سی عمر میں اتنے دُکھ اُٹھا چکی ہوں کہ اب کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے خون کے رشتوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے، مجھے یہاں تک پہنچا کر مجھے آرام سے زندگی گزارنے کا موقع دیا ہے لیکن میں سوچتی ہوں کہ کس رشتے سے آپ کا احسان اٹھاؤں؟ ہم اجنبی ہیں بہتر ہیں کہ اجنبی بن کر رہیں میں نے اس گھر سے باہر جانے کی کوشش کی تھی لیکن کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے نہ جا سکی۔ کل تک طبیعت سنبھل گئی تو چلی جاؤں گی آپ بُرا نہ مانیں۔ میں یہ ریکارڈ دوسرے کمرے میں رکھ دوں گی اور سونے سے پہلے خواب گاہ کا دروازہ لاک کر دوں گی بس میں اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے ریکارڈ آف کر دیا۔ سوئچ بورڈ سے اس کا پلگ علیحدہ کر کے اسے اُٹھا لیا اور پھر دوسرے کمرے میں رکھ کر واپس آ گئی۔ خواب گاہ کے دروازے کو بند کر کے لاک کر دیا پھر بستر کے سرے پر بیٹھ کر دودھ کا گلاس اُٹھا کر پینے لگی۔ دودھ پینے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی پھر اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پہلے ہی وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ زیادہ جاگ نہیں سکے گی اسی لئے جب نیند کا غلبہ ہوا تو بستر پر اطمینان سے لیٹ گئی اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ اس نے اجنبی محسن کی گفتگو کے جواب میں اپنی آواز ریکارڈ کر دی

ہے اور جو کچھ وہ اپنے اور اس دنیا والوں کی
وفائی کے بارے میں سوچ رہی ہے وہ سب
اسے بتا دیا ہے اور اسے اپنی مجبوری بتا چکی
کیونکہ وہ اس کی پناہ سے نکل کر انجانی منزل
طرف جانا چاہتی ہے وہ مطمئن ہو کر سو گئی۔

دوسری صبح نو بجے اس کی آنکھ کھلی تو اسے
حیرانی ہوئی کہ وہ کس طرح اتنی گہری نیند
رہی ہے جب وہ لحاف ہٹا کر سامنے والے قد
آئینے کے سامنے آئی تو پھر شدید حیرانی کا
جھٹکا پہنچا۔ سامنے فرش پر وہ لباس پڑا ہوا تھا
پہن کر وہ سوئی تھی اور اس کے بدن پر بالکل
جدید فیشن کا لباس تھا وہ ایک دم لڑکھڑا کر بستر
سرے پر بیٹھ گئی اور آئینے میں اپنے آپ کو د
لگی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ا
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طلسم کدے
آ گئی ہے جاگتی ہے تو کچھ اور ہو جاتی ہے سوتی
تو کچھ اور ہوتی ہے پھر جاگتی ہے تو کچھ اور ہو
ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں
صوفے پر دور تک بہت سے لباس بکھرے ہو
تھے۔ عمدہ قیمتی لباس، شلوار کرتے، م
ساڑھیاں سبھی کچھ مختلف ہینگروں میں نظر آ
تھے وہ بوکھلائی بوکھلائی سی چاروں طرف دیکھ
تھی پھر اس کی نظر رکھے ہوئے کیسٹ ریکار
گئی اسے اس بات کی بھی حیرانی تھی کہ اس
کمرے کو اندر سے لاک کیا تھا پھر وہ اجنبی
کیسے چلا آیا؟ اور آنے کے بعد وہی گستاخی
اس کے بدن سے پرانا لباس اُتار کر نیا لباس
دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہر
ڈھانپ لیا اسے بڑی شرم آ رہی تھی۔ وہ د
ہاتھوں سے منہ چھپائے بستر پر گر پڑی۔

آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے چاروں ط

اندھیرا ہو گیا تھا ایسے اندھیرے میں تصور کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اس نے دیکھا کہ وہ گہری نیند میں ڈوبی پڑی ہے اور وہ اجنبی ہاتھ اس کے بدن سے لباس اُتار کر نیا پہنا رہے ہیں تصور کے پردے سے وہ منظر دیکھ دیکھ کر وہ پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اب کسی مرد کو قریب نہیں آنے دے گی۔ وہ بہت ضدی تھی ضرور ایسا کرتی مگر حالات ایسے تھے کہ اپنے قریب آنیوالے اس اجنبی کو وہ روک نہیں سکی اور وہ اتنا قریب آ گیا تھا، اتنا قریب آ گیا تھا کہ اس کے بعد عورت کا انکار کمزور پڑ جاتا ہے۔ اب وہ بند آنکھوں سے اسی اجنبی کو چھپ چھپ کر دیکھتی جا رہی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ اب رسمی طور پر ایک مرد سے نفرت کا اظہار کرنا فضول ہو گا جس نے تنہائی میں اسے دور دور تک دیکھ لیا تھا اب وہ اسی کے قریب رہے گی بشرطیکہ وہ ایسا ہی قابل اعتماد ہو جیسا اب تک نظر آ رہا ہے۔

سوچنے کے دوران اسے کیسٹ ریکارڈر کا خیال آیا وہ جلدی سے اُٹھ کر سوئچ بورڈ کے پاس گئی اور اس کا پلگ لگا کر اسے آن کیا جیسے ہی اس اجنبی کی آواز اُبھرنے لگی ویسے ہی وہ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اب تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے اسی آواز کے انتظار میں تھی خواہ مخواہ وہ اس ڈاکٹر کے قریب میں آ گئی تھی اس اجنبی کی آواز اسے کانوں سے لے کر دل تک گدگدا رہی تھی۔

''تمہارے بدن پر جو لباس ہے، وہ کیسا ہے ؟ میں ایک بار پھر اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں کیونکہ میں ذوق حسن رکھتا ہوں ایک انمول ہیرے کو چاندی کی انگوٹھی میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے تمہارے بدن کے نگینے کو صحیح لباس میں جڑ

دیا ہے۔ تم شائد میری اس حماقت کو نہ سمجھ سک
میرے ذوق کی تسکین ہو رہی ہے میں تمہیں ہ
کھلتے ہوئے رنگوں کے ہجوم میں دیکھنا چاہتا ہ
۔ اس لئے میں تمہارے پرانے لباس کو کل ر
فیتے سے ناپ کر گیا تھا تا کہ تمہارے لئے یہ
ملبوسات تیار کروا سکوں۔ ایک ہی دن میں ج
سکا وہ تمہارے لئے حاضر ہے میں نے ریکارڈ
تمہاری آواز سنی۔ تمہاری رس بھری آواز ایک
کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی یہ کہ تنہائی میں تمہا
مدہم مدہم سی سرگوشیاں کیسی جذبات انگیز ہ
ہیں لیکن تمہاری سریلی آواز نے یہ کہہ کر مجھے
پہنچایا ہے کہ تم یہاں سے جانا چاہتی ہو۔ کیا ا
انسان کو اس کے خلوص کا یہ یہ بدلہ دیا جاتا
میں نے تمہیں ناخن برابر نقصان بھی نہیں پ
اگر تمہیں اس وجہ سے تکلیف پہنچی ہو کہ میں
تمہارے لباس کو ہاتھ لگایا ہے تو میری التجا ہ
اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کر لو۔ میں
ریکارڈر میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا
تمہارا جواب یہ ہی ہونا چاہئے کہ تم مجھے چھو
نہیں جاؤ گی''۔

عالیہ نے ریکارڈر کو آف کر دیا تھوڑی دیر
اس کے سامنے سر جھکائے اس طرح شرماتی ر
جیسے اس کے سامنے ریکارڈر کی جگہ اجنبی بیٹھا
ایسا احساس کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ اجنبی کی آواز
بول رہا تھا اور اجنبی کی شخصیت کو اس کے ذ
میں اس طرح نقش کر رہا تھا کہ اب وہ اجنبی نہ
رہا تھا وہ اس کا اپنا عادل تھا۔ اس نے کیسٹ
دوبارہ سیٹ کر کے اپنا جواب ریکارڈ کیا اس
جواب دو لفظوں میں تھا۔

''نہیں جاؤں گی۔''

اس نے ریکارڈر کو آف کر دیا پھر اسے

جا کر اسی دوسرے کمرے میں رکھ دیا جہاں پچھلی رات رکھا تھا۔ اس کے بعد وہ سارا دن گنگناتی رہی اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا، خود کھایا اور عادل کیلئے بھی بچا رکھا۔ رات آئی تو حسب معمول دودھ پی کر سوگئی۔

دوسری صبح آنکھ کھلنے سے پہلے ذہن بیدار ہوا تو اپنے کانوں کے قریب خراٹوں کی آواز سنائی دی۔

بڑے ہی مردانہ قسم کے خراٹے تھے۔ سیدھے سینے میں آکر بج رہے تھے پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے سینے پر کسی اور کے دل کی دھڑکنیں بج رہی ہیں اس نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں دیکھا تو وہ اجنبی اس کے پہلو میں تھا بلکہ وہ اجنبی کے پہلو میں سو رہی تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ یہ اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ نیند کی حالت میں وہ دونوں شیر و شکر ہو گئے تھے۔ شیر و شکر کی آمیزش سے جو پیار کی شیرینی تیار ہوتی ہے وہ تیار ہو چکی تھی۔ اس نے فوراً ہی پھر سے آنکھیں بند کرلیں کہ یہ خواب ہے تو ٹوٹنے نہ پائے۔ بڑا سہانا خواب تھا سوتے میں وہی نظر آتا تھا، جاگنے میں بھی سانسوں کے قریب ہو جاتا تھا۔ ہر لڑکی ایسے ہی خواب کی آرزو کرتی ہے جو جاگنے پر بھی نہ ٹوٹے۔ وہ نہیں ٹوٹ رہا تھا مگر وہ اندر ہی اندر شرم سے سکڑتی اور سمٹتی جا رہی تھی کہ اجنبی آنکھ کھولے گا تو وہ اس کے سامنے کیا کرے گی؟ اسے یہ ہی بہتر صورت نظر آئی کہ چپ چاپ آنکھیں بند کئے پڑی رہے۔ وہ نیند سے بیدار ہو گا تو خود ہی اس سے الگ ہو کر بستر سے اُتر جائے گا باتھ روم کی طرف جائے گا تو یہ آنکھ کھول کر اُٹھ بیٹھے گی اسے یہ ہی تدبیر مناسب نظر آرہی تھی مگر سوچی ہوئی باتیں کب پوری ہوتی ہیں؟ ذرا دیر

بعد وہ نیند کی حالت میں کسمانے لگا اور کسما
کے دوران اپنے بازوؤں میں آئی ہوئی چیز کو
بھینچنے لگا جیسے خواب میں کسی کو گلے لگا رہا ہو
سچ مچ گلے لگ رہی تھی۔ اس کی سانسیں اُلجھ
تھیں اور اپنی مرضی سے جانا بھی نہیں چاہتی تھ
بڑی مشکل تھی ان بازوؤں میں مر جانے کو
چاہتا تھا پھر اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز
دی۔

''میری عالیہ! میں نے پہلی بار تمہیں د
ہی سمجھ لیا تھا کہ تم صرف میرے لئے سمندر
ساحل پر بھیجی گئی ہو۔ تمہیں کہیں نہیں جانے دو
۔وعدہ کرو کہ تم مجھے کبھی نہیں چھوڑ کر جاؤ گی۔''

عالیہ نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہو
کہا۔

''میں کیا کہوں؟ آپ تو نیند میں ڈو
ہوئے ہیں۔ خواب میں بول رہے ہو ورنہ
آپ کو بتا دیتی۔ بتانا بھی کیا تھا؟ آپ خود ہی
سکتے ہیں کہ مجھے قریب لانے کے لئے آپ
انداز اختیار کیا ہے اس کے بعد کوئی عورت
دوسرے کا تصور نہیں کر سکتی، میں آپ کی
آپ کی رہوں گی میرا اس دنیا میں کوئی نہیں
۔ میں آپ کو چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتی ہوں؟''
کہ آپ میری آواز سن سکتے اور اس طرح نیند
نہ بڑبڑاتے''۔

اسے اپنے کانوں کے قریب سرگوشی
دی۔

''میری جان میں نیند میں نہیں ہوں
میں ہوں۔''

اس نے ایک دم سے چونک کر سر اُٹھایا
بڑی بڑی آنکھیں اس پر جھکی ہوئی تھیں اس
جلدی سے سر کو جھکا لیا اور اس کے کشادہ سینے

منہ چھپانے لگی۔

☆......☆......☆

دو ماہ گزر گئے اس عرصے میں سارے حجاب اُٹھ گئے دو ماہ بعد عالیہ نے اس سے کہا۔

''آخر ہم کب تک اس طرح زندگی گزاریں گے ہمیں نکاح پڑھوالینا چاہئے''۔ عادل نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''میں بھی یہ ہی چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد قانونی اور مذہبی طور پر میری بیوی بن جاؤ لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ میری بیوی کو مرے ہوئے ابھی چھ ماہ گزر رہے ہیں''۔

''بیوی؟''

اس نے پہلے تو بیوی کا ذکر نہیں کیا تھا وہ عجیب قسم کا انسان تھا۔ اپنی باتیں اپنے ہی پیٹ میں رکھتا ہے کبھی ضرورت محسوس کرتا تو بتا دیتا ورنہ اسی سے اس کی باتیں اگلواتا رہتا تھا۔

اس دوران عالیہ نے اپنے اور اپنے والدین کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ کس طرح اس کے بچے کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بڑے بڑے راز بتا چکی تھی۔ ڈاکٹر سے کس طرح تعلقات ہوئے؟ کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ وہ بہت گہرا انسان تھا چہرے سے بھی پتا چلتا تھا کہ اندر سے بہت سخت ہے مگر اوپر سے مکھن جیسی ملائم باتیں کرتا تھا۔ اس روز بھی جب عالیہ نے نکاح پڑھوانے کی بات چھیڑی تو وہ شادی کی بات یہ کہہ کر ٹالنے لگا کہ اس کی پہلے بھی شادی ہو چکی تھی اور اس کی بیوی کو مرے ہوئے ابھی چھ ماہ گزر رہے ہیں۔ اتنی جلدی دوسری شادی کرے گا تو اس کے بچے برا مانیں گے تب یہ بات کھلی کہ اس کے بچے بھی ہیں یعنی دو لڑکے ہیں۔ ایک لڑکا

تقریباً بیس برس کا اور دوسرا سولہ سال کا
عالیہ شکایتیں کرنے لگی کہ اس نے پہلے یہ با
کیوں نہیں بتائیں۔ اس کی شکایت کے جوا
میں اس نے کہا۔

''اگر میں تمہیں یہ باتیں بتا دیتا تو کیا تم می
محبت سے انکار کر دیتیں؟''

عالیہ نے سر کو جھکا لیا۔ واقعی وہ بتا بھی د
کیسے انکار کر دیتی؟ وہ اس کی زندگی میں کچھ ا
انداز سے آیا تھا کہ وہ انکار کر ہی نہیں
تھی۔ اب اس کے دماغ سے ہلکی ہلکی سی د
چھٹنے لگی، وہ محسوس کرنے لگی کہ عادل نے اس
ایک عاشق کے انداز میں محبت نہیں کی بلکہ سا
کی ہے۔ اسے اپنی طرف مائل کرنے اسے حا
کرنے کیلئے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں اس
ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے باتیں کرتا رہا پھر
اس کی بے ہوشی کے دوران اور اس کی گہری
سونے کے دوران وہ لباس تبدیل کرنے کے
میں جس قدر قریب آ گیا تھا اس کے بعد تو وہ ا
کی محبت سے انکار ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا
گھبرانے لگا وہ محسوس کر رہی تھی کہ مکھی کی طر
مکڑی کے جال میں پھنس گئی ہے وہ اس
بازوؤں میں نہیں ہے کسی کے شکنجے میں ہے جو ا
کے اطراف آہستہ آہستہ سخت ہوتا ہوا اسے ا
اندر پیس کر رکھ دے گا۔ پھر وہ اپنے آپ کو تسلی
دینے لگی۔ اپنے آپ کو سمجھایا کہ گھبرانے کی
بات ہے؟۔ اس نے صرف جھوٹ کہا ہے
اپنی شادی اور بچوں کی بات چھپائی ہے۔ اس
دھوکہ تو نہیں دیا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے
چند ماہ انتظار کرنے کیلئے کہہ رہا ہے تو کیا فرق
ہے؟ دو ماہ تو اس کے ساتھ گزار چکی ہے چند
اور گزارے گی اس کے بعد وہ اسے دلہن بنا

اپنی حویلی میں لے جائیگا۔

ایک ویران سے پہاڑی علاقے میں اس کی حویلی تھی وہ شہر میں تفریحات کی غرض سے آتا تھا اسی مقصد کیلئے اس نے وہ چھوٹا سا مکان خرید رکھا تھا جہاں عالیہ ان دنوں اس کی تفریح کا باعث بنی ہوئی تھی اس نے عادل سے حویلی کے بارے میں کئی بار بہت سے سوالات کیئے کہ وہ ویران علاقے میں کیوں ہے؟ اور وہاں اس کے خاندان کے کتنے افراد رہتے ہیں وہ بے دلی سے جواب دیتا تھا۔ اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنی حویلی سے اور اپنے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔

اس مکان میں آنے کے چار ماہ بعد ایک دن عالیہ نے پریشان ہوکر کہا۔

''آپ مجھ سے فوراً نکاح پڑھوالیں میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں''۔

یہ بات سنتے ہی عادل کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اس نے عالیہ کو بازوؤں میں لے کر دیوانہ وار پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک بیٹا پیدا کروگی؟''

بڑا احمقانہ سوال تھا عالیہ چند لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہی اور پھر بولی۔

''میں کیسے بتاؤں کہ بیٹا ہی پیدا ہوگا؟''

''کیوں نہیں ہوگا۔ پہلے بھی تم نے ایک بیٹا پیدا کیا ہے اسی لئے تو میں نے تمہیں اپنایا ہے کہ تم میرے لئے بھی بیٹا پیدا کروگی۔''

''کیا مطلب؟'' عالیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیا تمہیں میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی؟ کیا تم صرف اس لئے میرے قریب آئے تھے کہ میں تمہارے لئے بیٹا پیدا کروں''؟

عالیہ کا موڈ بگڑتے دیکھ کر وہ جلدی بولا ''نن۔۔نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں تو تم چاہتا ہوں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں دیکھو نا، نسل چلانے کیلئے ہر شخص بیٹے کی آرزو ہے؟''

''مگر تمہارے تو پہلے ہی دو بیٹے موجود پھر یہ کیا ضروری ہے؟ کہ تم ایک بیٹے کی آ لے کر میرے پاس آؤ کیا وہ دونوں بیٹے تمہار آگے نہیں بڑھائیں گے؟''

وہ یک بیک جھنجھلا کر اسے اپنے بازو سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

''فضول بحث نہ کرو میں ایک بہت خوبصورت بیٹا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری آئندہ نسل کو تمہارا حسن اور بانکپن ملے بے حد حسین ہو اسی لئے میں تم سے ایک بیٹا ہوں۔''

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوگئی کہ وہ بیٹے کیلئے اس کے قریب آیا تھا لیکن اس سلسلے اس کے حسن و شباب کی بھی اہمیت ہے۔ وہ آ بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی بولی

''میں دعا کروں گی کہ بیٹا ہو مگر اب مجھ نکاح پڑھوالو''

''میں تمہیں اپنی مجبوریاں بتا چکا ہوں جلدی شادی کروں گا تو میرے دونوں جوان بُرا منائیں گے کہ ان کی ماں کے مرتے میں نے دوسری شادی کرلی ہے۔''

''مگر نکاح نہیں پڑھواؤ گے تو میرا بیٹا نا کہلائے گا''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس کی بات سے ہوکر بولا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم اپنے اس

بدنام نہیں ہونے دیں گے مگر میں کل صبح ہی کسی قاضی کو پکڑ لاؤں گا۔ گواہ کے طور پر میرے دو دوست ہوں گے پھر یہیں ہم دونوں میاں بیوی کے رشتے سے منسلک ہو جائیں گے۔"

دوسرے دن عادل نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ صبح ایک قاضی صاحب اور اس کے دو دوست آئے اور اسے عادل کی شریک حیات بنا کر چلے گئے۔ عادل نے نکاح نامے کی ایک کاپی اپنے پاس رکھ لی اور دوسری اسے دے دی۔

عالیہ نے بڑی حفاظت سے اسے اپنے پرس میں رکھ لیا کیونکہ اس کے ذریعے وہ ساری زندگی عادل کو اپنا قیدی بنا سکتی تھی۔ مرد کو اپنا پابند بنا لیا جائے تو وہ عورت کی خواہش کے مطابق ہی سوچتا ہے۔ سہاگ کی سیج پر عادل نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں حویلی میں لے جا کر رکھوں تا کہ تم میری ماں کی نظروں کے سامنے رہو اور بچے بھی رفتہ رفتہ تم سے مانوس ہو جائیں

وہ خوشی ہو کر بولی۔

"ہم کب یہاں سے چلیں گے۔"؟

"کل ہی جائیں گے لیکن وہاں ہم کسی کے سامنے اپنی شادی کا اعلان نہیں کریں گے۔"

عالیہ کا خوشی سے کھلا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔ کوئی عورت یہ برداشت نہیں کرتی کہ بیوی ہو کر بیوی کے رشتے سے پہچانی نہ جائے۔ اس نے اعتراض کیا

"میں آپ کی بیوی بن چکی ہوں پھر آپ والدہ اور بچوں کے سامنے اس رشتے سے کیوں انکار کریں گے؟"۔

"تم سمجھتی نہیں ہر بات اپنے وقت پر متاثر کرتی ہے جب وقت آئے گا تو ہم اس رشتے ظاہر کر دیں گے"

وہ جھنجھلا کر بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کس وقت کا انتظار ہے؟ ہم نے کوئی نہیں کیا ہے پھر اسے کیوں چھپایا جائے؟"۔

عادل کے تیور بدل گئے اس نے اسے آغوش سے دھکیل کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"میں عورت سے بحث کرنا پسند نہیں کرتا میری بیوی ہو۔ میں جو حکم دوں گا تمہیں اس پر کرنا ہوگا۔"

"میں بھی آپ کی بیوی ہوں میں بھی پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ آپ اس شادی کو کیوں چھپانا چاہتے ہیں؟"

"میں اس کا جواب یہی دوں گا کہ تمہیں مکان میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا تم تنہا یہاں در و دیوار سے اپنے حقوق منواتی رہنا۔"

وہ بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور دلبرداشتہ ہو اس کا منہ تکنے لگی۔ یہ وہی شخص تھا جو کل تک اس محبت کا دم بھرتا تھا اور اس کی ہر بات مانتا تھا مجازی خدا بن کر صرف اپنی بات منواتا چ تھا۔ عورت اپنے اندر اسی وقت تک کشش ر ہے جب تک وہ بیوی نہ بنے۔ بیوی بننے کے ایک عام استعمال کی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ ایک گہرا سانس لے کر حالات سے سمجھوتہ کر لگی کہ اب تو بیوی بن چکی ہے اب اس کی با نہیں مانے گی تو اس کی محبت اور توجہ کی محتاج بن رہ جائے گی۔ اس نے آگے کی طرف جھک کر کے کشادہ سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور اس کی با ماننے کیلئے اس کے سامنے جھک گئی۔

دوسرے دن عادل کے ساتھ کار میں بیٹھ شہر کے ہنگاموں سے دور اس پہاڑی علاقے

آ گئی۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی بلندی پر سرخ پتھروں سے بنی ہوئی پرانے طرز کی ایک بہت بڑی حویلی تھی جو اندر سے خوبصورتی سے آراستہ تھی۔ اس حویلی میں زیادہ افراد نہیں تھے صرف عادل کی ماں اور اس کے دو جوان بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام شہروز تھا وہ بیس برس کی عمر میں بھی پچیس برس کا گھبرو جوان لگتا تھا جبکہ عالیہ سترہ برس کی تھی اگر چہ وہ سترہ برس کی عمر میں دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی اس کے باوجود وہ کسی کل سے ایک مکمل عورت نہیں لگتی تھی۔ اس کے چہرے اور اسکے جسم پر دوشیزگی کا تمام نکھار موجود تھا۔ ایسی صورت میں وہ شہروز کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی سوتیلی ماں نظر نہیں آتی تھی۔ عادل نے اس کا تعارف اپنی سیکرٹری کی حیثیت سے کرایا تھا اور شہروز اس تعارف سے کچھ زیادہ خوش نہ ہوا تھا۔ وہ رسمی طور پر خوشی کا اظہار کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔

عالیہ نے پہلی ہی ملاقات میں محسوس کیا تھا کہ دونوں جوان بیٹے اپنے باپ سے ڈرتے ہیں اور اس کے سامنے زیادہ دیر تک کھڑے رہ کر بات نہیں کرتے۔ باپ کے خوف سے ہی شہروز نے عالیہ کو دیکھ کر رسمی طور پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ دوسرا بیٹا بابر عالیہ سے ایک سال چھوٹا تھا وہ تھوڑی دیر باتیں کرتا رہا پھر اس کی دادی یعنی عادل کی ماں اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ بڑھیا اب رشتے میں عالیہ کی ساس تھی۔ اس نے بڑی ناگواری سے عالیہ کو دیکھا پھر منہ بنا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عالیہ کو اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی۔ وہ اتنی بڑی حویلی میں ایک بڑے گھر کی بہو بن کر رہنے کا خواب دیکھتی آئی تھی اور یہاں آ کر اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔

اس حویلی کی اونچی اونچی دیوروں، دیو
دروازے اور بڑے بڑے کمرے سب اس
اجنبی بن گئے۔ ستم یہ کہ دوسرے دن عادل
کام کے بہانے سے اسے وہاں تنہا چھوڑ کر
گیا۔ وہ تمام دن ایک پر کٹے پرندے کی ط
حویلی میں اِدھر اُدھر پھڑ پھڑاتی رہی۔ وہ ح
بارہ کمروں پر مشتمل تھی۔ بڑھیا اپنے کمرے
باہر نہیں نکلتی تھی۔ دو کمرے دو بیٹوں کیلئے مخص
تھے۔ باقی تمام کمرے خالی پڑے ہوئے
اگر چہ ہر کمرے میں ضروریات زندگی کا
سامان موجود تھا مگر انہیں استعمال کرنے وال
نہیں تھا۔ وہاں عجیب سی ہولناک ویرانی تھی
کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ ایک ایسے کمرے
پہنچی جہاں مجرموں کو اذیتیں پہنچانے و
خوفناک اوزار رکھے ہوئے تھے۔ ایسے
اذیت رساں اوزار تھے کہ انہیں دیکھتے ہی ا
سانس حلق میں آ کر پھنسنے لگی۔ سارے بدن
کپکپی دوڑنے لگی۔ وہ وہاں سے بھاگتی ہوئی
کمرے میں آ گئی اور بستر پر گر کر رونے لگی جا
ابھی اسے کسی نے اذیت نہیں پہنچائی تھی مگر ا
دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ اسکی چھٹی حس کہ
تھی کہ وہ بہت ہی غلط جگہ آ گئی ہے۔ اس
میں خیال آیا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے
بھاگ کر کہاں جا سکتی تھی۔ جس نکاح نامے
نے بڑے فخر سے یہ سوچ کر اپنے پرس میں ر
کہ اس نے عادل کو ازدواجی رشتے میں
لیا ہے اب وہی نکاح نامہ اسے سمجھا رہا تھا
خود ساری زندگی کیلئے اس پراسرار حویلی
خانے میں آ گئی ہے اور نکاح کے نام پ
پیروں میں زنجیریں ڈال لی تھیں۔

وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہ اب اس

بچے کی ماں بننے والی تھی اور نکاح کے بعد وہ بچہ جائز ہو گیا تھا۔ اب کوئی اس کے بچے کو سمندر میں نہیں پھینک سکتا تھا۔ ایک بچے کا زخم کھا کر وہ دوسرے بچے کی حفاظت کیلئے وہاں رہنے پر مجبور تھی۔ تمام دن اسے کھانے کیلئے کسی نے نہیں پوچھا۔ رات آئی تو چھوٹا لڑکا بابر ایک کیروسین لیمپ لے کر اس کے کمرے میں آ گیا اور اس کے سرہانے رکھ کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد شہروز کھانے کی پلیٹیں لے کر آیا۔ اس نے پلیٹوں کو میز پر رکھتے ہوئے عالیہ کو دیکھا جو اسے دیکھتے ہی بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ شہروز چند لمحوں تک خاموشی سے اس کے سراپے کو گھورتا رہا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی اس نے انسانوں کو تو دیکھا تھا لیکن انسانی آوزوں کو نہیں سنا تھا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی بولنا نہیں جانتا تھا۔ سب قوت گویائی سے محروم تھے اتنی دیر بعد اس نے پہلی بار شہروز کی آواز سنی۔

''تمہارا نام عالیہ ہے نا؟''

''آں۔۔ ہاں!''

وہ جواب دیتی ہوئی یوں اندر سے لرزنے لگی جیسے اس کے سامنے ایک اجنبی نوجوان کھڑا ہو۔ عادل کے رشتے سے وہ کسی طرح بھی ایک بیٹا نظر نہیں آتا تھا کیونکہ وہ عادل سے بھی زیادہ قد آور تھا اور وہ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ عادل نے کہا۔

''تم اپنے نام کی طرح حسین ہو۔''

وہ ایک دم سے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس انداز میں میری تعریف نہ کرو میں تمہارے باپ کی سیکرٹری نہیں اس کی بیوی ہوں۔ اس رشتے سے تمہاری ماں ہوں لیکن وہ اس رشتے کا اظہار نہیں کر سکی۔ عادل نے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ وقت سے پہلے اس رشتے کا اظہار نہ کرے ورنہ پچھتائے گی وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

''شہروز تم اس انداز میں گفتگو نہ کرو۔''

''کیوں گلاب کو گلاب کہنا جرم ہے؟''

''نہیں؟ میں تمہارے باپ کی ۔۔'' وہ کہتے کہتے سنبھل گئی۔ پھر بات بدل کر بولی۔

''میں تمہارے باپ کی سیکرٹری ہوں''۔

''میں اپنے ڈیڈی کے حسن ذوق کو خوب سمجھتا ہوں۔ وہ اپنے لئے اکثر خوب صورت لڑکیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ تم سے پہلے بھی یہاں کئی خوبصورت لڑکیاں آ چکی ہیں مگر تمہارے جیسی حسین لڑکی میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے اور جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہیں ہی سوچ رہا ہوں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔''

وہ کس قدر گھبرائی ہوئی بولی۔

''محبت اچھی چیز ہے مگر جس انداز میں تم محبت کا اظہار کر رہے ہو وہ میرے لئے پریشانی کا باعث ہے تم میرا خیال دل سے نکال دو۔''

''کیسے نکال دوں؟ مجھے تم سے اتنی محبت ہے اتنی ہمدردی ہے کہ میں تمہیں ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، میں تمہیں کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

خطرے کی بات سنتے ہی عالیہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئی۔ چشم زدن میں نگاہوں کے سامنے اذیت رسانی کے تمام اوزار اِدھر اُدھر گھومنے لگے اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

''کیا خطرہ ہے؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہوں اس سے پہلے تمہارا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے اگر تم

ہی کے سر پر موت منڈلانے لگے گی۔''
عالیہ کے سینے میں سانسیں الجھنے لگیں۔ وہ گھبرا کر بولی۔
''میں تمہارے ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ جلدی کہو میرا دل گھبرا رہا ہے۔''
''میں تم سے بے انتہا محبت کرنے لگا ہوں اس لئے تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ ڈیڈی اب تک یہاں سیکرٹری کے نام پر تین عدد عورتوں کو لا چکے۔ سات برس کے عرصے میں تم چوتھی عورت ہو، عورت نہیں بلکہ ایک نادان لڑکی ہو۔ تم سے پہلے آنیوالیاں کچھ نہ کچھ تجربہ کار تھیں اس کے باوجود اس حویلی میں آ کر وہ غائب ہو گئیں۔ یہ میں نہیں جانتا، میرا خیال ہے کہ دادی اماں سب کچھ جانتی ہیں اور اپنے بیٹے کے جرائم کو اپنے سینے میں چھپا کر رکھتی ہیں۔''
عالیہ وحشت زدہ نظروں سے شہروز کا منہ تکنے لگی۔ وہ ان تین عورتوں کے متعلق سوچ رہی تھی جو یہاں آنے کے بعد نقش قدم چھوڑے بغیر پر اسرار طریقے سے غائب ہو گئی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر بولی
''دیکھو شہروز مجھے دہشت زدہ نہ کرو میں تمہاری بات پر کیسے یقین کروں؟''
''یقین نہیں کرو گی تو مجھے افسوس ہوگا۔ نہ جانے کیوں ڈیڈی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے پاس جو عورت آئے وہ ان کیلئے بیٹا پیدا کرے مگر ان میں سے ایک بانجھ نکلی اور دو نے لڑکیاں پیدا کیں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ان میں سے کوئی لڑکا پیدا کر دیتی تو شائد وہ ڈیڈی کی دوسری بیوی بن جاتی۔''

لگیں۔ عادل نے اس سے بھی یہ ہی کہا تھا
اس کیلئے لڑکا پیدا کرے کیونکہ اس کے دونوں
حسین نہیں ہیں وہ اپنی آئندہ نسل کو خوبصو
دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے سامنے کھڑا ش
خوبصورت نہیں تھا تو بدصورت بھی نہیں تھا۔
اچھا قبول صورت لڑکا تھا لیکن پتا نہیں عادل
طرح کی اسپیشل خوبصورتی چاہتا تھا۔ عالیہ کی
میں کچھ نہیں آ رہا تھا شہروز کہہ رہا تھا کہ
''ڈیڈی تمہیں سیکرٹری بنا کر یہاں لائے
ہوسکتا ہے کہ انہوں نے تم سے رومانس کی ابتد
دی ہو اگر ایسا ہے تو بچ کر رہو۔ میری باتوں پر
کرو اگر میری باتیں سمجھ میں آ جائیں تو میں تم
اس حویلی سے نکال کر لے جانے کی کوشش کر
گا اگرچہ میں بھی ڈیڈی کے حکم کے بغیر حویلی
باہر قدم نہیں نکال سکتا ہوں جب کبھی مجھے ش
طرف جانا ہوتا ہے تو وہ حویلی کے احاطے
شکاری کتوں کو ہٹا دیتے ہیں وہ کتے صرف ڈ
کو جانتے ہیں مگر میں چپکے چپکے اس کوشش
مصروف ہوں کہ وہ میری بو باس کو سمجھ لیں او
سے اس طرح مانوس ہو جائیں کہ کبھی ضرو
کے وقت یہاں سے نکلتے وقت وہ میرے
رکاوٹ نہ بنیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد
کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ ایسے وقت
تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا بس م
اتنی سی التجا ہے کہ تم مجھ پر اعتماد کرو اور ڈیڈ
قربت سے بچ کر رہو۔''
یہ کہہ کر وہ عالیہ کو سوچنے کیلئے چھوڑ کر چلا
اب سوچنے کیلئے کیا رہ گیا تھا۔ وہ عادل کے قر
جا کر اپنا سب کچھ ہار چکی تھی اور اب اس کے
کی ماں بننے والی تھی یا بیٹی کی ماں؟

وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ اس بار بھی ایک بیٹے کو جنم دے گی اگر بیٹی پیدا ہوئی تو۔۔۔؟

وہ خوف کی شدت سے کانپ گئی۔ عورت نکاح نامے سے نہیں صرف مرد کی خواہش پوری کر کے ہی اس کے سامنے اپنی اہمیت منوا سکتی ہے۔ اسے اپنے سہاگ کی سلامتی کیلئے اور خود اپنی سلامتی کیلئے ایک بیٹا پیدا کرنا تھا ورنہ اس پراسرار حویلی کی بھول بھلیوں میں ہمیشہ کیلئے نابود ہو جاتی۔

اس کے سامنے میز پر کھانا رکھا ہوا تھا وہ صبح سے بھوکی تھی مگر اب کھانے کو ہاتھ لگانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بھوک مر چکی تھی اور دہشت پیدا کرنے والی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایسے میں کھانا پینا، سونا، بیٹھنا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ بڑی پریشانی سے سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ کیا شہروز کی بات کا یقین کر کے اس کے ساتھ فرار ہو جانا چاہئے؟۔

اس کے چشم تصور میں شہروز اور عادل آ کر کھڑے ہو گئے وہ کبھی عادل کو اور کبھی شہروز کو دیکھنے لگی کہ کس پر بھروسہ کرے۔ عادل کو وہ آزما چکی تھی وہ بعض اوقات بعض حالات میں اس حد تک پراسرار نظر آتا تھا کہ وہ اس سے بُری طرح خوف زدہ ہو جاتی تھی اب بھی اس کی یہ ہی حالت تھی۔ عادل کی پراسراریت نے اسے بہت سے وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں شہروز جیسا اجنبی نوجوان اسے مہربان اور ہمدرد نظر آ رہا تھا لیکن عورت جس مرد کے ساتھ تنہائی کے لمحات گزارتی ہے ان لمحات کی ایک ایک محبت اسے یاد آتی ہے۔ اپنا محبوب ہو یا اپنا شوہر ہو اسے دشمن سمجھنے کو دل نہیں چاہتا۔ گزری ہوئی محبت کی ادائیں اسے اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتی ہیں کہ وہ باوفا ہے۔ عادل کے خلاف کچھ سننے کے بعد بھی وہ اسے اپنا دشمن نہیں سمجھ ر تھی۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ اسکے ہونیوال بیٹے کا باپ کسی موقع پر اس کی جان کا دشمن بن ہے۔ پھر وہی بیٹا اگر نہ ہوا تو؟ اب وہ ہونیوالا اس کے دماغ میں چبھ رہا تھا اس کی محبت کا، ا کے سہاگ کا اور اس کی زندگی کا انحصار صرف ا بیٹے پر تھا نہ ہوگا تو وہ بھی نہ رہے گی پھر وہی اذ پہنچانے والے اوزار اس کی نگاہوں کے سا گھومنے لگے اور اس کے آس پاس آہنی آواز سے بجنے لگے۔ اس کے دماغ میں یہ سو کلبلانے لگا کہ عادل میاں بیوی کے رشتے کیوں چھپا رہا ہے؟ کیا اس لئے چھپا رہا ہے اسے بچے کا انتظار ہے؟ ہاں اس نے کہا تھا اسے وقت کا انتظار ہے وہ وقت آنے پر شاد اعلان کرنا چاہتا ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک بے چینی سے ٹہلتی رہی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے کسے اپنا سمجھنا چاہئے جسے اپنا سمجھتی آ رہی تھی بڑی حد تک جان کا دشمن نظر آ رہا تھا ایسے و شہروز ہی ایک ہلکی سی روشنی کی کرن نظر آ رہا تھا اس کے مشورے پر عمل کرے گی یا نہیں کر گی؟ ابھی اس نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا مگر اس کچھ دیر باتیں کر کے اس ہولناک تنہائی سے چاہتی تھی جو اسے ڈراتی اور رُلاتی جا رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر شہروز کے کمر کی طرف جانے لگی۔ مختلف راہداریوں گزرنے کے بعد جب وہ وہاں پہنچی تو شہروز و موجود نہیں تھا وہ اسے حویلی کے مختلف حصوں تلاش کرنے لگی۔ ہر طرف ایسا پراسرار سناٹا ہوا تھا جیسے وہاں کسی انسان کا وجود نہ ہوا تھا

حویلی میں قید ہوکر وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی اس کے ہاتھ میں کیروسین آئل کا ایک لیمپ تھا جو اس کے سائے کو اس کے پیچھے دور راہداریوں تک پھیلا رہا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو اپنے ہی سائے کو دیکھ کر سہم جاتی۔ وہ بھٹکتی ہوئی حویلی کے آخری حصے میں آگئی۔ دن کے وقت وہ اس طرف نہیں آئی تھی کمرے کا بند دروازہ دیکھ کر اس نے ہولے سے شہروز کو آواز دی مگر اسے جواب نہیں ملا۔ وہ پلٹ کر جانے لگی تو چند قدم جا کر ٹھٹک گئی۔ کسی کی درد بھری کراہ سنائی دے رہی تھی۔ وہ پھر پلٹ گئی اور وحشت زدہ نظروں سے اس کمرے کو دیکھنے لگی وہ آواز ٹھہر ٹھہر کر اسی کمرے سے آرہی تھی۔

وہ تھر تھر کانپنے لگی اسے اس بھیانک ماحول میں یوں لگ رہا تھا جیسے قبرستان کے سناٹے میں کوئی مردہ کراہ رہا ہو۔ مردہ بول نہیں سکتا، کراہے گا کیا؟ لیکن وہ آواز مردہ کی سی تھی وہ کوئی مرد تھا جو سخت اذیت میں مبتلا تھا اور اس کی آواز ایسے گھٹ گھٹ کر خاموشی میں اُبھر رہی تھی جیسے اس میں کراہنے کی بھی سکت نہ رہی ہو۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کمرے کے دروازے تک جاسکتی۔ وہ پلٹ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے اس کمرے کے سامنے رُک گئی جہاں اذیت رسانی کے اوزار چاروں طرف دیوار پر سجے ہوئے تھے۔ وہ اس کمرے میں ایک نظر ڈالنے کیلئے رُکی تھی اور دروازے پر کھڑی ہوئی تھی اس کمرے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا عین نگاہوں کے سامنے دیوار پر جو آہنی شکنجہ لٹک رہا تھا اسے دیکھتے ہی اس کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ وہ ایسا شکنجہ تھا جو کسی مجرم کے گلے میں ڈالا جاتا ہے پھر ایک جھٹکے سے اس کی ہینڈل کو دباتے ہی گردن تن سے [illegible] ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس آہنی شکنجے پر [illegible] انسانی لہو کے دھبے نظر آرہے تھے۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس آہنی شکنجے کو [illegible] رہی تھی۔ مارے دہشت کے اس کے گھٹنے کا[illegible] رہے تھے۔ اس میں کھڑے ہونے کی بھی [illegible] نہیں رہی تھی مگر اس نے بڑی مشکل سے ا[illegible] آپ کو سنبھالا دیوار کا سہارا لے کر اپنے وج[illegible] گھسیٹتی ہوئی کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے [illegible] دروازے تک پہنچی۔ وہاں دروازے پر شہروز [illegible] ہوا تھا۔ ایک سہارے کو سامنے دیکھتے ہی وہ [illegible] کرگرنے لگی۔ شہروز نے فوراً ہی آگے بڑھ کر [illegible] ہاتھ سے اسے اور دوسرے ہاتھ سے لیمپ کو [illegible] لیا۔ وہ بہت دیر اس کے بازو میں کھڑی ک[illegible] رہی پھر اس کے سہارے ڈگمگاتے قدموں [illegible] چلتی ہوئی بستر پر آکر گر پڑی۔ شہروز نے پوچھ[illegible]

"تم اس ویران حویلی میں بھٹکنے کیوں [illegible] تھی" وہ اپنے بازو میں منہ چھپا کر روتی [illegible] بولی۔

"مجھے یہاں ڈر لگ رہا تھا میں نے [illegible] تمہارے پاس جا کر باتیں کروں گی تو خوف [illegible] حد تک کم ہو جائے گا مگر یہاں قدم قدم پر بلا[illegible] نظر آتی ہیں۔ میں نے یہاں کسی کے کراہ[illegible] آواز سنی ہے، کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کمرے [illegible] کون ہے؟"

شہروز سر جھکا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور آ[illegible] آہستہ کہنے لگا۔

"میں نے اس کمرے کو کبھی اندر سے [illegible] دیکھا۔ اس کے دروازے پر ہمیشہ تالا پڑا رہ[illegible] ۔ رات کی خاموشی میں کبھی کسی کے کراہنے کی [illegible] آتی ہے تو دروازے پر تالا نظر نہیں آتا۔ و[illegible]

سے بند ہوتا ہے"۔

عالیہ نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس وقت بھی دروازے پر تالا نہیں تھا وہ اندر سے بند ہوگا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں دروازے تک جا سکوں۔ تم نے یہاں بچپن گزارہ ہے اور اب جوان ہو چکے ہو، تعجب ہے کہ تم اس آخری کمرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو؟"

"وہ آخری کمرہ پچھلے ایک سال سے پراسرار بنا ہوا ہے۔ ایک سال پہلے میری امی۔۔۔۔ ان تینوں عورتوں کی طرح پراسرار طریقے سے غائب ہو گئی تھیں۔ ڈیڈی الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہیں۔ ایک بیٹا اپنی ماں پر ایسا شرمناک الزام برداشت نہیں کر سکتا، مجھے ڈیڈی سے نفرت ہے۔"

"تو پھر تمہاری امی کہاں ہیں؟ کیا تم نے انہیں تلاش نہیں کیا۔"

"کہاں تلاش کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یا تو ڈیڈی کے ظلم سے تنگ آ کر واقعی ہی چلی گئی ہیں یا پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ڈیڈی میری امی کے قاتل ہیں۔"

عالیہ اس کی باتیں سن رہی تھی اور اس کا منہ تک رہی تھی۔ قتل کا ذکر آیا تو وہ خون آلودہ شکنجہ سامنے آ گیا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی میں نے اس کمرے میں آہنی شکنجہ دیکھا ہے جس پر تازہ خون کے دھبے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" شہروز نے حیرانی سے پوچھا "کیا تم نے ابھی دیکھا ہے"؟

"ہاں میں ابھی اسی کمرے کے آگے سے گزر کر آ رہی ہوں"۔

"میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں مگر مجھے

یہاں سے یہ لیمپ لے کر چلنا ہوگا کیا تم میر ساتھ چلو گی؟"

"ہاں میں اندھیرے میں نہیں رہ سک تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

شہروز نے لیمپ اُٹھایا، عالیہ اس کے س چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ جب وہ راہداری سے گزر کر دوسری راہداری کی ط مڑے تو اس کمرے کے قریب پہنچتے ہی گئے۔ عادل اس کمرے سے باہر آ رہا تھ دونوں کو دیکھ کر اس نے غرا کر پوچھا۔

"تم یہاں شہروز کے ساتھ کیا کر رہی ہو

وہ عادل کو دیکھ کر ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"آ۔۔آپ کب آئے؟ کیا آپ کو تنہائی کا ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ اتنی بڑی میں مجھے کتنا ڈر لگ رہا ہوگا۔"

عادل نے آگے بڑھ کر شہروز کے ہاتھ لیمپ چھین لیا، پھر وہ عالیہ کے بازو کو مضبوطی پکڑ کر بولا۔

"اچھا تو تم اس چھوکرے کے ساتھ دور کر رہی تھی چلو یہاں سے۔۔۔"

وہ اسے بازوؤں سے کھینچتے ہوئے کم میں لایا پھر اسے پلنگ پر دھکیلتے ہوئے بولا۔

"تم اتنی رات کو شہروز کے ساتھ کیا کر تھی؟"

وہ جھنجھلا کر بولی۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے ڈر لگ رہا تھا رشتے میں میرا بیٹا ہے، کیا میں اس کے س باتیں نہیں کر سکتی؟"

"بیٹے کی ایسی کی تیسی۔ میں اس کا س دوں گا اور اگر آئندہ تمہیں بھی اس کے ساتھ د تو تمہیں بھی زندہ دفن کر دوں گا جب تک تم

بیٹا نہیں پیدا کردی اس وقت تک میں تم پر کسی مرد کا سایہ نہیں پڑنے دوں گا خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو"۔

یہ کہہ کر وہ جواب سنے بغیر کمرے سے باہر آ گیا اور کمرے کو باہر سے بند کر دیا۔ عالیہ دروازے پر تالا ڈالنے کی کھڑکھڑاہٹ سنتی رہی۔

☆......☆......☆

عالیہ نے اس حویلی میں ایک ہفتہ گزار دیا۔ اس ایک ہفتے میں وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں قید رہی۔ دن کے وقت وہ کمرے سے نکلتی اور اس وسیع و عریض حویلی میں ایک بھٹکنے والی روح کی طرح گھومتی رہتی تھی۔ وہ اپنی ساس سے کچھ باتیں کرتی تو اس کی طرف سے کبھی جواب ملتا ورنہ بڑھیا بھی اس سے کترا کر نکل جاتی تھی۔ شہروز سے صرف دن کے وقت ملنا ہوتا تھا عادل کی عدم موجودگی میں اس سے کچھ باتیں کرنے کا موقع مل جاتا ورنہ عادل نے سختی سے تاکید کی تھی کہ رات کے وقت وہ اپنے کمرے کو اندر سے بند رکھے اور شہروز سے نہ ملے ورنہ بُرا ہوگا۔

اس ایک ہفتے میں ایک اور بات سامنے آئی وہ یہ کہ عادل کا چھوٹا لڑکا لاپتہ ہو گیا تھا اس کی گمشدگی سے صرف شہروز پریشان تھا۔ عالیہ نے عادل سے پوچھا۔

"آپ کا چھوٹا بیٹا نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ کہاں چلا گیا؟"

"جہنم میں چلا گیا ہے۔ سب سالے دھوکہ باز ہیں جس روز تم یہاں آئی تھی اس روز اس نے مجھ سے باہر جانے کی اجازت مانگی تھی میں نے اس سے کہا کہ رات کو تمہارے کمرے میں لیمپ اور کھانا پہنچانے کے بعد وہ چلا جائے میں حویلی کے کمپاؤنڈ سے کتوں کو ہٹا دوں گا۔"

"ہاں اس رات وہ میرے کمرے میں ل
رکھنے آیا تھا اس کے بعد میں نے اسے نہیں د
تھا۔"

عادل نے ناگواری سے کہا۔

"میں نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ اسی ط
ایک سال پہلے اس کی ماں مجھ سے اجازت
گئی تھی کہ کسی سہیلی سے ملنے جا رہی ہوں و
اس حویلی سے باہر جا کر دغا دے گئی پھر لوٹ
نہیں آئی۔"

عالیہ نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے د
ہوئے پوچھا۔

"آپ نے تو کہا تھا آپ کی بیوی مر چکی
۔"

"ہاں جو عورت اپنے شوہر کو دھوکہ دے
چلی جائے وہ مر ہی جاتی ہے، میں نے غلط نہیں
تھا وہ میرے لئے مر ہی چکی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بھی اسے تنہا کمرے میں چھوڑ کر
گیا۔ عالیہ سمجھتی تھی کہ وہ اس کے سوال و جو
سے گھبراتا ہے اور بحث کو آگے بڑھانے
گھبراتا ہے اس نے آخری کمرے کے بار
میں بھی اس سے سوال کیا تھا اسے جواب ملا۔

"وہ کمرہ آسیب زدہ ہے تم وہاں نہ جایا
میں اسی لئے اسے باہر سے بند رکھتا ہوں۔"

"مگر ایک رات میں نے دیکھا وہ اندر
بند تھا اور اندر سے کوئی بڑی ہی دردناک آواز
کراہ رہا تھا" عالیہ نے پوچھا۔

"تم بحث کیوں کرتی ہو اس کمرے میں
کراہنے والی بلائیں ہیں ان سے تمہاری
داری تو نہیں ہے؟"

بس وہ اسی طرح کا جھنجھلا کر جواب دی
اور منہ پھیر کر چلا جاتا تھا۔

ایک دن شہروز نے اس سے پریشانی کا اظہار کیا
''میری امی کی طرح میرا چھوٹا بھائی بھی غائب ہو گیا۔ وہ پتا ہے کب سے غائب ہوا ہے؟''
''ہاں جس دن میں یہاں آئی تھی اسی رات سے وہ لاپتا ہے''۔
''اور اسی رات تم نے اس آہنی شکنجے میں خون کے دھبے دیکھے ہیں''۔ عالیہ کا دل دھک سے رہ گیا وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سہمی ہوئی نظروں سے شہروز کو دیکھنے لگی۔
''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''
''یہی کہ اس آہنی شکنجے پر میرے بھائی کے خون کے دھبے تھے اور اسے ڈیڈی نے ------''
''نہیں۔''
وہ ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی بولی۔
''کوئی باپ اپنے بیٹے کی جان نہیں لے سکتا، تم جھوٹے ہو۔ تم اپنے ڈیڈی سے نفرت کرتے ہو اور مجھے بھی اپنی ڈیڈی سے نفرت دلانا چاہتے ہو۔''
''بے شک میں ان سے نفرت کرتا ہوں مگر تمہاری محبت کی قسم وہ بہت سنگدل ہیں۔''
''میری محبت کی قسم نہ کھاؤ۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی''۔
''میں تو کرتا ہوں جب تمہیں میری سچائی کا یقین آئے گا اور جب تم ڈیڈی کا اصلی چہرہ دیکھو گی تو ان سے نفرت اور مجھ سے محبت کرنے لگو گی۔''
وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کہنے لگی۔
''کوئی عورت اپنے مجازی خدا سے نفرت



کڑا ہے وقت مجھ کو چھوڑ جا
مرے ہم رخت مجھ کو چھوڑ جا

ارے او ہجر بیڑا غرق تی
اَبے کم بخت مجھ کو چھوڑ جا

بُجھا ہے اب چراغِ شب، عزی
سفر ہے سخت مجھ کو چھوڑ جا

کہیں پانی نہیں ملنے کا ہم
مرے ہم دشت مجھ کو چھوڑ جا

ارے میثم یہ مُڑ مُڑ دیکھنا ک
چلو یک لخت مجھ کو چھوڑ جا

علی رضا

نہیں کرتی، خواہ وہ کتنا ہی سنگدل ہو وہ جیسے بھی ہیں میرے جسم و جان کے مالک ہیں۔"

شہروز حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ عالیہ کو بھی احساس ہو گیا کہ اس نے میاں بیوی کا رشتہ ظاہر کر دیا ہے۔ شہروز دلبرداشتہ ہو کر بولا۔

"اچھا تو ڈیڈی سے شادی کر چکی ہو۔ اپنی موت کے پروانے پر خود ہی دستخط کر چکی ہو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر اس کے سامنے سے چلا گیا۔ اس کے بعد جب بھی اس حویلی میں سامنا ہوتا تو وہ ہمیشہ کترا کر نکل جاتا مگر دور دور سے اسے دیکھتا رہتا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی محبت کو ہار کر اپنی اس شکست کو جبراً برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شکست بھی ایسی زبردست ہوئی تھی کہ وہ محبوبہ کی بجائے اس کی سوتیلی ماں بن گئی تھی۔ عالیہ اسے دیکھتی تو اس پر بڑا ترس آتا مگر وہ ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی بس اسی طرح دور ہی رہے تو اچھا ہے۔

دو ماہ اس نے حویلی میں کیسے گزارے یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ ایک دن اس نے گھبرا کر عادل سے کہا۔

"اس حویلی میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے یہاں سے باہر لے چلو۔ تمہیں ایک بیٹے کی ضرورت ہے اگر میں ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں رہوں گی تو شائد ایک صحتمند بچے کی ماں نہ بن سکوں۔"

عادل اسے اپنے ساتھ حویلی سے باہر لے آیا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف جانے لگے۔ پہاڑی راستوں کے نشیب و فراز سے گزرتے وقت عالیہ نے کہا۔

"آپ کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں۔ آپ صرف ایک بیٹے کی آرزو میں مجھے بردا کر رہے ہیں۔"

"ہاں۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہو مجھے ایک خوبصورت بیٹا چاہئے، بیٹا پیدا کر تمام عمر میرے دل پر حکومت کرتی رہو گی۔"

"اگر بیٹا پیدا نہ ہوا تو؟"

"بکواس مت کرو۔"

اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"بیٹا ضرور ہو گا۔ جب تم ایک ناجائز بیٹ کر سکتی ہو تو جائز کیوں نہیں پیدا کر سکتی؟"

وہ بھی چڑ کر بولی۔

"کوئی ضروری تو نہیں کہ ہر بار بیٹا ہی پ۔ آپ کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں؟ کیا بیٹا پیدا کرنا عورت کے اختیار میں ہوتا ہے؟"

"اگر یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے تو زندگی تم سے محبت کرنا بھی میرے اختیار میں ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی تین عورتوں سے ایک بیٹے کیلئے اسی طرح محب چکے ہیں۔ مجھے ابھی بتا دیجئے کہ میرا انجا ہوگا؟ میں آپ کا رویہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

"کس نے تم سے کہا؟ کہ میں تین عو سے محبت کر چکا ہوں۔"

"یہ ضروری تو نہیں ہے کہ کوئی آ کر بتائے میں اس حویلی میں رہتی ہوں کیا وہاں حالات کا علم مجھے نہیں ہوگا؟"

"میں سب سمجھتا ہوں، شہروز نے میرے خلاف بھڑکایا ہے میں اس کی گرد دوں گا۔"

"کیا اس آہنی شکنجے سے؟"

"بکواس مت کرو۔" وہ چیخ اُٹھا۔

چیختے اس کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ بہک گیا۔ کار سڑک سے اُتر کر بالکل بے قابو ہو کر ایک چھوٹے ٹیلے سے ٹکرا گئی۔ عالیہ کو اتنا ہی ہوش رہا کہ اس نے ایک دھماکے کی آواز سنی۔ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا پھر وہ تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ حویلی کے اس کمرے میں اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اس کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کی بوڑھی ساس بستر کے سرے پر بیٹھی اس کی نبض دیکھ رہی تھی۔ عالیہ کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ اس سے دور ہٹ گئی اور مرہم پٹی کا سامان فرسٹ ایڈ بکس میں رکھنے لگی پھر اس نے وہ بکس اُٹھا کر جاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے سرہانے دودھ اور پھل وغیرہ رکھے ہوئے ہیں اسے کھالو بیماروں کی طرح زیادہ نخرے نہ دکھاؤ۔"

بڑھیا کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک چپ چاپ پڑی رہی۔ پچھلے تمام واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ وہ کتنے دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ زندگی میں ایک دھوکہ کھانے کے بعد اب اسے ایسی ٹھوکریں ملتی جارہی تھیں کہ وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ اس حویلی کو اپنا گھر بنانا چاہا تو یہ بھی اس کا مقبرہ بن رہی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر روتی رہی بہت دیر بعد وہ بستر سے اُٹھی اور گلاس اُٹھا کر دودھ پینے لگی۔

عادل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ جب عادل آیا تو وہ اس کو کھینچ کر اس کمرے میں لے گیا جہاں اس نے آہنی شکنجہ لٹکا دیکھا تھا۔ عادل نے اسے رسی سے باندھ دیا اور مارتے ہوئے بولا کہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کیونکہ اس کا حمل ضائع ہو گیا ہے اس لئے اب اس کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

دوسری طرف شہروز جب اس آخری کمر
میں داخل ہوا تو وہاں ایک بوڑھا کمزور
موجود تھا۔ جس نے شہروز کو بتایا کہ وہ اس کی
سے محبت کرتا تھا۔ شہروز اور اس کا چھوٹا بھائی
کی اولاد ہیں۔ جب عادل کو پتا چلا تو اس
تمہاری ماں کو میرے سامنے یہاں قتل کر دیا۔
نے تمہارے چھوٹے بھائی کو بھی مار دیا ہے۔ ش
اس بوڑھے کو لے کر کمرے سے نکلا تو اسے
کی چیخ سنائی دی۔

وہ آہنی شکنجے والے کمرے کی طرف دو
عالیہ نے صرف شہروز کو کمرے میں داخل ہو
دیکھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے
پر تھی۔ شہروز اس کی آنکھ کھلتے ہی اس کی طر
بڑھا اور بولا۔

"عادل اور اس کی ماں اب پولیس کی تح
میں ہیں۔"

"ہوں"۔

"اب جب ثابت ہو گیا ہے کہ تم میری
نہیں ہو تو اب تو میں تم سے شادی کر سکتا ہوں

"میں نے محبوب سے دھوکہ کھایا۔ شوہر
دھوکہ کھایا لیکن ایک بیٹے نے ہمیشہ میرا ساتھ
دیکھو، میرے بیٹے بن کر رہو۔ آؤ اور میری پی
چوم لو۔"

شہروز کچھ گھبرایا اور پھر کچھ سوچتے ہو
عالیہ کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ ایک دم اس کا دل
گیا۔ عالیہ کی پیشانی برف کی طرح سرد تھی۔
چکی تھی اور یہی انجام ہونا اُس ناعاقبت اندی
کا جس نے اتنی کم عمری میں دنیا کے سار
فریب دیکھ لیے تھے۔

☆☆......☆☆

انسانی حقوق کی پاسدار

گلنار آفرین

شاعرہ وادیبہ

شگفتہ شفیق

ریاست ٹونک (ہندوستان) کی سرزمین علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے...... ہماری آج کی مہمان شخصیت شاعرہ وادیبہ گلنار آفرین نے ۱۵ اگس
۱۹۴۷ میں نواب متین اللہ خان صاحب المعرو



کستان ملک واپس کے ہاں جنم لیا صاحبزادی مختار النسا' کہلائیں گلنار آفرین کی شادی بہت کم عمری میں ناصر حسین زیدی سے ہوئی جنھوں نے قدم

سان کام نہیں وہ اس خوبی سے لکھی ہیں بھی زبان و بیان میں جھول نہیں آتا بلکہ مجم اور زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے



قدم پر ان کو گائیڈ کیا اور حوصلہ اعتماد و پیار کے ساتھ آگے بڑھنے میں بھرپور معاونت کی۔ ناصر حسین زیدی کے ساتھ گلنار آفرین نے تقریبا ساری دنیا کی سیر کی اور ملکوں ملکوں مشاعرے پڑھے ہیں جہاں ان کی بے حد پزیرائی کی گئی اور مختلف ایوارڈز و انعامات سے نوازا گیا۔ اسی طرح انھوں نے نثری ادب میں اپنے افسانوں کے ذریعے شاندار اضافہ کیا ہے گلنار آفرین کی شاعری کی ۴ کتب اور افسانوں کی ۲ شاندار کتابیں ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

گلنار کی بہترین شاعری اور شاندار افسانہ نگاری کا یہ ایسا دلنشیں تال میل ہے جو کہ اور لوگوں میں خال خال ہی ملتا ہے کہ اس طرح لکھنا کوئی آ

جرس گل، شہر آشوب، تیشۂ غم، شام ستارہ (شعری مجموعے) اور پلک پلک کمٹی ر پھول اور وہ، جیسے خوبصورت افسانوی مجموع خالق گلنار آفرین کا نام کسی بھی ادب نواز ک نیا نہیں۔ یہ ستارہ بہت دہائیوں سے بڑی آ ب سے اردو ادب کے افق پر جگمگا رہا ہے فرین بتاتی ہیں کہ گھر کا ماحول بے حد ادبی تھ اور بڑے بھائی بھی شعر و ادب سے گہری د کہتے تھے اور بہترین شعرا' میں شمار ہوتے گلنار آفرین ایسے ادب پرور ماحول میں حسین پھول کی طرح کھلیں اور اپنی پہلی ہی پہلے افسانے پر ۱۹۶۶ میں انعام حاصل کیا شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی

م وغزل پسندیدہ ہیں ان کی شاعری ہو یا افسا
نہ نگاری، اس میں مقصدیت نمایاں رہتی ہے
ان کی نظموں میں جہاں کہیں رومانی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جس میں ہجر وفراق اور معصوم جذباتیت نمایاں ہو دہیں وہ ایک قومی شاعرہ کے روپ میں سامنے آتی ہیں اور جب وہ یہ کراچی تیرہ خاک۔ سوال۔ میری آواز سنو۔ وغیرہ لکھتی ہیں تو لگتا ہے ان میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ د یا ہو اور لاکھوں دلوں کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہیں ان کی ایک نظم میری بہت پسندیدہ۔ امن کی با ت کرو۔ کے چند مصرعے آپ کے ذوق سلیم کی نذر

مصلحت کیش سیاست کی حمایت کب تک
مکر سے پاک سیاست کی کوئی بات کرو
امن کی پیار کی چاہت کی کوئی بات کرو
ہم پہ الزام بغاوت کا لگانے والو
بے وفا کون ہے اجداد سے پوچھا ہوتا
کتنے جاں باز سپوتوں نے دیا اپنا لہو
وطن پاک کی بنیاد سے پوچھا ہوتا

☆......☆......☆

اعتراف

تسلی خود کو میں یوں دے رہی ہوں
بھلا کر موسموں کی تلخیوں کو
نئی رت کی کہانی لکھ رہی ہوں
میں اس کو چاہتی ہوں
یقیں اس کو دلانا چاہتی ہوں
ہر اک لمحہ میں اپنی زندگی کا
اب اس کے نام کرنا چاہتی ہوں

☆......☆......☆

جمہور کا پرچم تو لہو رنگ ہوا ہے

[illegible]
دریا میں تلاطم ہے تو موجوں سے لڑو تم
جینے کا یہ انداز سکھا کیوں نہیں دیتے
لفظوں میں نہ ڈھالو گے تو مر جائے گا احساس
بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا کیوں نہیں دیتے

اب ذرا گلنار آفریں کی ایک غزل کے ان خوبصورت اشعار کو دیکھیں

ہر رات میں اک شمع جلاتی سر جاد
گمنام مسافر میرا مہمان تو ہو
پاؤں میں بھنور باندھ کے موجوں سے الجھتی
کشتی کے مقابل کوئی طوفان تو ہو

☆......☆......☆

کیا روح کی گہرائی میں تم جھانک رہے ہو
اب راز محبت کے چھپائے نہیں جاتے
جن راہ گذاروں پر ترے نقش قدم ہیں
وہ نقش قدم ہم سے مٹائے نہیں جاتے

☆......☆......☆

خواہش تھی سر بزم بلایا ہو
نام آیا تھا لبوں پر تو پکارا ہو

☆......☆......☆

اتنی سی بات پر کئی الزام آگئے
وہ شہر جاں میں آئے اور آکر چلے گئے

☆......☆......☆

قصہ مختصر یہ کہ گلنار آفریں حقیقت پسند شاعرہ ادیبہ ہیں وہ اپنی تخلیقات میں اپنی ذہنی انفرادیت کے رنگ بھرتی ہیں اور اس عہد کی بے مثال شاعرہ وادیبہ ہیں جنھوں نے اپنے خون جگر سے ارد ادب کی آبیاری کی ہے اور مستقل لکھ رہی ہیں د ہے کہ ان کا یہ تخلیقی کام اسی طرح عروج کی منازل طے کرتا رہے۔ آمین

☆☆......☆☆

آج کی رضیہ سلطانہ

عورت اگر چاہے تو آج بھی اپنے بلند کردار کی بدولت طاقت ور سے طاقت ور دشمن کو پچھاڑ سکتی ہے مگر اس کے لیے دین دار ہونا لازم ہے......

سلمٰی نسیم

نام کے عنوان سے ہوسکتا ہے کہ آپ کا ذہن تاریخ کے جھروکوں کے اوراق اُلٹنے لگا ہو۔ لیکن آج جو داستان میں سنانے لگی ہوں وہ صدیوں پرانی نہیں بلکہ آج کے دور کی سچی کہانی ہے۔ اور سچے واقعات ہیں۔ نام تو اس مرکزی کردار کا رضیہ ہی ہے۔ لیکن اس نام کی گہرائی میں میں اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑا کر اس نام کا تجزیہ کرنا چاہتی ہوں۔ کیا واقعی رضیہ سلطانہ نام مضبوط کردار ناقابل فروش ہمت اور بہادری کا نام ہے۔ ایک ایسا ناقابل یقین عشق کا سفر ہے۔ جو ایک خاتون کے ہاتھوں طے ہوا۔ اور اُس کی خداداد صلاحیتوں نے دریاؤں کے رخ پھیر دیے' ایک بچی ایک گاؤں میں جنم لیتی ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے ماں باپ کے لیے اُس اکیلی بچی کے دامن میں بے شمار خوبصورتیاں بھر دیں۔ گلاب کے پھول کی کلی' صحت و تندرستی میں سرخ سفید' اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' پالنے میں ہی اس کی سیاہ چمکدار آنکھیں انجانے خوابوں کی داستانیں سنانے لگیں۔ اس طرح ماں باپ کے دل اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر اس نے بچپن کی ہری بھری شرارتوں اور اٹکھیلیوں سے جوانی کی سرحدوں کو چھولیا۔ تو اُس کے ماں باپ کو اس کی تعلیم و تربیت کی فکر ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ عصری تعلیم کے ساتھ کیونکہ دین دار گھرانا تھا۔ تو انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے دین سمجھنے کی اساس کو بھی ضرور سمجھا' آخر ایک مخلص استاد کی زیر نگرانی قرآن و حدیث کی جامع تعلیم میں سرخرو ہوئی' عصری تعلیم تو میٹرک تک ہی رہی' اس کے ساتھ دینی تعلیم اس کے ذوق کا سبب بنی اور اُس کی دینی فطرت کی آسودگی نے اُس کے جسم میں خون کی طرح دینی تعلیم کو رواں کر دیا۔

ماں اپنے شوہر سے بہت اشتیاق اور دل کے ارمانوں کو آنکھوں میں سما کر کہتی ہے۔

"رضیہ کے ابا ہماری بیٹی بیاہنے کے لائق ہوگئی ہے ہمیں اُس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ

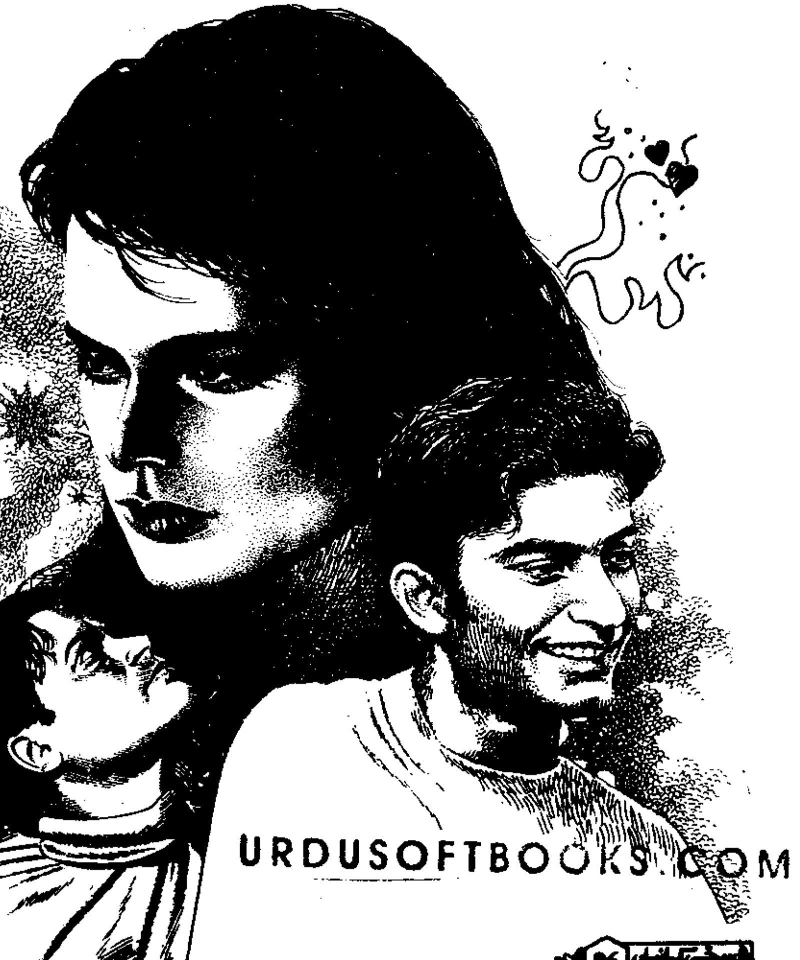
رخصت تو کرنا پڑتا ہے۔" باپ چونک کر جیسے اپنے ہاتھوں سے اپنے دل کا ٹکڑا نکال رہا ہو۔

"بھلی مانس تمہیں اتنی جلدی کیا پڑی ہے ایک ہی تو گھر کی روشنی ہے یہ بھی چلی گئی ہم سُونے گھر کے اندھیروں میں رہیں گے۔"

"رضیہ کے ابا آپ سچ کہتے ہیں لیکن ایک نہ ایک دن تو رخصت کرنا ہے۔ لیکن اس میں دل آزاری کی کیا بات ہے۔ وہ انشاء اللہ آتی جاتی

دیپ روشن کریں گی۔ اس کے بچے ہمار
کھلونوں کی طرح کھیلیں گے۔" آخر
جدائی کا آ گیا۔ جس کی خلش ہر بیٹی ک
ساتھ لاتی ہے۔ بہت دھوم دھام سے
اپنے دل کے ارمان نکالے اور رضیہ
دوسرے گاؤں چلی گئی۔

اب زندگی ایک عجیب موڑ بدلتی ہے
میں رضیہ بیاہ کر آئی وہاں اللہ اور ر



دن وہ اس ماحول کا جائزہ لیتی رہی' بہت بڑی حویلی جس میں اس کا سسر اُس کے سُسر کے بھائی اور اُن کے خاندان سب اکٹھے تھے اور اس حویلی میں بہت بڑا انگن تھا۔ اس کے بیچ و بیچ ایک مقبرہ بنا ہوا تھا۔ جس پر سبز چادر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد نقلی پھول اصلی پھول طرح طرح کی آرائش سجائی ہوئی تھیں اور اس مقبرے کا گدی نشین اُس کا چچا سسر تھا۔ وہ جعلی پیر لوگوں سے داد وصول کرتا اور مال بٹورتا' گاؤں کے سیدھے لوگ اُس کی چالوں میں آ کر اپنا پیٹ کاٹ کر اُس کو مال دیتے اور اُس کے کہنے پر امید کرتے کہ اُن کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ دعائیں قبول ہو جائیں گی' رضیہ کا اپنا سسر بھی اپنے بھائیوں کا ہم نوا تھا۔ رضیہ کو ان حالات میں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ماحول کا سرا کہاں سے پکڑوں' آخر کار اُس نے اپنی ساس اور شوہر سے بات کی' لوچک کے ساتھ انتہائی محبت اور دور اندیشی سے اُس نے قرآن مجید کے بارے میں بتایا۔

اس دوران اُس کی پہلی بیٹی نے جنم لیا وہ اپنے مشن میں سر دھڑ کی بازی لگا چکی تھی گاؤں کے لوگوں کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر اس جعلی پیر کی سازشوں سے پاک کرنا اُس کی زندگی کا مشن بن گیا۔ وہ چاہتی تھی قرآن کی جو روشنی نبی مہربان ﷺ لے کر آئے ہیں اسی ہدایت کی مشعل سے سارے گاؤں کو منور کر دے اس نے محلے کی بچیوں کو مانوس کر کے ناظرہ قرآن پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا اس کی اچھی شہرت آس پاس کے گاؤں میں بھی پہنچنے لگی تو اس کے چچا سسر کو اپنے خود ساختہ اقتدار کے چھن جانے کا

رضیہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ لوگوں
میں شریک رہی تو اس کا جما جمایا سکہ جو
دلوں پر بیٹھا ہوا ہے زنگ آلود ہو جائے
رضیہ کے باپ نے بیٹی کو کنال کا پلاٹ
تھا۔ رضیہ نے اس پلاٹ پر مدرسہ بنا
کیا ساتھ ہی ایک نہر بھی نکلتی تھی مسئلہ یہ
میں پانی نہ آ جائے' مگر اللہ تعالیٰ کو اُس کی
نیت اور ارادہ خوب بھایا اور کہتے ہیں نا

''تم اللہ کی مدد کرو وہ تمہاری

گا۔'' گویا سارا گاؤں اُس کا ہمنوا بن گ
بچوں کی ماں بن چکی تھی ساس نے دونو
محبت سے سنبھالا اور اسے حوصلہ دیا ک
مشن میں کمزور نہ پڑے۔ بس پھر کیا تھا
کی تعمیر میں خود جُت گئی نبی پاک ﷺ ک
پورا کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے م
دیواریں تعمیر کرنے لگی۔ جہاں مال کی
ہوتی وہ اپنا زیور' گاڑی سب کچھ بیچتی
مدرسے کی بنیادیں بہت گہری کھودی
پانی سے محفوظ رہیں اس لیے بہت زیاد
گئی اس سارے کام میں رضیہ اور اُس
سالہ بیٹی خود اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈا
کوٹنے میں پیش پیش رہے حالانکہ
پُر مشقت کام تھا اُسے دیکھ کر پورا گاؤں
ساتھ تعمیر میں حصہ لینے لگا۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں
سو بار عقیق کٹا تب نگین

جوں جوں عمارت بن رہی تھی
جذبے حوصلے بھی بڑھتے جا رہے تھے
نے علی الاعلان قرآن کی تعلیم عام کرنے
تشہیر شروع کر دی تھی اس شہرت سے اس

سسر کو بہت زیادہ حسد محسوس ہوا اور وہ اس کے خلاف منصوبے بنانے لگا پہلے وہ لاؤڈ اسپیکر پر پورے گاؤں شور مچاتا رضیہ کو بدنام کرتا کبھی اس کے مدرسے کا مذاق بناتا' حتی کہ اس نے مدرسے کی عمارت کے قریب ہی ایک گھر میں مدرسہ کھولنے کا اعلان کیا اور وہاں بیٹھ کر رضیہ کے خلاف تدبیریں کرتا جب اس سے بھی رضیہ نے ہمت نہ چھوڑی تو اس کے چچا سسر نے اپنے ناپاک عزائم پورے کرنے کے لیے ایک خوفناک منصوبہ ترتیب دیا جس وقت رضیہ آخری تعمیری حصے کا کام مکمل کروا رہی تھی اس کے چچا سسر نے چند بدقماش لوگوں کے ساتھ ساز باز کی اور بلڈوزر بھیج دیا کہ منٹوں میں عمارت کو ڈھا دیں۔ ابھی بلڈوزر پہنچے بھی نہ تھے کہ اللہ کی لاٹھی حرکت میں آئی اللہ کی قدرت خندہ زن تھی...... پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا بلڈوزر ابھی پہنچا بھی نہ تھا کہ اس بدبخت شخص کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اور اس کے ناپاک ارادے نیست و نابود ہوگئے گویا مومن کا کردار آج بھی ہو تو بدر کے معجزے رونما ہوتے ہیں۔ آگ میں پھول کھلتے ہیں...... صحرا میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور بنجر زمین میں گل لالہ لہراتا ہے۔ یونہی ہوا رب کائنات کو رضیہ کی پُرخلوص محنت شاقہ بہت پسند آئی اور یہ مدرسہ قرآن کی روشنی دور دور تک پھیلانے لگا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضیہ کو غیبی امداد میسر ہوئی۔ اس کا چچا سسر جو اس مدرسے کو مٹانے آیا تھا خود مٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی آبرو بچالی۔

وہ بدبخت کچھ عرصہ بستر مرگ پر پڑا رہا۔ آخر کار اپنے ناپاک وجود کے ساتھ اس فانی دنیا سے راندہ درگاہ ہوا۔ اب رضیہ نے اپنے مدرسے کو بھرپور توجہ دی بہترین سسٹم کے ساتھ اسکول کی ترقی کے لیے قاعدے اور قانون بنانے لگی۔ بچیوں کے سالانہ امتحان ہوتے اُن کے اچھے رزلٹ پر انعامات دیے جاتے۔ اُن کی مائیں اور گاؤں کی بہت سی خواتین کو ان فنکشنوں میں دعوت دی جاتی اُن عورتوں کی جہالت دور کرنے کے لیے درس کا بھی انتظام کیا جاتا۔ بہترین معلمات درس دیتیں ان موقعوں پر کھانے کا بھی انتظام ہوتا میٹھے اور نمکین کی دیگیں پکائی جاتیں۔ آج وہاں کی آبادی کہتی ہے کہ رضیہ نے تو جنگل میں منگل کردیا۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
کرو مہربانی تم اہلِ زمین پر
خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر

اور میں اس سارے واقعات کو ذہن کے دریچوں میں تازہ کر کے سوچتی ہوں کہ ایک عورت اللہ کی بندی اپنی محنت اور لگن سے کس طرح معاشرے کو بدل سکتی ہے۔ اے کاش ہر عورت ہر بندی اپنی قابلیت اسی چند روزہ زندگی کو ضائع کرنے سے بچ جائیں۔ رضیہ کی طرح اپنے شعور اور لاشعور کو قربانیوں کے لیے تیار کریں تو آج ملک سے یہ جہالت ظلمتوں کے اندھیرے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی روشنیوں میں بدل جائیں اور آخرت کی لامحدود زندگی کی لامحدود نعمتوں کی کامیابی پالیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
مجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ
تو کتاب خوان ہے مگر صاحب کتاب نہیں

☆☆......☆☆

نیا سلسلے وار ناول

ایک بہت ہی خاص منفرد موضوع پر دلچسپ تحریر



(چوتھی قسط)

غیاث الدین غیاث کا خیال

تقاضہ وقت کا ہے یہ کہ لکھو
لکھیں گے ہم کہ ہم راقم ہوئے ہیں

روشانے سبطین مہاروی

''تیمور کو گولی کیسے لگ گئی...... اُس کی تو کسی کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ پھر اُس کے ساتھ یہ سب کیسے ہو گیا؟''

نور فاطمہ متحیر زدہ ہو کر کہہ رہی تھیں۔

''کچھ خبر نہیں خالہ...... پریشے کی اپنی حالت سخت خراب تھی۔ زیادہ تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی'' فروا نے سنجیدگی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ تو ان کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرانے لگیں۔

''ممی...... مجھے سیدو شریف جانا ہے...... ابھی اور اسی وقت۔'' فروا ماں کا ہاتھ تھامے لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

نور فاطمہ نے ایک گہری جانچتی نگاہ بیٹی پر ڈالی' بکھرے بال اور متورم آنکھیں...... جن میں تیمور آفریدی کا جنوں خیز عکس لپک لپک کر اُن کی بیٹی کے پورے وجود کو اپنے ساتھ گرہوں میں باندھ رہا تھا۔

یہ کیسا رابطہ تھا...... اگر صرف دوستی تھی' تو پھر یہ حد درجہ تفکر چہ معنی دار......؟

اُن کے ماتھے کے بل گہرے ہوتے چلے گئے۔

''او خدایا...... یہ آگ کی لپٹوں میں جھلستے جذبے میری جہاندیدہ نظروں سے کیسے اوجھل رہے۔ جو میری نادان بیٹی کو بھسم کرنے کے لیے کافی ہیں۔''

ماں تھیں تفکر لازم تھا وہ لمحوں میں پسینے پسینے ہو گئیں۔

''ممی...... پلیز...... آپ مجھے سن رہی ہیں ناں؟'' ماں کی پل پل بدلتی حالت سے بے خبر وہ بے تابی سے بولی تو انہوں نے ایک تیز نگاہ اُس کے بکھرے بکھرے وجود پر ڈالی' جسے اُس نے ایک لمحہ کو



اعتنا نہیں جانا۔ لیکن اُن کے چہرے کے تیزی سے بدلتے زاویے زرمینے کی نظر سے مخفی نہ رہ سکے
بدل کر رہ گئی۔

انہوں نے ایک سرد، شکوہ بھری پتھریلی نگاہ زرمینے پر ڈالی تو وہ قصداً نظر چرا گئی۔

نور بیگم کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس برآمد ہوئی جیسے وہ ابھی ابھی ایک کوہِ آتش
کر کے آئی ہوں۔

''فروا...... ہوش میں آؤ۔''

اُن کا لہجہ ہی نہیں تیور بھی تند تھے۔

''ممی......''

فروا نے بے یقینی سے استعجابیہ انداز میں انہیں دیکھا۔ تیمور اور وہ بچپن کے دوست تھے بہتر
...... اور ممی کو بھی وہ بے حد عزیز تھا تو پھر یہ بے اعتنائی کیونکر......''

وہ سخت مضطرب ہوئی۔

''تیمور زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے ممی...... کیا یہ سن کر میرے حواس سلامت رہ سکتے ہیں
کے لہجے میں احتجاج اور دبا دبا غصہ تھا۔ یہ لاحاصل بحث اُسے مزید بے کل کر رہی تھی۔

''یقیناً یہ بات میرے لیے بھی اتنی ہی باعث تشویش ہے۔ لیکن تمہارے یہ مختل حواس...... یہ
یہ پاگل پن...... کیا یہ صرف دوستی ہے؟''

انہوں نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اُن کا انداز شاید ہی فروا کے لیے
سخت اور کھردرا رہا ہو۔

فروا اپنی ماں کی قیافہ شناسی پر انگشت بدنداں رہ گئی۔

تو بے اختیاری میں ممی پر برسوں سے دل کے نہاں خانوں میں پنہاں جذبے عیاں ہو گئے تھے
اِن جاں گسل لحات میں بھی وہ حیا سے کٹ کر رہ گئی۔ نظریں جیسے زمین سے چپک کر رہ گئیں۔
اور ہونٹ گویا ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اُس کی بے قراریوں نے سارے راز عیاں
تھے۔

فروا کو ڈھیروں حجاب نے گھیر لیا۔ خفت اور شرمساری اُس کے لہو کی گردشیں تیز کر گئیں۔

نور فاطمہ کے سامنے گویا وہ کٹہرے میں کھڑی تھی۔ جیسے آج یوم احتساب تھا۔ وہ اسے سخت
کے حصار میں جکڑے ہوئے تھیں۔

زرمینے کو اُس کی بے چارگی پر حد درجہ ترس آیا وہ اُس کی مدد کے لیے آگے بڑھی۔

''خالہ......! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے...... ایسا کچھ نہیں ہے...... یہ صرف اچھے دو
اینڈ یو نو ویری ویل۔''

زرمینے نے ہمت کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ایک ماں سے بڑھ کر اپنی اولاد کو کوئی سمجھ نہیں سکتا زرمینے...... ماں اپنی اولاد کی ہر رفتار
رکھتی ہے...... اس کے بکھرے بال، لرزتے کپکپاتے ہاتھ، دگرگوں حالت، اس بات کی گواہی دے

کہ ماجراہ کچھ اور ہے۔"
وہ نپے تلے لہجے میں بات کر رہی تھیں کہ معاملہ اُن کی بیٹی کا تھا۔
زرمینے کی مفاہمت وہیں دم توڑ گئی۔ اُس نے بے بسی سے فروا کو دیکھا جو مدد طلب نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہی تھی' لیکن زرمینے کے پاس نور فاطمہ کے ساتھ جرح کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔
"ممی...... کیا آپ کو اپنی فروا پر' اپنی بیٹی پر بھروسہ نہیں ہے؟"
آخر اُس نے خود ہی ہمت کرنے کی ٹھانی' لیکن اُس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ نور فاطمہ بیگم کی سماعتوں تک بمشکل پہنچ پائی۔
"تمہارے کردار اور اپنی تربیت پر مجھے خود سے زیادہ بھروسہ ہے' لیکن میں تمہیں اپنی ذات کا تماشہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" اُن کا لہجہ ہنوز پتھریلا تھا۔
"لیکن خالہ......! ہمیں تیمور کو دیکھنے کے لیے ایک بار تو جانا ہی چاہیے' اُن کے ساتھ آپ کے فیملی ٹرمز بھی تو ہیں' زرین آنٹی اور پریشے کو اس کٹھن وقت میں آپ کی مورل سپورٹ کی ضرورت ہوگی۔"
انتہائی تفکر سے کہتے ہوئے اب کی بار زرمینے خود کو مداخلت کرنے سے نہ روک سکی۔
"یقیناً ہمیں جانا چاہیے' اور ہم جائیں گے بھی...... لیکن اِس احمق لڑکی کی ایسی مخدوش حالت دیکھ کر کوئی بے وقوف انسان بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ تیمور کے لیے اُس کے دل میں کیسے جذبات پوشیدہ ہیں۔"
وہ چبا چبا کر کہتے ہوئے بولیں تو ضروا کو اپنی بے حد اہانت محسوس ہوئی وہ لب کچل کر رہ گئی۔
"ممی...... وہ...... میں......" کچھ کہنے کی کوشش میں فروا کے لب پھڑ پھڑائے' لیکن نور فاطمہ نے اُسے بری طرح جھڑک کے رکھ دیا۔
"بس...... اس قصیحے کو بعد میں سلجھائیں گے۔ دس منٹ میں تم دونوں نیچے آ جاؤ...... ہم سید و شریف کے لیے نکل رہے ہیں۔"
سرد مہری سے کہتے ہوئے وہ جانے کے لیے مڑیں۔
اُن کی تند نظروں کے حصار سے نکلتے ہی فروا کی رُکی ہوئی سانسیں بحال ہونے لگیں۔
"اور ہاں اپنا حلیہ ٹھیک کرنا مت بھولنا...... تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ہماری عزت پر کئی سوال اُٹھ سکتے ہیں...... اور تم پر کئی انگلیاں بھی......" وہ پلٹ کر تنبیہی انداز میں انگلی اُٹھا کر اسے وارن کرتے ہوئے بولیں۔ اُن کے مزاج سخت برہم تھے۔
زرمینے اور فروا بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔
"ڈاکٹر صاحب...... اماں ہوش میں آنے کے بعد بھی بے حد اسٹریس فل کنڈیشن میں ہیں...... بہت ہی Unusual سا بی ہیو کر رہی ہیں۔" OHQ کے سینئر ڈاکٹر وحید الرحمٰن سے بات کرتے ہوئے پریشے کی آواز بھرا گئی۔
"وہ ابھی تک شاک میں ہیں' اس لیے اُن کے رویے یکدم سے اتنا بدلاؤ لیے ہوئے ہیں۔ لیکن تھوڑی ورری اباؤٹ اُن کا ٹریٹ منٹ چل رہا ہے' وہ جلد Recover کر لیں گے۔"
ڈاکٹر وحید بے حد پروفیشنل انداز میں اُسے تسلی دے رہے تھے۔ اُن کے چہرے پہ مشفقانہ مسکراہٹ

تھی۔
ڈاکٹر صاحب سے اماں کے متعلق ڈیٹیل میں بات کرنے کے بعد پریشے کے دل کو خاصی تقو
معید خان اِس دوران خاموش سا قریب کھڑا رہا' اُس نے کسی بات میں مداخلت ضروری ہی نہیں سمجھی۔
ڈاکٹر صاحب اپنے آفس میں جانے کے لیے پلٹے' تو دفعتاً کچھ یاد آنے پر پری نے انہیں متو
کے لیے پکارا۔
''ایکسکیوزمی ڈاکٹر......''

وہ فی الفور اُن کے پیچھے گئی۔
''بس......؟''
وہ نرمی سے کہتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔
''ڈاکٹر صاحب! پلیز...... اماں کو روم میں شفٹ کر دیں۔ ایمرجنسی وارڈ میں اُن کا نہیں رہنے
متفکر سی کہہ رہی تھی۔
''او کے میں سسٹر سے بات کرتا ہوں کہ وارڈ بوائے کو بھجوا کر پیشنٹ کو پرائیویٹ روم میں
کر دیں۔''
ناک کی پھنگ پر چشمہ جمائے ڈاکٹر وحید ریسپشن کی طرف بڑھ گئے۔
''چلیں؟''
معید نے استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ پریشے کو اس کی آنکھوں میں سرد مہری کی عمیق
اترتی نظر آئی۔
وہ بے حد حساس تھی' معید کے گریز کو اُس نے فوراً محسوس کیا تھا۔
''آئی ایم سوری معید...... میں اماں کو لے کر بہت پَزل ہو رہی تھی' سو اسی لیے میں ڈاکٹر وحید
ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی۔''
باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔
اگرچہ اُن کے درمیان کبھی بھی بے تکلفی نہیں رہی تھی لیکن چونکہ وہ فطرتاً حساس طبع تھی' سو اُس کی
ہوتی کہ کسی کو ہرٹ نہ کرے۔
''مجھے برا نہیں لگا تم خوامخواہ سے وضاحتیں دے رہی ہو' ہاں' لیکن چچی جان مجھے بھی بے حد عز
بالکل بی بی جان کی طرح۔''
ناچاہتے ہوئے بھی وہ جتا گیا تھا۔
پریشے بس ایک خاموش نظر اُس پر ڈال کر رہ گئی۔
دفعتاً اُس کے موبائل کی بیپ بجی...... اسکرین پر چمکنے والا نمبر شاہ زر کا تھا۔
''ہیلو...... پریشے کیسی ہیں آپ؟'' شاہ زر کا بے قرار سا لہجہ پریشے خان آفریدی کی ساری ح
جیسے الرٹ کر گیا۔
عورت کی چھٹی حس محبت کے معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے...... خود پر ٹھہری ایک نظر...... آواز

بم اُس پر مرد کے دل کے نہاں خانوں میں پنپتے جذبے ایک لمحے میں طشت از بام کر دیتا ہے۔
''آئی ایم فائن...... کیسے فون کیا آپ نے؟''
پری کا لہجہ از خود محتاط ہو گیا۔ لیکن وہی ازلی وضع داری اور مہذبانہ پن ہنوز تھا۔ کچھ بھی تھا معید خان تمام تر بے نیازی کے باوجود بھی اُس کے ساتھ اپنی منسوبیت کو وہ دل سے OWN کرتی تھی' سوچ روش اپنانی ضروری تھی کہ اماں اور بابا جان کے ساتھ ساتھ بی بی جان اور آغا جی کی خوشیاں بھی اِس رشتے سے وابستہ تھیں۔ اور پریشے کے لیے اپنوں سے بڑھ کر کچھ نہ تھا وہ اپنے رشتوں کو لے کر یونہی جذباتی تھی۔
اُس کا نارمل سا لب ولہجہ شاہ زر کی سماعتوں سے ہوتا ہوا اُس کا دل چیر گیا۔ وہ ایک لحہ کو پھیکا سا پڑ گیا کچھ لمحے کے لیے تو اُس کی زبان کو گرہ لگ گئی اور لفظ جیسے دم سادھے جب بہ لب تھے۔
کتنے دن بعد اُس کی آواز سنی تھی۔ لیکن وہ لڑکی شاید جذبات سے بالکل عاری تھی۔
شاہ زر کا دل جیسے شام کے آخری ستارے کی طرح ڈوب گیا۔
'Hey Are You There؟'' پریشے نے اُس کی طویل خاموشی کو محسوس کیا' تو قدرے توقف سے اُلجھی اُلجھی سی بولی۔ لیکن دوسری طرف سے لائن ڈراپ ہو چکی تھی۔
شاہ زر فون ہاتھ میں تھامے زینہ زینہ سوچ کی رمیق گہرائیوں میں اترنے لگا۔
یوں یکدم بنا کچھ کہے فون بند کرنا اخلاقیات کے خلاف تھا لیکن اُس کے لہجے کی اجنبیت نے شاہ زر کے حوصلے پست کر دیے تھے۔
اُس کی آواز بھی بھیگی بھیگی اور بوجھل تھی' شاید وہ پریشان تھی' کہیں کچھ غلط ہوا تھا اُس کی قیافہ شناسی اُسے تاسف میں مبتلا کر گئی۔ شاہ زر کو ملال نے گھیر لیا کہ بنا بات کیے فون بند کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اِس امیچور حرکت پر اُس نے خود کو کوسا۔
مسلسل ذہنی پریشانی اور تھکاوٹ پریشے کی پور پور میں یوں سرایت کر گئی تھی کہ اُس کے دماغ نے فی الوقت شاہ زر کے غیر مبہم رویے کو سمجھنے سے یکسر انکار کر دیا۔ تو وہ فون ہاتھ میں لیے ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی۔
'What Happened؟''
اُس کے ساتھ قدم سے قدم ملاتے معید نے استفسار کیا۔
''میرے کلاس میٹ شاہ زر کی کال تھی لیکن فون اچانک بند ہو گیا' شاید سگنل پرابلم ہے۔'' وہ کندھے اُچکا کر بولی۔ تو معید نے بھی محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
دفعتاً ایمرجنسی وارڈ کے گلاس ڈور کو دھکیلتے ہوئے معید خان کے قدم رک گئے۔ تو پریشے نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔
''چچی جان کی میڈیسن لانا تو میں بھول ہی گیا' تم چلو میں میڈیکل اسٹور سے ہو کر آتا ہوں۔'' ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا تو پریشے خاموشی سے آگے بڑھ گئی اور وہ بھی متضاد کیفیت میں گھرا اُلٹے قدموں پلٹا' اُس کے قدم اٹھے ہی تھے کہ یکا یک زمین کانپنے لگی' معید کو لگا جیسے ایک لحہ میں پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔

''او مائی گاڈ......''

اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کئی لوگ ایک ساتھ باہر کی سمت بھاگے۔

''معید......''

پریشے نے پلٹ کر تقریباً چیختے ہوئے اُسے پکارا۔ وہ سخت حواس باختہ ہو رہی تھی۔

زمین ایک بار پھر تھرتھرائی۔

''وہیں رکو...... بھاگنا مت...... بیٹھ جاؤ......'' وہ چلایا۔

''اماں' بابا اور تیمور اندر ہیں۔''

وہ ہاتھ کے اشارے سے وارڈ کی طرف پتھرائی نظروں سے دیکھتے ہوئے بلکی...... اُس کے ہو
رہے تھے۔ زلزلے کا جھٹکا انتہائی زوردار تھا۔

''چپ......'' معید نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے تنبیہ کی۔

''یا اللہ...... رحم فرما...... ہم سب پر رحم فرما......'' سختی سے آنکھیں بھینچ کر پریشے نے شدتوں ۔
والے کو پکارا۔

چند قدموں کے فاصلے پر ایک عمر رسیدہ بوڑھی نرس با آواز بلند درود شریف پڑھ رہی تھی۔

''یا اللہ...... اتنی آزمائش...... ایسا کیا گناہ ہوگیا؟'' معید زیر لب بڑبڑایا۔ اس کے سوچنے
صلاحتیں جیسے سلب ہو رہی تھیں۔ بے اختیار اُس کی نگاہ پریشے پر پڑی' جو بے بسی سے اُسے ہی د
تھی۔

''پہلے تیمور...... پھر چچی جان...... غم جان کی دگرگوں حالت...... اور اب یہ ایک نیا امتحا
الٰہی...... اس سے زیادہ کے ہم متحمل نہیں ہوسکتے۔'' معید نے شاید ہی زندگی میں اس شدت ۔
پُرسکوں ہستی کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پکارا ہو......

اُس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ اور غصے سے تھرتھرائی زمین چند ثانیے میں ساکت ہوگئ
کی رُکی ہوئی سانسیں جیسے پھر سے بحال ہوگئیں۔ وہ تیزی سے پریشے کی طرف بھاگا۔

''کیا تم ٹھیک ہو۔'' اس کے زرد چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے وہ مستفسر ہوا۔

پریشے نے محض اثبات میں سر ہلایا' اور اندر کی طرف اشارہ کیا۔

''آؤ......''

معید نے تیزی سے اندر کی طرف قدم بڑھائے تو اُس کی تقلید میں وہ بھی آگے بڑھی' لیکن ا
پہلے کہ وہ اندر جائے آدم خان تیز تیز قدموں سے چلتے انہیں اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔

''تم لوگ ٹھیک ہوناں؟'' وہ پھولی سانسوں سمیت گہرے تفکر سے بولے۔

''بابا آپ کا چہرہ......''

پری نے آدم خان کا سوال یکسر نظر انداز کر کے بے قراری سے اُن کا بازو تھاما۔

اُن کی پشت پر کوریڈور میں دیوار پر لگی ایل ای ڈی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

کوہ ہندوکش میں 6.5 ریکٹر اسکیل پر شدید زلزلہ...... آفر شاک لگنے کی وجہ سے سوات' مینگو

زلزلے کے شدید جھٹکے' تاہم ابھی تک کسی جانی و مالی نقصان کی خبر نہیں آئی۔ بی سنوری نیوز کاسٹر۔نپے
لہجے میں سنجیدگی سے خبر دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

اسٹیرنگ پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے اُس کی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ تیزی سے بہتے اشک
کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ہائی وے پر اِکا دُکا ٹریفک تھی۔ اُس کے وجود کا رواں رواں معیز
آفریدی کے لیے دعا گو تھا۔ وہ جو لہو کی حرارتوں میں کسی الوہی راز کی مانند پوشیدہ تھا' جس کا عشق اُس
مٹی کے زرہ ذرہ میں شامل تھا۔ آج اُس کے دل کو ڈھیروں وسوسوں اور اَن دیکھے خوف کے حصار
باندھے خود ہوش وخرد سے بیگانہ پڑا ہوا تھا۔

''بہت برے ہو تم...... ہمیشہ سے یونہی ستاتے ہو۔ کبھی میرا خیال نہیں آیا کہ میرے دل پر کیا
گی۔ اپنی من مانی کرنا بس۔''

وہ زیر لب اُس سے شکوے کرتے ہوئے مسلسل گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اشک نظر کو دھندلا تے' ا
سے آنکھیں رگڑ ڈالتی۔

''بابا جی...... تہاڈی مہر ہونی چاہیدی...... میرے معیز نوں کجھ نہ ہووے۔'' اُس کی تصویر نرما
نظروں میں گھومنے لگی' جو ہزار ہاہٹ دھرمی اور من مانی کرنے کے باوجود اُس کے اشکوں سے
خائف ہو کر سرنگوں ہو جاتا تھا وہ بے خبر اِس وقت انجان تھا کہ اُس کی نرمالہ اِس وقت پاگلوں کی طرح
کے لیے آنسو بہا رہی ہے۔

عرش سے واپس لوٹا دی گئی کسی بے بس دعا کی طرح وہ تنہا تنہا اجڑی سی اپنی منزل پر پہنچ گئی تھی
قیامت اِس سے بڑھ کر بھی تھی۔

اُس نے تیزی سے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور عجلت سے تقریباً بھاگتے ہوئے اسپتال کی بل
کی طرف بڑھ گئی۔

قدم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا' یہیں کہیں اِسی اسپتال
اُس کا معیز تنہا کسی بیڈ پر پڑا تھا۔ اُس کی متاعِ جاں' اُس کا محور' اُس کی ذات سے جڑا ایک عظیم لا
رشتہ......

آنسوؤں کی یلغار میں وہ NHS ایلنگ اسپتال کی ریسپشن تک بمشکل پہنچی۔ اُس کے ہاتھ لرزید
تو اعصاب سخت متزلزل' گھر سے اسپتال تک کا یہ سفر اُسے اپنی زندگی کا سب سے طویل سفر لگا' گویا کہ
تنہا آبلہ پا پوری دنیا کا چکر لگا کر آئی ہو۔

ریسپشن پر ایک نوعمر سیاہ فام لڑکی فون پر مصروف تھی۔

''ایکسکیوز می......''

نرمالہ کے خشک حلق سے بمشکل آواز نکلی۔

''یس......''

وہ فوراً متوجہ ہوئی۔

معیز خان نام کا ایک لڑکا شدید زخمی حالت میں یہاں لایا گیا ہے۔ کیا تم اُس کے بارے میں ب
ہو؟'' نرمالہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی تو لڑکی نے اُس کی متورم سوجی آنکھوں اور زرد پڑتے چہرے کو دیکھا۔

''ہاں ہاں' کیوں نہیں......'' ایک نرم مہربان مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اُس نے خوش اخلاقی سے کہا سامنے کمپیوٹر کی بڑی سی اسکرین پر نظریں دوڑانے لگی۔

''کیا یہ وہی معیز خان ہے جسے ابھی کچھ دیر پہلے کانسٹیبل مارک انتھونی لائے تھے؟ بے چارہ لڑکا طرح انجرڈ تھا۔'' ہمدردی سے نرمالہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ریسپشنسٹ لڑکی نے تصدیق چاہی۔

شاید محبت کسی زبان کسی کلچر' کسی روایت کو نہیں مانتی۔ یہ سب دنیاوی آلائشوں سے بالاتر ہے یہ ا جذبے بس چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں' کہ محبت بس محبت ہے' اور لڑکی نے بھی نرمال چہرے پر اُن چیختے جذبوں کی پکار بنا کچھ کہے ہی سن لی تھی۔

''ہاں......'' پھنسی پھنسی آواز میں نرمالہ محض سر ہلا سکی۔ اسی اثنا میں تیز قدموں سے چلتا ہوا م انتھونی اُن کی طرف آ رہا تھا۔

''کیا تم نرمالہ ہو......'' قریب آ کر اُس نے قیافہ شناس نظروں سے اُسے دیکھا۔ تو وہ بھی فوراً اُ طرف متوجہ ہوئی۔

''یس مسٹر انتھونی...... میں نرمالہ ہوں...... معیز کہاں ہے...... کیسا ہے وہ؟ مجھے فوری اُس س ہے۔'' روہانسی ہو کر اُس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''آؤ میرے ساتھ...... اُس کی حالت بہت کریٹکل ہے۔ ہیڈ انجرڈ کے علاوہ اس کی ربز بھی کئی جگ سے فریکچر ہیں۔'' مارک انتھونی نے نرمالہ کے یکدم سپید پڑتے چہرے کو دیکھ کر سنجیدگی سے نرم لہجے میں ک اُس کے تفکر اور رنجیدگی کو دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ وہ معیز خان کے ساتھ بہت قریبی رشتے میں منس ہے۔

نرمالہ میں مزید کسی سوال کی ہمت نہ تھی۔ مارک انتھونی نے معیز خان کے پاس جانے کے لیے آگے بڑھائے تو نرمالہ بھی بے جان قدموں سے اُس کی تقلید میں آگے بڑھی۔

''سنیے...... مس نرمالہ' ڈونٹ وری...... وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' لڑکی نے پیچھے سے دوستانہ ا میں تسلی دی۔

''تھینک یو سو مچ...... پلیز Pray For Him۔'' نرمالہ نے پھیکی مسکراہٹ سے مڑ کر تشکر انداز میں کیا۔

'Poor Girl'۔'' ریسپشنسٹ بڑبڑائی۔

''مسٹر انتھونی' میرے فرینڈ معیز خان کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں' پھر وہ کون لوگ تھے؟ جنہوں اُس کو اِس بے دردی سے ظالمانہ انداز میں مارا کہ وہ اتنا شدید زخمی ہو کر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا ثانیے کے توقف کے بعد نرمالہ گلوگیر آواز میں بولی۔

''مس نرمالہ...... فی الحال کچھ نہیں کیا جا سکتا' یہ اسٹریٹ کرائم یا Robbery کی واردات بھی

لگتی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ مجرم معیز خان کو آل ریڈی جانتے تھے۔لیکن بہر حال وہ ہم سے بچ نہیں سکے
مارک انتھونی نے یقین سے کہا۔

نرمالہ کا ماؤف ہوتا دماغ فی الحال مزید کسی سوال جواب کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا سو اُس نے خاموشی
عافیت جانی۔ چند سیکنڈز کے بعد وہ معیز کے اتنے قریب تھی کہ گلاس ڈور کے پار اُسے با آسانی دیکھ
تھی۔لیکن اُسے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی۔وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''مسٹر انتھونی' پلیز مجھے اندر جانے دیں۔ میں صرف ایک بار اُسے قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔
لجاجت سے بولی۔

انتھونی کے لیے یہ صورتِ حال بہت جذباتی تھی لیکن وہ اُسے اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا
''مس نرمالہ! آپ اندر نہیں جاسکتیں معیز خان کی حالت بہت نازک ہے۔اندر اُس کا ٹریٹمنٹ
رہا ہے۔آپ ریلیکس رہیں اور پلیز خود کو سنبھالیں۔'' ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ ہمدردی
بولا۔

''پلیز ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ میں اسے دیکھے بنا مر جاؤں گی۔ مجھے اندر جانے دو۔'' وہ جیسے مکمل ط
اردگرد سے بیگانی ہوگئی تھی۔

مارک انتھونی کے لیے یہ سب بہت پریشان کن ہو رہا تھا۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' اندر
ایک بوڑھی نرس باہر نکلی نرمالہ اُسے دیکھ کر پاگلوں کی طرح اُس کی طرف لپکی۔

''معیز کیسا ہے وہ...... کیا میں اُس سے مل سکتی ہوں؟'' دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہو
ہلا کر بولی۔

"ay Are You Souting? Plecse Be
Quite'' یہاں ایسے شور کرنا Allow نہیں ہے' پیشنٹ ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔'' نرمالہ کی ہیجانی ک
کو دیکھ کر نرس نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ...... میں...... آئی ایم سوری...... پلیز...... مجھے اُس سے ملنا ہے۔'' وہ بے ربط جملوں میں خا
اشکوں کے ساتھ بولی تو نرس کو اُس کی مخدوش حالت پر بے حد ترس آیا۔

''او بے چاری لڑکی! حوصلہ رکھو اور خدا سے دعا کرو۔ وہ جلد تمہارے ساتھ ہوگا۔لیکن ابھی کسی ک
اُس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ڈاکٹر اُسے ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں۔لیکن ابھی تک وہ ہوش میں
آیا۔'' عمر رسیدہ نرس اب کی بار مشفقانہ انداز میں اُس کا گال تھپتھپا کر بولی۔

نرمالہ کی نظریں گویا گلاس ڈور پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ جو دل کے اتنا قریب تھا کہ ہر دھڑکن
کے نام کی مالا جپ رہی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر تھا لیکن اُس سے ملنے کے لیے دوسروں کی اجا
درکار تھی۔اُس کا دل یکبارگی ڈوب کر ابھرا۔

''سسٹر! وہ کب تک ہوش میں آئے گا۔'' دل جیسے بس اُسی میں اٹکا ہوا تھا۔سسٹر کی باتوں کا اُ
چنداں اثر نہ ہوا تھا۔وہ ہنوز غائب دماغی کی کیفیت میں تھی اور آنسو کسی سیلابی ریلے کی طرح بس ا
آئے تھے

''پیاری لڑکی! ابھی اُس کی کنڈیشن اچھی نہیں ہے۔ اُس کی پسلیاں کئی جگہ سے ٹوٹ چکی ہیں۔ لیکن
اس کا علاج کررہے ہیں۔ امید ہے صبح تک وہ ہوش میں آجائے گا۔'' بوڑھی نرس مہربان مسکراہٹ
اُسے ڈھارس بندھاتی دوبارہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اور نرمالہ کے لیے وہ رات قیامت سی رات تھی۔ اُس کے فون پر ممی اور باؤجی مسلسل کال کر
تھے۔ لیکن اُس کی حالت اتنی ابتر تھی کہ اُس کے بیگ میں وابریشن پر لگا موبائل مسلسل تھرتھراتا رہا لیکن
بے خبر رہی۔

ہیڈ کانسٹیبل مارک انتھونی ٹیپ ریکارڈر لیے اُس کا اسٹیٹ منٹ لینے آیا تو اُس نے اسٹیٹ منٹ
سے صفا چٹ انکار کردیا اور نہ ہی چارجز پریس کروانے کے لیے اُس کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنے پر
مند ہوئی۔

''مسٹر انتھونی...... میں معیز کو اِس کنڈیشن میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی اور نہ ہی میری ذہنی حالت
ابھی کوئی اسٹیٹ منٹ دینے کی ہے۔'' اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو اُس کی دگرگوں حالت
پیش نظر مارک انتھونی نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔

''اوکے...... پھر صبح تم سے ملاقات ہوگی۔ ہم تمہارا اور معیز خان کا بیان اکٹھے لیں گے۔ اور
چارجز پریس کروانے کے لیے ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن بھی جانا ہوگا۔'' مارک نے جیسے یقین
چاہی۔

''ضرور آفیسر...... اور آپ کے تعاون کا بے حد شکریہ۔'' نرمالہ نے غائب دماغی سے کرسی سنبھ
مارک انتھونی اسے گڈ بائے کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جیسے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اور...... وہ پوری رات نرمالہ نے ہاسپٹل کے لاؤنج میں ایک کرسی پر گھٹنوں میں سر دے کر گزار
اسے خبر ہی نہیں ہوئی کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

''پیاری لڑکی' اٹھو تمہارا فیانسی ہوش میں آگیا ہے۔'' وہی بوڑھی نرس اُس کا کندھا جھنجوڑ کر بولی
ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''سسٹر! معیز کو ہوش آگیا؟'' وہ بے قراری سے بولی۔

''ہاں! وہ ہوش میں آگیا ہے...... تم اُس سے مل سکتی ہو...... لیکن زیادہ بات چیت مت کرنا......
اسے ریسٹ کی ضرورت ہے۔'' بوڑھی نرس نے ناصحانہ انداز میں اُسے کہا۔ تو نرمالہ نے محض سر ہلا
اکتفا کیا۔

نرمالہ کی معیز کے لیے بے تابی اور محبت دیکھ کر وہ خود سے فرض کر بیٹھی تھی کہ نرمالہ اُس کی فیانسی
نرمالہ نے بھی اُسے وضاحت دینی ضرورت نہیں سمجھی' اور کرسی کی پشت سے ٹنگا اپنا کوٹ پہن کر خاموشی
اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب وہ بالکل اُس کے سامنے تھا۔ زرد رنگت میں پٹیوں میں جکڑا ہوا ہونٹ سوجے ہوئے تھے
چہرے پر جابجا نیل کے نشان تھے۔ اُس کی ایسی حالت پر ناملہ کے رُکے ہوئے آنسو پھر سے ابل پڑے
''معیز......'' وہ بے اختیار ہوکر آگے بھی اور اُس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے۔

''نرمالہ......'' معیز کے لبوں نے ہولے سے جنبش کی۔
''معیز......آنکھیں کھولو...... دیکھو تمہاری نرمالہ آئی ہے۔''
اُس کی آنکھوں سے نکلے آنسوؤں کی بوندیں جب معیز کے چہرے پر پڑیں تو اُس نے ذ
آنکھیں کھول کر مسکرانے کی کوشش کی۔
''تم یہاں کیسے؟'' وہ ابھی تک دوائیوں کے زیرِ اثر تھا۔ کمزور سی آواز میں بولا۔
''تم کسی مشکل میں ہو تو کیا میں تم سے دور رہ سکتی ہوں؟'' وہ عجب دیوانگی سے بولی۔ تو معیز خا
سماعتیں جیسے سنسنا اٹھیں۔

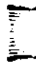
یہ بے اختیاری پہلے کب نصیب ہوئی تھی!!؟
عشق کا یہ عالم پہلے کب تھا!!؟
یہ جادوائی کوئی اور تھی!!؟
یہ رنگ کوئی اور تھے!!؟
یہ نرمالہ کوئی اور تھی!!؟

اِس حالت میں ہونے کے باوجود معیز خان کی روح اِس پر حدتِ عشق کے زیرِ اثر آ رہی تھی۔ در
کی ہر ہر رگ میں حشر برپا کر رہا تھا' لیکن عشق کی وحشتیں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اُس پر بر
بے تاب تھیں۔ عشق اُس پر اتر رہا تھا۔ اُس کے پہلو میں عشق مجسم تھا جس کی پُرحرارت سانسوں کی
اور ہتھیلیوں کا دہکتا لمس اُسے بے قرار کر رہا تھا۔
یہ لمس...... یہ قربتیں...... کچھ نئی سی تھیں۔
''معیز......'' اُس کی بار بار اٹھتی گرتی پلکوں بند ہوتی آنکھوں نے نرمالہ کو بے کل کیا ہوا تھا۔ اُس
قریب آ کر دل اور بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ مکمل طور پر ہوش میں کیوں نہیں آ رہا تھا؟ نرمالہ وحشت ز
تھی۔
''معیز......! ہوش میں آؤ ناں۔''
معیز خان نے ایک پل کو آنکھیں کھولیں تو نرمالہ کی آنکھوں میں عشق کا جنون اتنا تلاطم برپ
ہوئے تھا کہ وہ ساکت رہ گیا۔
''نرمالہ...... معیز کی جان...... میری زندگی...... مجھ سے کبھی دور مت جانا۔'' بند ہوتی پلکوں کے
وہ بہت دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ ابھی وہ بہت نقاہت میں تھا۔
''میں تم سے کبھی دور نہیں جاؤں گی...... کبھی نہیں۔'' اُس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے وہ
سے بولی۔
''ارے...... نرمالہ...... تم یہاں؟'' کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا' تو شناسا آواز پر اُس
کر دیکھا۔
''ارپنا دیدی......!'' اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

(اس دلچسپ ناول کی پانچویں قسط آئندہ ماہ پڑھیے)



وہ جوخود بے اولادی کے طعنے سن کرخوف زدہ تھی خوف زدہ
لوگوں کی جھولیاں بھرنے لگی...... ماسی کریمن کی سچی کہانی......


اُمِ زہرہ


''جب تمہارا زائچہ بن گیا تو اس نجومی نے کیا بتایا؟'' میں نے مارے تجسس کے پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھا اور اپنی ساری توجہ اس کی جانب مبذول کردی۔

''یہی کہ تم بہت نام پیدا کرو گی۔'' وہ کہتے ہی ایک طویل قہقہہ لگا کر چپ ہوگئی۔

''اچھا...... اور کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا کیونکہ اُس کی طرح مجھے بھی یہ بات بے بنیاد سی لگی' بھلا ایک اسکول میں کام کرنے والی ماسی کیا نام پیدا کرے گی۔

''نہیں' نجومی نے بس اتنا ہی بتایا کہ میں ایک دن بہت نام پیدا کروں گی۔'' وہ آہستگی سے ٹیبل پر گلاس اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''او کے......'' میں نے ایک طویل سانس کے ساتھ اُسے دیکھا اور پھر رجسٹر پر نظریں جمالیں۔

چند پیسوں کی خاطر انسان کو جھوٹی باتیں بتا کر
کردیتے ہیں۔'' وہ سسکی۔

''ایسے کیوں کہہ رہی ہو تم' ہوسکتا ہے اس
بات سچ ہوجائے۔'' میں نے اس کو سمجھانا چاہا

''ارے مس آپ بھی مجھے سہانے خو
دکھانے کی کوشش کررہی ہیں جانتی ہیں میں
الف' بے بھی نہیں پڑھی' بچپن میں گھر کے
مانجھنے سے لے کر صفائی ستھرائی اور کپڑ
دھونے کی ساری ذمہ داری میری تھی۔ کی
میری ماں نے میرے بعد چھ بچے اور
کردیے تھے اس لیے کم سنی میں ہی سات
بھائیوں کی میں آدھی ماں بن چکی تھی۔ نجو
بات سننے کے بعد میرے اندر ایک امید جاگ
ہوسکتا ہے شادی کے بعد میرے برے دنو
سورج غروب ہوجائے۔ اور پھر اس سوچ
ساتھ میں خاموشی سے اپنی شادی کا انتظار کر
لگی مگر جانتی ہیں آپ میرے ساتھ کیا ہو

ملامت کرتے ہوئے سے دیکھا۔

''کیا ہوا کریمن۔'' میرا دل بھی پسیج گیا۔

''میرے ابا نے چند روپے کے عوض میرا سودا کر دیا اور یوں میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کی تیسری بیوی بن گئی۔''

''کیا......؟'' میں اس وقت اس کی آنکھوں میں کرب کا اُمڈتا سمندر بخوبی دیکھ رہی تھی۔

''زندگی اور مصیبت زدہ ہوگئی' گھر میں تو کام کاج کے بدلے ماں کا پیار اور کبھی کبھی باپ کی شفقت میسر آجاتی تھی مگر وہاں تو شوہر کی زیادتی اور اس کی دو بیویوں کی خدمت نے مجھے مار ڈالا۔''

''کیوں؟ تم ان کے کام کیوں کرتی تھیں' اول تو ایسی جگہ شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی اور اگر ہو بھی گئی تھی تو یہ تمہارا فرض تھوڑی ہے کہ تم اس

ان کی پہلے سے موجود بیویوں کی خدمت

مجھے ایک پل کے لیے کریمن پر سخت غصہ آیا۔

''یہ اس گھر میں رہنے کے لیے میرے
آخری حربہ تھا۔ ورنہ میرے شوہر نے کہا
تمہیں کہیں اور بیچ دوں گا کیونکہ تم میرے
بے کار ہو۔ ہاں مگر دوسرے کام کے لیے تم
زیادہ اچھا کوئی نہیں ہوسکتا؟'' وہ مکروہ اندا
ہنس رہا تھا اور میں اس کے سامنے کھڑی
رہی تھی۔

''میں سمجھی نہیں۔'' اب کی بار میں اپنی
چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر
ہوئی تھی۔ اب میں اس کے مقابل آگئی۔

''جانتی ہیں مس' اس کا مقصد کیا تھا؟''

اُس نے جواب طلب نظروں سے دیکھا۔



"نہیں کریمن۔" میں نے ہونقوں کی طرح اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھے۔

"شادی کے تین سال تک جب میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو دائی نے میرے شوہر سے صاف کہہ دیا۔ اب چوتھی کی تیاری کرلے یہ عورت بھی بانجھ نکلی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور میری حالت ایسی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

"اوہ خدایا۔" میں سر پر ہاتھ رکھے کرب کے سمندر میں غوطے لگانے لگی۔

"بس پھر میں بہت کچھ سمجھ گئی اور گناہ آلود زندگی کے خوف سے اُس گھر سے بھاگ اٹھی۔ میں نے بھیک مانگ' مانگ کر ٹرینوں کے لمبے لمبے سفر کیے اور آج آپ کی میڈم کی مہربانی سے اس اسکول میں ماسی کا کام کررہی ہوں اور شام ان کے گھر کے کام کاج کرلیتی ہوں یوں چار پیسوں میں زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔"

"تم اندر سے اتنی دکھی ہوگی ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"ارے مس میری مظلومیت کی کہانی سن کر اور مجھ پر ٹوٹنے والے بے پناہ ظلم وستم کا اگر میں نقشہ کھینچوں تو آپ بھی رونے لگیں۔ بس جب کبھی اس نجومی کی بات یاد آجاتی ہے تو میرا دل خراب ہوجاتا ہے۔ میں جس کے بنائے گئے زائچے کے مطابق خود کو اپنے ماحول میں ڈھال نہیں سکی ہمہ وقت مجھ پر اچھے دنوں کی آس کا غلبہ رہتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا مس تو میں آج سمجھوتے کی چادر اوڑھے خاموشی سے وقت گزار رہی ہوتی۔ اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموش ہوجاتی۔ مگر اس نجومی کی بدولت میرے اندر بغاوت نے جنم لے لیا اور یوں میں باغی بن گئی اور پھر وہ جھوٹا نجومی مجھے کہیں ملا بھی نہیں ورنہ اس کے پاس جاتی ضرور اس کو بتاتی کہ دیکھو تمہاری پیش گوئی خدا کے فیصلے کو تبدیل کر نہیں سکی۔" وارننگ بیل کی آ کے ساتھ ہی وہ اپنے خیالات کے حصار سے آگئی۔

"ٹھیک ہے مس' اب آپ بھی تیاری کر چھٹی ہونے والی ہے۔ میں ذرا تمام کر اسٹاف روم میں رکھوا دوں ورنہ میڈم کی ڈا سننا پڑے گی۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہو کلاس روم سے نکل گئی مگر میں اپنی آنکھوں آئے آنسوؤں کو روک نہیں سکی۔

☆......☆......☆

وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ کریمن آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ بھ بھاگ کر اسکول کے کام انجام دیتی نظر آتی جب کبھی وہ فارغ ہوتی تو مجھے اپنی روداد سن لگ جاتی' آج کہنے لگی۔ مس مجھے اپنے گھر و شدت سے یاد آرہے ہیں۔ جانے میرے باپ اور بہن بھائی کس حال میں ہوں۔ سوچتی ہوں اگر آج ان کے ساتھ ہوتی تو ا خیال تو کرتی۔"

"ہاں کریمن یہ بات تو درست ہے تمہیں سے رابطہ کرنا چاہیے۔" میں نے اس کا ح بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مس وہ جو میرا مرد ہے وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اس کے ڈر سے میں واپسی کا ارادہ کردیتی ہوں۔ اب تو اس نے میرے ماں کے بھی کان بھر دیے ہوں گے۔" وہ سسکی۔

"ارے کریمن تم کم سے کم اپنی ماں سے وہ تمہارے لیے کتنی پریشان ہوں اور وہ تمہ راہ تک رہی ہوگی۔"

"ہاں میڈم سے بات کرتی ہوں۔ اگر

مل گئی تو گاؤں جاؤں گی اپنے' کیونکہ کوئی موبائل
نمبر یا گھر کا ایڈریس تو میرے پاس ہے نہیں۔
وہیں جا کر ہی بات بنے گی۔'' وہ پُرسوچ نظروں
سے خلا میں گھورتی کہہ رہی تھی۔

''ہاں کریمن یہ بہتر ہے۔ ویسے چھٹی پر تو
میں بھی جا رہی ہوں۔'' میرے چہرے پر بڑی
دل آویز مسکراہٹ آ چکی تھی۔

''ہاں مس آپ کی اگلے ماہ شادی ہے
ناں؟'' ایک دم ہی کریمن کے چہرے پر بشاشت
آ گئی۔

''کریمن تمہیں ہر پروگرام میں آنا ہے' میڈم
کے ساتھ آ جانا۔'' میں نے اسے پیار سے تنبیہ
کی۔

''جی مس کوشش کروں گی یہ بڑے لوگ جو
ہوتے ہیں یہ چھوٹے لوگوں کو کم تر سمجھتے ہیں اور
ان کو ساتھ رکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔''
اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم خود آ جانا میں تمہیں اپنے گھر کا
ایڈریس سمجھا دوں گی۔'' مجھے حقیقتاً اس کی بات
سے تکلیف پہنچی تھی اور بات وہ سو فیصد درست کہہ
رہی تھی کہ میڈم سے لے کر ٹیچرز اسٹاف تک کوئی
اس سے بلاضرورت بات نہیں کرتا۔

''مس میرے پاس آپ کو دینے کے لیے
کوئی تحفہ تو نہیں ہے لیکن میری دعائیں آپ کے
ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سکھی رکھے۔'' وہ
میرے سر پر ہاتھ رکھتی ہوئی کلاس روم سے نکل
گئی۔

☆......☆......☆

اپنی شادی کے ہنگاموں اور تیاریوں میں'
میں اس قدر محو تھی کہ مجھے کریمن کا خیال تک نہیں
آیا۔ شادی کے فوراً بعد ہی جمیل کی پوسٹنگ نواب
شاہ ہوئی۔ یوں میں کراچی چھوڑ کر نواب
آ گئی۔ نیا شہر' نیا محلہ' نئے لوگ' وقت تھا کہ گز
نہیں رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے جمیل
راضی کیا کہ قریب ہی ایک پرائیویٹ اسکول
مجھے یہاں ٹیچنگ کی اجازت دے دیں۔
جمیل کو میرا ٹیچنگ کرنا ذرا پسند نہیں تھا مگر
میرے اکیلے پن کی وجہ سے راضی ہو گئے
ایک بار پھر چھ ماہ کے قلیل عرصے بعد میں دو
اسکول جانے لگی۔ نئے اسکول کا ماحول
پرانے اسکول سے مختلف تھا لیکن اچھی بات
کہ یہاں کا اسٹاف بہت اچھا تھا۔ مجھے یہاں
کرسچن کام والی کو دیکھ کر اکثر کریمن کی یاد آ
اور پھر وہی سوال میرے ذہن میں گردش کر
رہے کہ جانے کریمن اپنے گاؤں گئی یا نہیں؟

''اسکول میں تو ہر کوئی اسے حقارت کی
سے دیکھتا تھا اب وہ دل کا حال کس سے
ہو گی؟''

پھر میں اپنی ہی سوچوں میں اُلجھ جاتی۔ ل
ایسے کیوں ہوتے ہیں جب خدا نے سار
انسانوں کو تخلیق کیا ہے تو زمیں پر کیوں ہم
تفریق اختیار کر لی ہے۔ جب تخلیق کرنے
مالک ایک ہے تو ہم خود سارے انسانوں
رنگ و نسل' ذات پات میں تفریق کر کے نفرت
باڑیں کیوں بنالی ہیں؟''

ابھی کچھ عرصے پہلے ہی چوکیدار کی تعی
ہوئی ہے۔ بس پورے اسکول میں ہلچل مچ گئ
ابھی آیا نہیں تھا لیکن اس کے نام نے اس
شخصیت کا ایک فریم بنا لیا تھا۔

''ارے موہن نام ہے ہندو ہے۔'' م
نے جیسے ہی اسٹاف روم میں اعلان کیا بس ت
دل تھام کے بیٹھ گئیں' کئی نے تو منہ پر ہاتھ

لیا۔

"تو کیا ہوا وہ بھی تو ہمارے جیسا انسان ہے اس کا بھی حق ہے کام کرنے کا۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔

"میڈم موہن کو کچن میں جانے نہیں دیں' بعد میں کچن پاک کون کرے گا۔"

"میڈم ہم لنچ کا سامان موہن سے نہیں منگوائیں گے۔"

"میڈم اس کے برتن الگ کردیں۔ کل کو غلطی سے ہمارے کپ میں چائے پی لے۔"

جتنی ٹیچرز اتنی باتیں اور پھر بے چارے موہن کی ڈیوٹی دروازہ کھولنے کی رہ گئی اور اس پر بھی یہ حال کہ ٹیچرز دروازے سے اندر اور باہر جاتے ہوئے دروازہ پر ہاتھ لگانے سے کتراتیں' اور اگر کسی کو یہ ضرورت پیش آتی کہ دروازہ اندر سے لاک کرنا ہے تو وہ ٹشو پیپر کی مدد سے کنڈی لگاتی۔ جانے ایسی باتیں کیوں میرے لیے اعصاب شکن ثابت ہوتیں۔ میں سب سے مختلف کیوں ہوں میں اکثر اکیلے میں بیٹھ کر سوچا کرتی۔ جبکہ میرے اسٹاف کی میرے بارے میں یہ رائے تھی کہ میں بے حس ہوں۔ مجھے اپنے اردگرد کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ بس میری اپنی دنیا ہے' جس میں اپنی مرضی کے مطابق میں زندگی گزار رہی ہوں۔

☆......☆......☆

حساس ہونا بھی انسان کو مار دیتا ہے وہ خواہ مخواہ کی سوچوں کے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ میں بھی کل رات سے اُلٹی سیدھی سوچوں میں اُلجھی ہوئی ہوں۔ آج اسکول میں ہوتے ہوئے بھی میں ذہنی طور پر پراگندہ ہوں۔

رات ساس کی کال آئی تھی۔ وہ مجھ سے

خوشخبری کی توقع کررہی تھیں جو کہ ابھی تک تھی
نہیں۔ پہلی بار مجھے ان کی باتوں کی کاٹ نے
دیا تھا۔ نندیں بھی طنزیہ کلام کررہی تھیں' بڑی
کہہ رہی تھی کہ کراچی ہوتی تو اب تک کتنے ڈاک
کو دکھا دیتی۔ جبکہ ساس کا کہنا تھا۔ پلاننگ
چکر میں نہ پڑ جانا۔ پڑھی لکھی ہونے کا مطلب
نہیں کہ ہمارے بیٹے کی نسل کو اپنے ماڈرن کلچ
بھینٹ چڑھادو۔

"اُف......" میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور منمنا
ہوئے میں نے موبائل جمیل کے ہاتھوں میں
دیا گو کہ جمیل نے باقی باتیں سننے اور کرنے
لیے کمرے سے باہر برآمدے کے ایک کو
انتخاب کیا تھا لیکن مجھ پر یہ باتیں پہاڑ کی ط
ٹوٹی تھیں۔

آج تو اسکول میں مس سیما نے بھی سو
کرلیا تھا۔

"نزہت شادی کو کتنا عرصہ بیت گیا؟"

"چھ ماہ......!"

"ارے ابھی تک کوئی خوشخبری نہیں' ک
اولاد کے معاملے میں دیر مت کرنا یہ مرد بڑے
عجیب ہوتے ہیں دوسری کرنے میں دیر نہ
لگاتے ویسے تو ان کو ٹیسٹ چیلنج کرنا ہوتا ہے لیک
وجہ اولاد نہ ہونے کا بہانہ بن جاتی ہے۔"

"ہاں بھئی سیما بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے
مس آسیہ نے اپنا موقف بیان کیا۔

"کیا؟" میں مس آسیہ کو غور سے دیکھتی
گئی۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر قسمت
اچھا شوہر مل گیا ہے تو بچوں کی بیڑیاں اُس
پیروں میں ڈالنے میں دیر نہ لگاؤ۔"

"لیکن میں نے کسی پلاننگ کے بارے

میں کوئی کمزوری تو نہیں آ گئی...... میں نے آہستگی سے اپنے ناخن دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

''ارے میرے ساتھ کل ہی اسپتال چلو...... بڑی اچھی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ تمہارا کل ہی چیک اپ کروا دیتی ہوں۔'' مس آسیہ نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا......؟'' مجھے اگلے ہی پل کچھ ڈھارس ہوئی۔

''بس کل ذہنی طور پر تیار ہو کر آنا ہم اسکول سے چلیں گے۔ میں رات ہی ان سے فون پر اپائنٹمنٹ لے لوں گی۔ میرے تو پانچوں بچے انہی کے ہاتھ کے ہیں۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفا دی ہے۔'' وہ میرے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کر رہی تھیں لیکن سچ تو یہ تھا کہ ان کی باتیں مجھے مزید اُلجھا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

اگلے تین دن بعد ہی میرے ہاتھ میں مکمل رپورٹس تھیں' ہر طرح کے ٹیسٹ احتیاط کے طور پر کروا لیے تھے اور سارے ہی کلیئر تھے۔ ڈاکٹرز نے ملٹی وٹامنز کی ٹیبلیٹس لکھ دی تھیں۔ اور مسکراتے ہوئے کہا تھا قدرت کے فیصلے ہیں صبر اور انتظار کرو۔

مگر گزرتے وقت کے ساتھ یہ صبر اور انتظار میری ساس اور نندوں سے نہیں ہو رہا تھا۔ اب تو انہوں نے جمیل کے کان بھی بھرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ بھی ساری بات جانتے ہوئے مجھے ہی موردالزام ٹھہراتے۔

''یار میرے ایک دوست نے تو شادی کے تیسرے ہفتے ہی میرے کان میں بتا دیا تھا کہ ان کی بیوی امید سے ہے۔ اور پھر وہ مہینے اور دن

غزل

جاں سے اپنی گزر گیا ہوتا
تم نہ ملتے تو مر گیا ہوتا

ہوں سلامت تبھی تو ہوں یکجا
ٹوٹتا تو بکھر گیا ہوتا

وہ تو مقتل میں سوگ تھا ورنہ
آج اپنا بھی سر گیا ہوتا

انتہا بے رخی کی کرنے میں
کاش میں آپ پر گیا ہوتا

ناصحوں نے ذرا سی غفلت کی
ورنہ میں بھی سدھر گیا ہوتا

درد ہوں اس لیے تو اٹھتا ہوں
زخم ہوتا تو بھر گیا ہوتا

فرخ اظہار صدیقی

لگنے لگا تھا۔ جب تمہارے سارے ٹیسٹ کلیئر ہیں تو پھر کیا بات ہے؟''

کبھی کہتے جانے یہاں کے لیب ٹھیک ہیں بھی یا نہیں۔ میں کل ہی دوستوں سے مشورہ کرتا ہوں کہ کوئی اچھے لیب اور گائنی ڈاکٹر کا پتا بتائے۔'' اور میں سر ہلا کر خاموشی پر اکتفا کر لیتی جب اولاد قدرت کی عطا ہے تو پھر میں خود کو کیوں چور سا محسوس کر رہی ہوں۔'' میں اُلجھ جاتی' مگر اس اُلجھن کی سلجھن کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ اسی کشمکش میں چار سال گزر گئے۔ مجھے لگتا تھا میں ذہنی مریضہ بن گئی ہوں محفلوں میں جانے سے کترانے لگی تھی۔ اسکول میں بھی اولاد سے متعلق باتیں کرنے میں احتیاط کرتی۔ لیکن آج تو حد ہوگئی ساس صاحبہ نے انتہائی صاف گو اور غضبناک لہجے میں کہہ دیا اگر اس سال اولاد کی خوشخبری نہیں ملی تو ہم جمیل کے لیے دوسری لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دیں گے۔''

''میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی خیال کے پردے پر اچانک کریمن کا چہرہ بڑا واضح ہوتا چلا گیا۔ آج مجھے شدت سے کریمن کے دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ اس پر کیا بیتی ہوگی' نہیں میں کریمن کی طرح نہیں بن سکتی۔ مجھے کچھ تو کرنا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے خوف کے پردے سرکاتی میں اپنا اعتماد بحال کر رہی تھی۔

مس آسیہ نے کہا تھا۔ ''نزہت ایک آخری کوشش روحانی علاج ہے وہ کروالو۔ اگر اس سے فائدہ نہیں ہوا تو پھر اپنے شوہر کا علاج کروانا۔'' دبے الفاظ میں وہ کہتی ہوئی کلاس روم سے نکل گئیں تھیں۔

☆......☆......☆

''مس آسیہ۔'' اگلے دن پریڈ آف ہوتے ہی میں اُن کے پیچھے بھاگی۔

''ہاں کہو نزہت۔'' وہ رک گئیں۔

''وہ جو آپ ایک روحانی شخصیت کے با میں بتا رہی تھیں۔ کیا ہم ان کے پاس چل ہیں۔''

''ارے نزہت کیوں نہیں میں تو کب سے رہی ہوں کہ تم اُن کو دکھا دو۔ جانتی ہو میری نن اوپر تلے چار بیٹیاں تھیں۔ ساس نندوں اور نے صرف بیٹے کی لالچ میں اس کو طلاق د فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر وہ جو روحانی شخصیت ہیں نا کے علاج کی بدولت آج اُن کے آنگن می خوبصورت بیٹا ہے۔''

''واقعی۔'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ارے بڑی اونچی اور پہنچی ہوئی ہیں۔ تم ک میرے ساتھ چلو کو کہ نمبر اُن کا مشکل سے ملتا۔ وقت بھی زیادہ درکار ہے لیکن سچ کہوں اُن کے میں شفا ہے خاص کر بے اولاد جوڑے تو اپنی گو بھر کے جاتے ہیں اُن کے آستانے سے۔''

''آپ پلیز مجھے ٹائمنگ بتائیں۔ میں کل آج ہی ملنا چاہوں گی۔'' میرے لیے ام آخری کرن یہ ہی روحانی شخصیت رہ گئی تھیں۔

''ٹھیک ہے شام چھ بجے نکلیں گے مغر اذان کے بعد ہی وہ مریضوں کو دیکھتی ہیں آسیہ نے کہا اور پھر وہ کلاس لینے چلی گئیں او شام تک کھانا بنانے کی پلاننگ کرنے لگی۔

☆......☆......☆

''بس سمجھو دکھی دلوں کا آخری سہار ہیں۔'' مس آسیہ نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے

''اُن کا کیا کوئی نام نہیں ہے۔'' میں نے دانستہ میں سوال کیا۔

''کوئی انہیں دعا کرنے والی خالہ کہتا

کوئی دم کرنے والی بی بی' کوئی روحانی شخصیت تو کوئی اللہ والی آپا......"

"اچھا ان کے اتنے نام ہیں۔" میں نے تعجب سے ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ انتظار گاہ میں عجیب ہی نظارہ تھا۔ ماڈرن طبقے سے لے کر متوسط اور غریب طبقہ ایک ہی جگہ تشریف فرما تھا۔ ریسپشن پر ایک خوبصورت سی لڑکی جو ماڈل زیادہ لگ رہی تھی وہ سب کو نمبر دے رہی تھی۔

"ارے یہ تو کافی ماڈرن آستانہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے مس آسیہ کو چھیڑا۔

"دیوار پر آویزاں فریم سے لے کر قالین اور فرنیچر تک سب کچھ جدید تھا۔ بڑے سے ہال میں اے سی اور ڈسپنسر کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ تاکہ مہمانوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ صوفے اتنے آرام دہ تھے کہ طویل انتظار کی صورت میں اُن پر سویا بھی جا سکے۔

"کتنی دیر اور لگے گی' ہم تو اپائنمنٹ لے کر آئے ہیں۔"

سونے کے زیورات سے لدی ہوئی یہ خاتون اپنی نازک سی بہو کے ساتھ کاؤنٹر پر کھڑی تھیں۔

"ابھی تو آپ کی رپورٹس میرے پاس ہیں۔ روحانی آپا کے پاس لندن سے کال آئی ہوئی ہے' ذرا ایمرجنسی ہے' کالے جادو کا توڑ بتا رہی ہیں وہ۔ جیسے ہی فری ہوتی ہیں۔ میں آپ کی رپورٹس پہنچاتی ہوں' جب تک آپ ویٹ کیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھلاتی ہوئی میرے قریب ہی کرسی پر براجمان ہو گئیں۔ ریسپشنسٹ نے بیل بجائی اور پھر ملازم کو انہیں پانی پلانے کا کہا۔

"واہ جی......" اب تو میرا اشتیاق بھی ان روحانی شخصیت سے ملنے کا اور بھی بڑھ گیا تھا۔

انتظار طویل ہو چکا تھا لوگ اُکتا کر ٹہلنے لگے تھے۔ کوئی پہلو بدل رہا تھا تو کوئی جمائی لے رہ...

اچانک سیڑھیوں سے دھم دھم کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ ساڑھی کا پلو درست ک... باوقار' رعب دار خاتون نیچے اتریں بڑے ہی... سے بنایا ہوا جوڑا' دونوں ہاتھوں میں سو... چوڑیاں' کانوں میں سونے کے آویزے' گ... جھولتا لاکٹ' گولڈن چشمے کا فریم ناک پر د... کرتی وہ سیکریٹری کے ہاتھ سے فائل لے... تھیں۔

"اللہ والی آپا......میری بہو کی گود تو... ہو جائے گی۔" دونوں ساس بہو بے تابی سے ا... جانب بڑھے۔

"چالیس چھوارے اور دم کیا ہوا پانی تو... فوراً دے رہی ہوں۔ باقی وظائف کا چلہ می... کاٹوں گی۔ اللہ کرم کرے گا اور بہت جلد خوشخبر... جائے گی۔" اللہ والی آپا اور جانے کیا کیا کہ... تھیں۔ مگر میں جو سن بیٹھی تھی۔ مس آسیہ کا... مضبوطی سے تھام کے کھڑی ہو گئی۔

"ارے اب تو روحانی آپا آ گئی ہیں۔ ا... نمبر جلدی آئے گا۔ ان کو اپنے روم میں ج... دو۔" مس آسیہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"ابھی آئی۔" میں مزید کچھ کہے بنا تیزی... باہر آ گئی۔ میرا سانس تیزی سے پھول رہا تھا... کہ بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے قریبی دیوار کا سہ... اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

سلیقے سے بندھا جوڑا۔ شوخ رنگ کی سا... سونے کے زیورات' پرفیوم کی اٹھتی خوشبو' سب... انداز تو نئے تھے۔ مگر نہ بدلنے والی آواز کے س... ماسی کریمن وہی پرانی تھیں۔ یقیناً نجومی نے ا... زائچہ بالکل درست نکالا تھا۔

☆☆......☆☆



> وہ بدصورت' حقیر اور انتہائی کریہہ چہرہ تھا اس کی محبوبہ اس کو دنیا کا حسین ترین انسان سمجھتی تھی اور اس کو دیکھ کر یوں شرما کر چھپ جاتی جیسے چاند بدلیوں میں......

رفعت محمود

میں اس دنیا کا سب سے بدقسمت انسان ہوں' میرا قد نہایت ہی چھوٹا ہے۔ یعنی پستہ قامت ہوں میرا رنگ کوئلے کی طرح کالا اور میرے چہرے اور جسم کے اعضاء اور نقوش انتہائی غیر مناسب اور بے ڈھنگے ہیں اس بدصورت سراپا پر یہ اتنا بڑا سر تو گویا تاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے چہرے پر دو گول گول اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں ہیں۔ پچکی ہوئی ناک ہے منہ اور لب مینڈک نما ہیں۔ تنگ پیشانی اور اطراف میں بڑے بڑے کان ہیں۔ ان سب کے علاوہ میرا چہرہ چیچک کے بڑے بڑے داغوں اور گڑھوں سے بھرا ہوا ہے (جو مجھے عمر کے بارہویں سال میں ہوئی تھی) بچپن میں ہی گرنے سے میں دائیں ٹانگ مفلوج ہوگئی سو اب میں لنگڑا کر چلتا ہوں۔

مختصر یہ کہ میں کراہیت انگیز بدصورتی کا پہاڑ ہوں کچھ کا کہنا ہے کہ مجھ پر پہلی نظر میں ہی کسی کالے بندر کا گمان ہوتا ہے مگر بندر کو دیکھ کر یہ

ضروری تو نہیں کہ لوگ ہنسیں.....البتہ مجھے د وہ بہرصورت ہنس دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں عل کہ میں بھی ان ہی میں سے ہوں' وہ سب جن کے پاس آنکھیں ہیں مجھے دیکھتے ہی لگتے ہیں۔ کچھ کے تو قہقہے بھی چھوٹ جاتے وہ اس غیر مہذب حرکت کے جواز کے طور پر کو میرے بارے میں کئی مزیدار کہانیاں سنا ہیں۔ یہ کہانیاں میرے کانوں تک بھی پہنچ ہیں اور میں ان ساری وجوہات سے باخبر ہوں۔ جو انہیں گدھوں جیسی بے ہنگم آواز ہنسنے پر مجبور کرتی ہیں۔

☆......☆......☆

ان کی ہنسی کی ایک وجہ یہ ہے کہ میری ایک محبوبہ تھی۔ مزید براں میں نے اس سے ش بھی کی' میں کیونکہ عاشق اور پھر شوہر بنا یہی کہانی ہے جو ان کی نظروں میں عجیب و غریب مضحکہ خیز ہے۔ چنانچہ مجھے دیکھتے ہی ان کی چھوٹ جاتی ہے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں ک

بھی ہو...... آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ اسی خدا کی مخلوق ہوں جس نے انہیں تخلیق کیا ہے۔

ایک بار جب میں سڑک پر جا رہا تھا تو میں نے ایک شخص کو اپنے ساتھی سے یہ کہتے سنا۔

''اس شخص کو دیکھ کر مجھے نوٹرے ڈیم کا کبڑا یاد آ جاتا ہے۔'' میں اگرچہ کبڑا نہیں ہوں' اس کے باوجود میں کبھی اپنی اہانت کے خلاف احتجاج نہیں کرتا' اب یہ فیصلہ کرنا تو یقیناً میرے اختیار میں نہیں کہ مجھے دیکھ کر لوگوں کو کیا اور کون یاد آنا چاہیے؟ ان ساری اذیت ناک باتوں کے باوجود ان کی ہنسی نے مجھے اپنے بارے میں بہت سی باتوں سے باخبر کیا ہے۔ اپنی ذات کے شناخت کے اس عمل میں یقیناً مجھے خارجی عوامل نے زیادہ مدد دی ہے۔

سڑکوں پر آتے جاتے جب میری نظر شوخ رنگ کپڑوں میں لپٹی خوبصورت دوشیزاؤں پڑتی ہے تو میں آپ ہی آپ خود میں سمٹ جا ہوں کیونکہ ان کا حسن جذب کرنے کے قابل ہے۔ مگر مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے اپنا منہ دوس طرف موڑ لیتی ہیں اور اس وقت جب مجھے غ حسن کے بل بوتے پر ایک اپنے جیسے انسان ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک سے بھی محر کر دیا جاتا ہے اور انسان ہونے کی حیثیت میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے تو پھر اپنی قابلِ رحم اور حسرت ناک کیفیت کا بھر احساس ہوتا ہے۔ خدا نے مجھے بھی حسن سے اٹھانے کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ مگر میر معاملے میں آپ اسے ناقابل معافی گناہ کیو گردانتے ہیں؟ سچی بات یہ ہے کہ یہ دنیا ایسے لوگوں کے مابین دیکھنا ہی نہیں چاہتی۔



☆......☆......☆

میں ابھی اس دنیا میں نہیں آیا تھا کہ میرے باپ کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہوش سنبھالنے پر میں نے گھر پر صرف اپنی بوڑھی ماں ہی کو دیکھا۔ مگر وہ تو خاصی خوبصورت تھی اور لوگ کہتے ہیں کہ میرا باپ بھی بدصورت نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری بدصورتی موورثی نہیں ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون ہستی ہے جو میری اس کراہیت انگیز اور دہشت ناک بدصورتی کی ذمہ دار ہے؟

''میری ماں ؟ میرا باپ؟ نہیں میں اُن کو موردالزام نہیں ٹھہراتا' شاید انہیں اولاد کی خواہش ہی نہ تھی۔ بہرحال میری ماں اور میں نے کوشش کی کہ گھر کی جڑیں مضبوط بنائیں۔ نہ تو میں اپنی محرومیوں سے مرجھایا اور نہ ہی ماں نے ہمت ہاری۔ ہم چاہتے تھے کہ گھر کا پودا پھلے پھولے' اس کو نئی شاخیں پتے پھول اور پھل لگیں' کیا ہماری یہ خواہش غیر فطری تھی؟

اس خواہش کے پیش نظر میری ماں نے مجھ سے پوچھا۔

''بیٹے اب اس گھر میں دلہن آ ہی جانی چاہیے۔'' ماں کے اس سوال کو سن کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ میں تو عرصہ سے یہ چاہتا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

''ہاں...... ماں...... اب یہ کام بھی ہوجانا چاہیے۔'' ماں نے اسی دن سے ہمسایوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ ماں جب بھی کہیں سے لوٹتی تو اُس کے چہرے پر دکھ کی لکیریں کچھ اور گہری نظر آتیں۔ جنہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوجاتا...... میں ہر روز اُس سے پوچھتا۔

''ماں جی کیا بنا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' ہر روز اس کا یہی جوا
ہوتا' جواب دیتے ہوئے یوں لگتا جیسے وہ دکھ
درد سے کراہ رہی ہو۔

بالآ کر اس نے میرے لیے رشتے کی تلا
میں باہر جانا چھوڑ دیا۔ محلہ میں بات پھیل گئی
کہ میری ماں اپنے لیے بہو تلاش کر رہی
اس لیے اب وہ لوگ بھی مجھ پر ہنسنے لگے جو
سے پہلے مجھ پر کبھی نہ ہنستے تھے۔ کئی مجھ
ہمدردی کرتے ہوئے کہتے۔

''بے چارا...... اس کی ماں نے اس کے
دلہن تلاش کرنے کی کتنی کوشش کی۔ مگر نا
رہی...... اے پروردگار تو اس جیسے بے چار
انسان پیدا ہی کیوں کرتا ہے؟''

ماں کی ناکامی کے بعد میں نے اپنے چہ
اور لباس پر توجہ دینی شروع کر دی کہ شاید
طرح کوئی لڑکی میری طرف متوجہ ہو جائے۔
اچھا اور صاف ستھرا لباس پہننے لگا۔ میں
چہرے کی آرائش کے لیے کریمیں' لوشن
خوشبویات استعمال کرنی شروع کر دیں۔ مگر
یہ ساری کوششیں بھی میرے من کی مراد پور
کر سکیں۔ لوگوں کی ہنسی مزید بڑھنے لگی جیسے
مزید بھدا اور بدصورت ہو رہا ہوں۔ میں
اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا اور یہ بات عقل
آ گئی کہ نہانے سے میں خود کو راج ہنس میں تب
نہیں کر سکتا۔ بہو کے حصول کے لیے ما
ساری کوششیں بنا کام ہو چکی تھیں۔ بھلا
عورت ایک بندر نما انسان کی بیوی بننا پسند کر
ماں نے اس ناکامی کے غم کو سینے سے لگا لیا
کی قوت مدافعت بھی جواب دے گئی اور ا
صحت دن بدن گرتی گئی۔ کئی بیماریوں نے

گھیر لیا اور پھر میری وہ ماں جو میرے تپتے دل میں اپنی روح کی چاہت سے ٹھنڈک ڈالتی تھی۔ میری پیاری ماں جس نے مجھے محبت سے عاری اس دنیا کے ساتھ اپنی محبت کے سنہری تار سے باندھے رکھا تھا۔ ماں جس کے پیار کے سہارے میں زندہ تھا' اور جو میری کراہیت انگیز بدصورتی میں بھی کسی قسم کا حسن تلاش کر لیا کرتی تھی۔ وہ ماں مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر اگلے جہاں سدھار گئی۔ میں نے اس کی جدائی میں بہت آنسو بہائے تھے۔ مگر میرے آنسو اور آہیں میری ماں کو واپس نہ لا سکے۔

☆......☆......☆

کچھ مہینوں بعد میری زندگی میں اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ میری زندگی ایک نئی جہت سے روشناس ہوئی ماں کی ٹوٹی ہوئی آس جو مجھ میں حلول کر چکی تھی۔ ایک روز پھر سے بیدار ہو گئی۔ میری بے رنگ' پھیکی اور اذیت ناک زندگی میں مجھے ایک محبوبہ مل گئی۔ جس نے میری دکھ بھری کہانی کو پیار کی کہانی بنا دیا۔ میرے اندر کے انسانی جذبوں کو رعنائی بخش دی۔ بلاشبہ وہ بہت ہی عظیم تھی کہ اس نے مجھ سے پیار بھی کیا میری بدصورت کو نظر انداز کر کے مجھ سے شادی بھی کر لی' اس نے مجھ پر ہنسنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا اور ان کے ذہنوں کو مفلوج کر دیا۔

☆......☆......☆

اس روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی بدنصیبی کا رونا رو رہا تھا کہ اچانک میں نے گھر کی دہلیز کی سیڑھیوں پر زور زور سے لاٹھی مارنے کی 'ٹھک ٹھک' سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"خدا کے نام پر کچھ دے دو۔"

وہ ایک بھکارن لڑکی تھی۔

"جناب میں اندھی ہوں۔" وہ کہہ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر اس کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ واقعی اندھی تھی وہ ایک در انگیز منظر تھا۔ میں اس وقت اپنی حالت کو بھول گ اور سوچا......

"بے چاری...... نوجوان لڑکی ہے...... مگ بغیر آنکھوں کے ایک ایسی زندگی کی مالک جو سنے اور چھو کر محسوس کرنے تک محدود ہے۔"

وہ اتنی زیادہ خوبصورت تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی سینکڑوں میں ایک تھی اس کے متناسب اور صحت مند جسم میں جوانی کا رس اور خمار تھا۔

"بے چاری......" میں نے کہا اور پھر ا میرے دل کے نرم گوشوں میں اتر گئی۔

"اندر آؤ اور بیٹھ جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔ وہ راستہ ٹٹول کر آگے بڑھنے لگی یہ دیکھ کر میں اٹھا اور اسے ہاتھ کا سہارا دے کر اندر لے آیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں کس نوجوان اور نوخیز لڑکی کو چھو رہا تھا۔ اس کے نرم نازک ہاتھ کا لمس کر کے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور میرے جذبات انتہا کو چھو لگے۔ میں نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا آنکھوں کی بے نوری کے باوجود اس کے چہر پر تازگی اور رعنائی تھی۔ اس کے سینے کی اٹھان مج مدہوش کرنے لگی اور اس سے پہلے کہ میں مزید سوچتا' میں یوں کانپنے لگا جیسے یکدم کوئی برقیلی میرے جسم کے گرد لپٹ گئی ہو۔ میرے لب خش ہو گئے اور میری سانسیں تیز ہو گئیں۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔" میں نے اُسے برآمد میں ایک صاحب جگہ پر بٹھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو محسوس کیا ہوگا۔

نے اُسے کچھ کھانے کو بھی دیا اور ایک دس روپے کا نوٹ بھی...... وہ خوش ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام شینا ہے اور وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ شہر میں ایک بہت بڑی فیکٹری کے پیچھے گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی میں رہتی ہے۔ اب وہ جانے کے لیے اٹھی۔ تو میں نے اسے دوبارہ آنے کو کہا اس نے وعدہ کیا اور چلی گئی۔

شینا اب اکثر آنے لگی اور پھر اس کا میرے یہاں آنا ایک معمول بن گیا ہم ہر قسم کے موضوعات اور چیزوں پر گفتگو کرتے تھے اس سے باتیں کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا اور زندگی کے بوجھل لمحے اب میری جانب خوشیاں منتقل کرنے لگے۔ شینا کی آنکھیں اگر ان میں روشنی ہوتی تو وہ اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتیں...... عورت کی آنکھیں ہی تو مرد کو اس کا دیوانہ بناتی ہیں...... میرے پیاسے دل کی اپنی خواہشات تھیں۔ کاش شینا کی آنکھیں بینائی سے محروم نہ ہوتیں۔ اگر وہ دیکھ سکتی تو شاید وہ بھکارن نہ ہوتی اور اگر وہ بھکارن ہوتی بھی تو یقیناً وہ مجھ سے خیرات کے سوا اور کوئی چیز قبول نہ کرتی بلکہ وہ مجھ سے نفرت کرتی دوسرے لوگوں کی طرح مجھ پر ہنستی، اس کی آنکھیں اسے ہرگز یہ اجازت نہ دیتیں کہ وہ ہر روز میرے پاس آئے اور اپنے دل کی باتیں کرے۔

لوگوں کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا تھا مگر کسی نے بھی ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کی۔ بندر نما انسان نہونے کی بدولت میں تو پہلے ہی ان کے مذاق کا مستقل نشانہ تھا۔ اب ایک اندھی بھکارن سے محبت کی کہانی سے ان کے پاس ہنسنے کا مزید سامان آ گیا۔ وہ بدہیتی اور بے نوری کی یکجائی سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس انوکھے اتحاد پر ہر کوئی مسکرا رہا تھا۔

ایک روز میں نے شینا سے پوچھا۔

"میرے بارے میں تمہاری کیا ہے؟" جواب میں وہ صرف مسکرا دی ا شرمیلی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کر ڈالا۔

"شینا بولو ناں......" میں نے اصرار کیا

"کیا کبھی میں نے یہ کہا ہے کہ تم بر ہو۔" اس نے خلوص بھرے انداز میں ج دیا۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور بلا ضر پوچھ بیٹھا۔

"شینا...... تم مجھ سے پیار کرتی ہو ناں؟

اس نے حیا سے گردن جھکا لی اور زبان کچھ نہ کہا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ زن سارا حسن اور رعنائی ان لمحوں میں سمٹ ہیں۔

وہ اس اقرار کے بعد جلد ہی چلی گئی...... کار میرا شمار بھی ان مردوں میں ہونے لگا۔ ج کوئی محبوبہ ہوتی ہے۔ اس بھری دنیا میں اب میرا بھی تھا...... میری بے رنگ اور پھیکی میں اب شیرینی اور قوس و قزح کے رنگ بکھ محسوس ہونے لگے۔ کیا یہ میری خوش قسمتی ن پھر خیال آیا کہ وہ لوگ جو مجھ پر ہنستے ہیں، میرے حاسد ہیں اگر وہ میری بدصورتی بارے میں شینا کو بتا کر ورغلانے لگے تو ہو گا؟ کہیں انہوں نے یہ حرکت کر ہی نہ دی کون جانے؟

مگر شینا کو کوئی کیونکر خوبصورتی اور بدص کا فرق سمجھا سکتا ہے۔ جبکہ وہ تو دن اور را بھی خود تمیز نہیں کر سکتی اس نے مجھے بتایا ہے پیدائشی اندھی ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بدقسمتی ہے مگر وہ پھر بھی اس زندگی سے مطمئن

☆......☆......☆

اگلے روز حسب معمول شینا آگئی میں سوچنے لگا کہ ہماری شادی کیونکر ہوگی؟ مجھے یہ کام ناممکن لگ رہا تھا کیونکہ ہم دونوں کا مذہب ایک نہ تھا وہ ہندو اور میں مسلمان...... کسی نے بھی اس معاملے میں ہمارا ساتھ نہیں دینا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ شینا کے سوائے کوئی بھی عورت مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہوسکتی تھی۔ پھر بھی میں نے شینا سے پوچھا۔

''مجھ سے شادی کروگی؟'' یہ سن کر وہ ایک دم چپ ہوگئی یقیناً میرے مسلمان ہونے نے اس کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو...... بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے حیرت اور خوف سے پوچھا۔

''شینا کیا یہ بات کافی نہیں کہ ہم دونوں انسان ہیں اور خدا نے خود تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔ ذات پات اور دین دھرم کی دیواریں تو انسان ہی نے بنائی ہیں۔ انہیں گرانا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور پھر یہ کوئی گناہ بھی تو نہیں ہوگا۔'' میں نے دلائل دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ خاموش تھی۔ اس کی خاموشی مجھے معنی خیز لگنے لگی تو میں پھر بولا۔

''بولو شینا' میں تمہیں تحفظ دینا چاہتا ہوں' میں تمہاری آنکھیں بن کر زندگی بھر تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ تم میرا ساتھ دو گی' تم میری خوشی اور خواہش کا احترام کروگی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' شینا بولی۔

اس نے بالآخر میری چاہت کا بھرم رکھ لیا۔ وہ چند لمحوں تک شرماتی رہی اور پھر بتانے لگی۔ میں نے لوگوں کو اپنے بارے میں بڑی حقارت

کے پاس سے گزروں تو وہ کہتے ہیں۔

''وہ دیکھو...... بندر نما انسان کی داشتہ جار ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق تم حسن سے عار ہو۔''

''مگر تم میرے بارے میں کیا محسوس کر ہو؟ تم نے مجھے کیسا انسان پایا ہے؟''

''میں اس حسن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ جو وہ آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔ میں نے تو کبھی بندر دیکھا ہی نہیں۔ اس لیے مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر وہ یہ بھی کہیں کہ دنیا کے حسین ترین انسان ہو۔ تب بھی میر احساس سے مختلف نہ ہوتا۔ میں نے تو اس دنیا دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں حسن او بدصورتی کو دل سے دیکھتی ہوں۔ تم مسلمان ہو او میں ہندو' اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو مجھے بھ نہیں' میں سوچتی ہوں اس دنیا میں کوئی بھی مجھ پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہ گا لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں...... مگر گداگری کے پیچھے بہت لیکن ہے...... میں پاک دامن نہیں رہی ہو میری عصمت کی چادر پر اب کئی دھبے لگے ہو ہیں...... اندھی ہونے کے باوجود میں محبت پیاسی تھی۔ میرا خالی کشکول دن بھر کی گداگری باوجود خالی رہتا اور میرے اور میری ماں اُداس چہروں پر ہنستا تھا۔ اس نے رات اندھیروں میں مجھے مردوں کی آغوش میں دھک تم خود ہی سوچو بھلا ایک نوجوان لڑکی کو خدا ا بھگوان کے نام پر کوئی بھیک دیتا ہے؟ پہلی ہاں پہلی بار...... جب تم مجھے اپنے گھر کے ا

[illegible] بات کی تہ تم بھی
مجھ سے بھیک کے عوض وہی طلب کرو گے جو ایک مرد کسی نوجوان اندھی اور مجبور بھکارن سے مانگ سکتا ہے۔ مگر تم نے تو ایسا نہ کیا...... تم چاہتے تو میرا جسم پامال کر سکتے تھے...... مگر تم نے میری روح کے اندر اترنے کی کوشش کی...... یہی وجہ ہے کہ میری نظر میں صرف تم ہی انسان ہو...... تم ہی عزت کے مستحق ہو...... میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں سچی اور پاک محبت......''

پھر میں نے ایک اعتماد سے کہا۔

''شینا! تم نے جو کچھ سنایا ہے وہ انسانی خود غرضی' ہوس اور کسی معذور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کہانی ہے۔ مگر میرے لیے اب یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی' میں اسے بھول جاؤں گا...... وہ وقت اب ماضی بن چکا' تم بھی اسے بھول جاؤ' اب دنیا میں کوئی بھی تمہیں لوٹ کا مال نہیں سمجھے گا' کوئی تمہیں بے بس نہیں کر سکے گا۔''

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی' گویا وہ اپنی خوشی اور رضامندی کا اظہار کر رہی ہو۔

☆......☆......☆

چند ہی دن بعد وہ بات ہو گئی' جس نے محلہ میں ہیجان پھیلا دیا یہ بات ہنگامہ خیز نہ تھی کہ کسی خدائی فوجدار کی موجودگی اور کسی اجازت یا حمایت کے بغیر ہی میں اور شینا ایک ہو گئے۔ ہماری شادی کا سن کر لوگوں کے قہقہے اور بھی بلند ہو گئے۔ شینا کی ماں کو بھی میں اپنے گھر لے آیا۔ سماج کے خود ساختہ ٹھیکیدار ہم کو شک بھری نظروں سے گھورتے' مگر اب ہمیں کسی کی پروا نہ رہی' ہم ایک دوسرے سے یہی کہتے کہ......

''یہ احمق لوگ ہیں ان کو ہنسنے دو۔''

☆......☆......☆

ہماری ازدواجی زندگی نہایت ہی [illegible] اور خوشگوار گزرنے لگی۔ ہم ایک دوسر[illegible] بہت خوش تھے۔ ہمارے دامن میں خو[illegible] خوشیاں تھیں۔ پلک جھپکتے ایک سال گزر[illegible] ماں بننے والی تھی' ہم دونوں کو اب بدص[illegible] اندھے پن کی کوئی پروا نہیں تھی۔ آ[illegible] بچے کے بارے میں بھی لوگ طرح ط[illegible] باتیں کرتے تھے۔ مگر میں اُن سے بے[illegible] سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ خوشیاں جن کی [illegible] نے توقع ہی نہ کی تھی۔ اب وہ میری ز[illegible] رنگ بھر رہی تھیں۔ میں پروردگار کا شکر گز[illegible] اس نے میرا دامن مسرت کے خزانوں [illegible] ہے۔

☆......☆......☆

شینا بچے کی پیدائش سے دو ماہ پہلے بی[illegible] تو میں ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔ اس نے شینا ک[illegible] کیا اور کہنے لگا۔

'' گھبرانے کی ضرورت نہیں...... [illegible] بیماری ہے...... جلد ٹھیک ہو جائے گی۔''

اس نے چیک اپ کے دوران پوچھا [illegible]

''کیا شینا پیدائش اندھی ہے؟''

جب میں نے اسے بتایا کہ یہ پیدائش[illegible] ہے تو اس نے ایک بار پھر شینا کی آنکھو[illegible] معائنہ کیا اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''میں آپریشن کے ذریعے اس کی بینا[illegible] کر سکتا ہوں' مگر ابھی نہیں بچے کی پیدائش [illegible] ماہ بعد جب اس کی صحت بحال ہو جائے [illegible] میرے پاس لے آنا' میں اس کا آپریشن ک[illegible] اور پھر یہ دنیا دیکھ سکے گی۔''

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا۔ مگر اس کے الف[illegible] سینہ چھلنی کر گئے' مجھے یوں لگا جیسے میری خو[illegible]

تاج کی زینت یوں ہو جائے گا شینا کی بینائی بحال ہو گئی تو یہ مجھے دیکھ کر کانپ اٹھے گی۔ میں جسے وہ دل کی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے اور محبت بھی کرتی ہے۔ بینائی بحال ہونے کے بعد وہ جب مجھے پہلی مرتبہ دیکھے گی۔ تو اس کے خوابوں کا محل ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کیا اس کے بعد بھی وہ مجھ سے محبت کرتی رہے گی؟''

میں چیخ کر ڈاکٹر کو کہنا چاہتا تھا کہ شینا کو اب آنکھوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر میں ایسا نہ کہہ سکا۔ میں نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شینا' ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرنے کے بعد تم دیکھنے کے قابل ہو جاؤ گی۔''

شینا یہ جان کر بہت ہی خوش ہوئی' بھلا اس سے بڑھ کر اس کی خوشی اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی تھی کہ وہ جب پہلی بار دنیا کو دیکھے گی تو اُسے یوں لگے گا جیسے اُس نے آج ہی نیا جنم لیا ہو۔' وہ کہنے لگی۔

''اگر مجھے بینائی مل گئی تو کتنا مزہ آئے گا' کیا تم بھی اتنے ہی خوش ہو گئے جتنی کہ میں؟ میں جب تمہیں دیکھوں گی تو اس وقت تم مجھ سے اور بھی زیادہ پیار کرو گے۔''

''ہاں...... ہاں...... میں تم سے اور بھی زیادہ پیار کروں گا۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

شینا بہت ہی پُرسکون اور خوش ہو گئی اور باقاعدگی سے دوا کھانے لگی۔ مگر میرے اندر ایک طوفان موجزن تھا۔ میرا ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ میں برآمدے کے آخری سرے پر بیٹھ گیا' میرے اس چھوٹے سے جھونپڑے میں یہی ایک سکون کا گوشہ تھا مگر اب یہ بھی طوفان کی زد میں آنے والا تھا۔ میری دنیا

...ہی تندور کی۔ ... تھی۔

☆......☆......☆

''نہیں...... کبھی نہیں...... تم نے میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر میرے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ مگر تم سے پہلے میں وار کروں گا۔ تم نے کیوں ہمارے درمیان آگ کی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے؟ مگر نہیں تم بے قصور ہو تمہیں جو بہرحال بیماریوں سے لڑنا ہے اور اندھاپن تو بہت بڑی بیماری ہے۔

تم اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے' تم اسے بینائی دے سکتے ہو' مگر تم میری زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ڈاکٹر......''

شینا دیکھنے کے قابل ہو جائے خدا کرے اسے بینائی مل جائے جو ہر انسان کی بنیادی ضرورت اور حق ہے۔ مگر ایسا ہونے سے پہلے مجھے خاک ہو جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ بندر نما انسان کے معنی جان لے' اس کو دیکھ لے اس صورت میں...... میں...... اس کے دل میں ایک محبت کرنے والی کی یاد بن کر زندہ رہ سکتا ہوں...... میرا دل چیخ رہا تھا کیا میرے لیے اس کی محبت موجودہ محبت اور وہ حسن جو وہ مجھ میں محسوس کر چکی ہے...... کیا وہ ہمیشہ قائم رہے گا......؟

☆......☆......☆

شینا ماں بن گئی...... اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا لوگوں نے اسے 'حرامی بچہ' قرار دے کر ہماری ہنسی اڑائی مگر ہم نے پروانہ کی۔ بدصورت باپ اور اندھی ماں کا وہ بچہ بہت ہی معصوم تھا۔ اسے میری آنکھیں اور شینا کا حسن ملا تھا اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی؟

ہوئی تو اس نے ایک روز مجھے اس ڈاکٹر کے بارے میں یاد دلایا۔ جسے میں اپنی خودغرضی کے سبب بھول چکا تھا۔

شینا اپنی آنکھوں کے آپریشن کے لیے اب اس کے پاس جانا چاہتی تھی۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ میرے دل پر کیا قیامت گزر رہی ہے' میں نے اسے کہا کہ میں کل اس ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ پھر وہ جس دن آنے کا کہے گا۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ میں شینا سے پہلی بار جھوٹ بول رہا تھا۔ اس روز میں نے اپنے آپ کو سمندر کے وسط میں طوفانی موجوں میں گھرا ہوا محسوس کیا اگلے روز میں ڈاکٹر کے پاس جانے کا جھوٹ بول کر گھر سے نکلا اور دوپہر کو واپس آ کر شینا کو بتایا کہ وہ ڈاکٹر ایک حادثے میں فوت ہو گیا ہے۔ اب میں کسی اور ڈاکٹر کا معلوم کروں گا۔

شینا نے دکھ کا اظہار کیا مگر میں افسوس کا ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ شینا نے صرف اتنا کہ کہ آپ کسی اور ڈاکٹر کا پتہ کریں میں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جس کو وہ نہ دیکھ سکی' میرے اندر خودغرضی اور ظلم کے جذبات سما گئے تھے اور یہ ایک بوجھ تھا' جسے اٹھائے رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مگر اپنی دکھ بھری زندگی کے اختتام پر ملنے والی خوشیوں کے ان لمحات کو طول دینے کے بجائے میں کوئی اور طریقہ بھی تو اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

وقت کا دھارا کبھی نہ لوٹ کے آنے کے لیے بہتا رہا...... ایک روز میں جب گھر لوٹا تو میں نے

زور زور سے رو رہا تھا۔

شینا اسے سنبھالنے کے لیے تیز بھاگی۔ اس نے کسی چیز کا سہارا بھی نہ لیا میں تانبے کا ایک بڑا سا ٹب پڑا تھا۔ و ٹکرائی اور دروازے کی چوکھٹ پر جا گر فوارے کی طرح اس کے سر سے ابلنے اسے فوراً اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے بتا چاری بری طرح گری ہے...... زخم خطرناک ہے۔"

انہوں نے اس کا علاج شروع کی درد سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس نے قریب بلایا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی "میں زندہ نہ رہوں گی...... لگتا مر رہی ہوں...... کاش میں تمہیں ایک آنکھوں سے دیکھ سکتی۔" مجھے شینا کی خواہش سن کر یوں لگا کہ جیسے یہ میر برداشت کا امتحان ہے...... کیا وہ ڈاکٹر سے رنجیدہ تھی؟"

پھر وہ خاموش ہو گئی۔

"شینا......" میں نے اسے کہا۔

"مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنا کوئی ب نہیں' کیا تم نے مجھے اپنے دل کی آنکھ نہیں دیکھا؟ میں جانتا ہوں کہ اس دنیا می تم ہی ہو۔ جس نے مجھے صحیح طور پر سمجھا ہے...... اس دنیا میں تو لوگ آنکھیں رکھ بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ تم کیوں ہو۔ میں تمہارے پاس ہوں نا جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

شینا نے میری باتیں سنیں اور زبان نہ بولی۔

چمکتا سورج مغربی افق کے کنویں میں اتر چکا تھا کہ اچانک شینا کی کراہیں..... چیخوں میں بدل گئیں..... کرب سے میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔ میری خودغرضی اور بے رحمی کا راز حلق میں اٹک کر زبان پر آنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک اس کے سامنے نہیں رہ سکتا تھا..... اتنے میں شینا کی ماں آ گئی اور اس نے بچے کو شینا کے پہلو میں لٹا دیا' بچہ بھی اس کربناک ماحول سے گھبرا کر چیخنے لگا۔

شینا بھی چیخنے لگی..... اس وقت میں خود کو بالکل بے بس اور تہی دست محسوس کر رہا تھا۔ اتنا بے بس میں زندگی میں کبھی بھی نہ ہوا تھا۔

تمام رات اسی طرح گزر گئی ڈاکٹروں نے اس پر کافی توجہ دی' لیکن صبح صادق کے وقت شینا کی روح جسم سے نکل کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی..... مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت میں نے کیا کیا تھا.....

ایک دل کی دھڑکنیں رک گئی تھیں اور دوسرا دل شق ہو رہا تھا۔ سورج طلوع ہوا تو تاریکیوں کا دامن دراز ہو گیا شینا کی ماں بچے کو لے کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔

وہ لوگ جو میری دہشت ناک بدہیئتی اور میری اس عجیب و غریب محبت کی تہہ میں نہیں جھانکتے اور انہوں نے کبھی میرے دلی جذبات کو محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی' وہ اب بھی مجھے دیکھ کر اسی طرح ہنسنے لگتے ہیں۔

اب میں کبھی کبھار برآمدے کے کونے میں بیٹھ کر حیرت سے سوچتا ہوں کہ اگر میں اندھا ہوتا اور شینا بدصورت ہوتی۔ تو پھر میری کہانی کیسی ہوتی' میری زندگی کیسے گزرتی؟

☆☆.....☆☆



تجھ سے ملنے کو دل کیا اک دن
میں نے تھوڑا سا رو لیا اک دن

ساتھ دینا تھا عمر بھر جس نے
میری خاطر نہ رک سکا اک دن

بات کہہ دی نئی محبت کی
دھیرے دھیرے وہ جب کھلا اک دن

مجھ سا کوئی نہ مل سکا اُس کو
پھر وہ میرا ہی ہوگیا اک دن

دل سے مانگی ہوئی ہو کوئی بھی
کام آتی ہے ہر دُعا اک دن

اب نہ جانے میں کب چلا جاؤں
یاد آؤں گا یوں گیا اک دن

ڈاکٹر عباس علی



پیرس سے سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے توشۂ خاص

انیلا حمید

ہمیشہ کی طرح نیند کا رسیا رضا اردگرد ماحول سے بے خبر دیس بدیس نجانے کن وادیوں کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ دھما چوکڑی سے آنکھ کھل گئی۔ کسلمندی سے آنکھیں ملتا ہوا' رضا' کیا طوفانِ بدتمیزی ہے آپا جان ...... ابھی تو آنکھ لگی تھی اور ان کے شور سے نیند کھل گئی' مہربانی فرما کے ان کی چھیڑ چھاڑ بند کروائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔

مہرالنساء (رضا کی بڑی بہن) جو انتہائی انہماک سے سب کزنز اور بہن بھائیوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اپنے ذہین و فطین بھائی کی یوں نیند خراب ہوتے دیکھ کے مصنوعی غصہ چہرے پہ سجائے تمام کزنز پارٹی کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگیں۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہو کے ذلار سے بولیں۔ کتنی دیر سے یہ سب تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہے تھے۔ شاید کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

سب ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے معنی خیز انداز سے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ روکنے کی ناکام کوشش میں تھے۔ ان کے چہرے اک ال
سنانے کو بے تاب تھے۔

اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ
بھر کی لاڈلی اور رضا کی چھوٹی بہن کشما
سے دروازہ کھولتی اندر داخل ہوئی اور بے
اٹھی۔

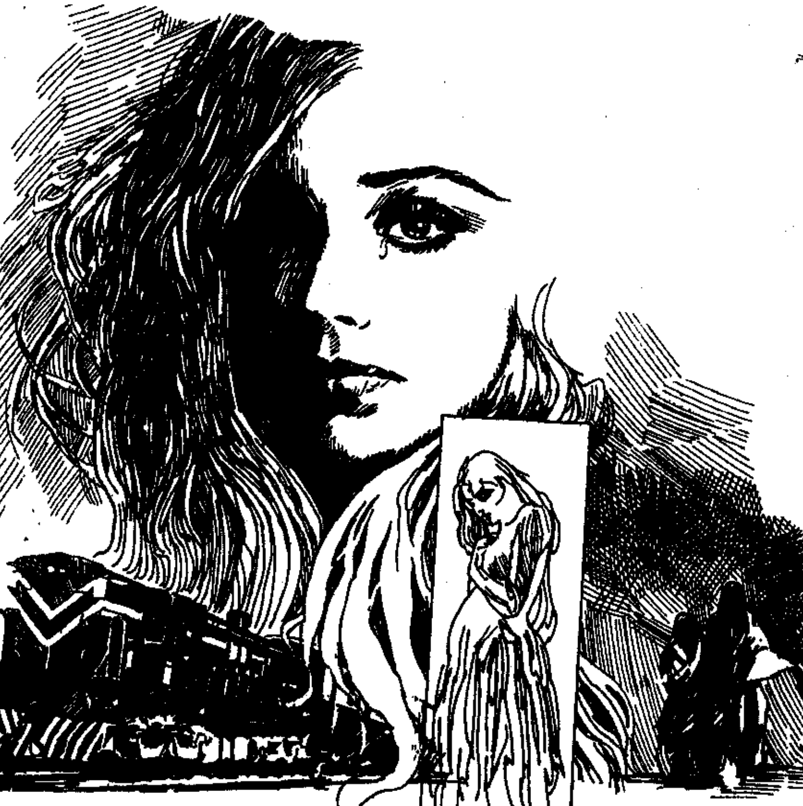
مبارک ہو رضا بھائی...... آج آل ا
پہ وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے
ہے کہ تقسیمِ ہند کی قرارداد منظور کر لی گئی
ہندوستان کے مسلمانوں کی تقدیر کا فیصل
اب ہم سب مسلمان اپنے پیارے وطن می
وخودمختاری سے سانس لے سکیں گے وہ س
سے رضا کو تنگ کرنے کی ٹھانے ہوئے تھے
کے اسطرح خبر سنانے پہ ناراض ہونے ک
یک زبان ہو کے چلا اٹھے۔ سب نے مل
پور نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ بچے خوشی کے جزبا
مغلوب چلا اٹھے' لے کے رہیں گے پاک
کے رہے گا پاکستان' سب کے چہرے اس

جگمگا اُٹھے۔رضا کی نیند اُڑن چھو ہو چکی تھی۔اب
وہ دوسروں کے ساتھ قہقہے بکھیرتا چند پل پہلے والا
رضا نہیں بلکہ تمام رات اپنے چچاوں کے ساتھ کام
کرتا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر شامل تھا جو
اپنے کزنز اور دوستوں کے ساتھ تحریکِ پاکستان
میں کلیدی کردار ادا کرتا ہر دلعزیز تھا۔اپنے نئے
وطن کی تگ ودو میں رضا کے ساتھ مل کر ان سب
نے اپنے قائد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دن
رات ایک کردیا جس کا شاندار نتیجہ آج آزادی کے
پروانے کی صورت میں ان کے سامنے تھا صرف اور
صرف اپنے ان دیکھے وطن کی...... مٹی کی خوشبو......

پانے کے لیے۔

محترم لیڈر قائدِ اعظم کی جہاندیدہ نظریں جانچ
چکی تھیں کہ بھارت ماتا ہندو سامراج کے اس
عفریت کو جنم دے چکی ہے جس کے ذہن میں
آزادی کا مفہوم دس کروڑ مسلمانوں کو حقوق
آزادی سے محروم کرنا تھا۔وہ سانپ اپنے بل سے
سر نکالنے کو بے تاب تھا جس کے زہر نے صدیوں
پیشتر اچھوت کی رگوں سے زندگی کی حرارت چھین
لی تھی۔

قائدِ ملت جانتے تھے کہ مسلمانوں میں ادبی و
سیاسی شعور جگانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے



کیونکہ حالات سے ثابت ہو چکا تھا کہ ہندو سیاستدانوں نے مسلمانوں کو نرغے میں لینے کے لیے جس قدر اطمینان اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی قدر وہ نرغے میں پھنسے ہوئے شکار کو مغلوب کرنے کے لیے اُوچھے ہتھکنڈوں پہ اتر سکتے تھے۔ اور وقت نے جلد ثابت کر دیا کہ ان کے خدشات غلط نہ تھے۔

ربِ کعبہ کے سامنے سربسجود ہونے والی قوم کے بچوں کو مدارس میں گاندھی کی مورت کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جانے لگا۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پڑھنے والوں کو بندے ماترم کا ترانہ سکھایا جانے لگا۔ دخترانِ توحید کے نصابِ تعلیم میں دیوداسیوں کے رقص شامل کر دیے گے۔

ہندوستان میں رہنے والا ہر شخص جانتا تھا کہ مسلمانوں کا رہن سہن، سماجی و مذہبی تشخص اور فلسفہء زندگی بُری طرح مجروح ہو رہے تھے۔ اور سب سے بڑھ کے قرآن پاک جو تمام بنی نوع انسان کے لیے رُشد و ہدایت اور مکمل ضابطہ حیات تھا جسے پڑھنے کے لیے مسلمان جونہی تلاوت کی غرض سے صبح صادق کھولتے۔ تو شر پسند ہندو اپنے گھروں میں بنائے گے بُت خانوں کی گھنٹیاں اور زور وشور سے بجانا شروع کر دیتے۔ ان کے بجن' گانے اور اونچی آواز میں طبلے سارنگیاں بجانا۔ قرآن پڑھنے میں رخنہ ڈالتا۔ جس سے کوئی بھی مسلمان اسے توجہ سے نہ پڑھ سکتا۔ ایسی متعفن زدہ فضا میں اپنی اسلامی اقدار کو قائم رکھنا مذہب' معاشرہ' قانون و عدالت کو فروغ دینا مسلمانوں کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ ان دو تہذیبوں اور دو نظریوں کے تصادم کو بالآخر 23 مارچ 1947 مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں امن و آشتی کا چولہ پہنا

کے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔ جس نے مسلمانوں کی تقدیر بدل دی۔ اسی جد شامل ایک گھرانہ صفدر حسین کا بھی تھا۔ ر ریاست علی اور شفقت حسین ان کے بھ جنہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ لیا۔ صفدر حسین کا تعلق ایک متمول اور پڑ گھرانہ سے تھا آباواجداد پشت در پشت ا رہائشی تھے اس پوش علاقے میں بنگلہ پرکھوں سے ان کی شان و شوکت او روایات کی غماز تھی۔ صفدر حسین نہایت النفس' بذلہ سنج اور مہذب انسان تھے۔ تین چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کے ساتھ یہ گھرا سے اپنی اسلامی اقدار کی پاسداری کرتا ا کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ بڑا بیٹا سیشن کور میں نیا نیا جج تعینات ہوا تھا۔ رضا نے وکا فرسٹ ڈویژن لیکر خود کو وطن کی آزادی وقف کر دیا۔ باقی دو بیٹے لاہور میں زیرِ تعل بیٹیاں دنیاوی اور دینی زیور سے آراستہ گھ جی (والدہ) کا ہاتھ بٹاتیں احسن طریقے داری نبھا رہی تھیں۔

بھائی تحریکِ پاکستان میں شمولیت کرکے نئے وطن کی جدو جہد میں سرگر دوسرے مسلمانوں کی طرح وہ بھی یہ جان کہ مسلمانوں پہ ایک کڑا وقت ایسا آنے جس کی آنچ سے کوئی بھی مسلمان بچ نہ سک چنگاری کو ہوا دینے میں ہندو بنیہ اور انگریز پیش پیش تھے۔ اُس وقت جس الام و مص سامنا کرنے کے لیے جس اجتماعی شعور اور انہیں ضرورت تھی وہ ان سب میں مفقود خوف تھا کہ ہم نے آج بھی آنکھیں نہ ک ہندوستان میں مسلمانوں کا وہی حشر نہ ہو جو

سال شاہانہ انداز میں اسپین میں حکومت کرنے کے بعد مسلمانوں کا ہوا اس کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو آپس کے اتحاد و اتفاق کیساتھ لائحہ عمل کی اشد ضرورت تھی۔ جس سے وہ اپنے کام کو آسانی سے پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں. وقتاً فوقتاً اسی سلسلے کو جاری وساری رکھتے ہوئے علاقے کے چند تعلیم یافتہ نوجوان چُھپ چُھپ کے میٹنگ کا اہتمام کرتے جن میں ملکی وسیاسی چیدہ چیدہ مسائل پہ نظر ثانی کی جاتی یہ نوجوان طبقہ ان خطرات کے سامنے آنکھیں بند کر کے نہ بیٹھ سکا اپنی درسگاہ سکول' کالج بند کر کے وہ گاندھی کے ناپاک اتحاد کو شکست دینے کے لیے میدان میں اُتر آیا۔

میاں جی (صفدر حسین) اوران کی فیملی کا ہر بچہ بوڑھا اس تحریک میں پیش پیش تھا. خاندانی عزت و وقار کے ساتھ تعلیمی میدان میں بھی صف اول کی دور میں شامل ہونے کی وجہ سے علاقہ ومحلّہ میں ان کی عزت دو چند تھی۔ ایک ہی چھت تلے رہنے سے ہندو سکھ عیسائی اپنی روزمرہ کی حاجتیں پریشانیاں اپنے دکھ سکھ میاں جی سے بانٹتے اور صلاح مشورہ لیتے۔

اپنی نیکوکار طبیعت کی وجہ سے وہ مقدور بھر کوشش کرتے کہ اپنی راست بازی و دور اندیشی سے مسلم تو کیا ہندوؤں کی بھی بھرپور طریقے سے مدد کریں۔ ان کی یہی عزت نے انہیں میاں جی کا خطاب دے ڈالا۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا اس علاقے میں امن وامان قائم رکھنے میں ان ہندوؤں اور سکھوں کا بھی ہاتھ تھا۔ جو جدی پشتی یہاں کے باسی تھے۔ ہر گھر کے افراد کو نہ صرف یہ جانتے بلکہ مسلمانوں کے کردار واخلاق کے دیوانے بھی تھے۔

بچپن کے دوست دینا ناتھ اور حویلی کے بالکل سامنے دینا ناتھ کے کزن (ماموں زاد) پرکاش بابو کا گھر تھا۔ ان سب کا بچپن اکٹھے گزرا تینوں خود کو (برادرِ خواندہ) منہ بولا بھائی کہتے۔ محلے میں سب مل جل کے رہتے' کسی کا غیر مذہب ہونا کوئی اچنبھے (عجیب) بات نہ تھی۔ سو! ان کے درمیان بھائی چارہ ہی اصل بنیاد تھی' سوائے گلی کی نکڑ پہ بیٹھے رام داس کے۔ اللہ جانتا ہے اسے مسلمانوں سے کیا بیر تھا کہ ان کا اکٹھے بیٹھنا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا چلتے پھرتے کوئی ذومعنی بات کر جاتا لیکن علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے اپنی نفرت کو چاپلوسی کا پہناوادیکر وقتی خاموشی اختیار کر لیتا۔

بظاہر سب ایک دوسرے سے خوش اور مطمئن نظر آتے لیکن کبھی کبھار تکرار بھی ہو جاتی' اگر چہ شخصی آزادی سب کو حاصل تھی لیکن ہندو بنیے اپنی ذات کے مکروفریب اور اپنی متعفن زدہ سوچ کے ساتھ اپنے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہندوؤں کو نہ چھوڑتے تو دوسرے مذاہب کے لوگ کیسے اس آفریت سے بچ پاتے۔ جیسے ہی کسی مسلمان کے گھر گائے کا گوشت پکتا اس کی خوشبو سونگھتے ہی ہندو برہمن رام رام کہتے اپنے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے۔ کسی بھی مسلمان کے گھر سے بھیجا گیا کھانا قابلِ قبول نہ سمجھا جاتا۔ فوراً واپس کر دیا جاتا۔ کئی شرپسند ہندو اپنی کم ظرفی سے دنگا فساد کرتے نظر آتے کیونکہ (گائے کو وہ ماں کا درجہ دیتے)

یہ سب دیکھتے سمجھتے ہوئے قائدِ اعظم کی اس نئی سوچ نے مسلمانوں میں زندگی و آزادی کی اک نئی روح پھونک دی مسلمانوں نے جوق در جوق تحریکِ پاکستان میں شمولیت اختیار کر کے ہندوؤں کو یہ باور کروا دیا کہ وہ صرف ذات پات میں نہیں

قومیت کے لیے سب ایک جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی مٹھی بھر جماعت میٹنگ کے لیے اکٹھی ہوئی۔ رضا نے اپنی ذہانت وقابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت متانت سے سب کو باور کروایا کہ مسلمان ایک ملک حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ الگ قوم ہیں اور ایک قوم کو بڑھنے پھلنے پھولنے کے لیے آزاد وطن کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی کا بوجھ اٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ ہمیں ذہنی پسماندگی سے نکلنا ہے۔ پاکستان کے لیے ہم دل میں دس کروڑ مسلمانوں کی دھڑکنیں محسوس کر رہے ہیں۔ ہماری آواز دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ہے۔ اگرچہ ہماری راہ میں کانٹوں کی دیواریں کھڑی کر بھی دی جائیں تو بھی ہم متحد ہو کے انہیں روندتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ ہی جائیں گے۔

دیکھو!! ہم سب اُفق پہ اٹھنے والی آندھی کے آثار بخوبی دیکھ رہے ہیں۔ جب یہ آندھی آئے گی تو تم لوگ خود محسوس کرو گے کہ پاکستان کے سوا ہمارے لیے کوئی اور جائے پناہ نہیں' تم لوگ بارش و طوفان سے پہلے مکان کی چھت ڈالنا چاہتے ہو یہ نہ ہو وقت ہاتھ سے نکل جائے اور تم بارش میں کھڑے ہو کر چھت ڈالنے کی فکر میں رہو۔

یادرکھو بھائیو!! پاکستان کی جنگ ہمارے لیے اجتماعی فریضہ ہے ہماری زندگی اور موت ان دس کروڑ عوام کی موت وحیات سے وابستہ ہے ہم ان سے کبھی بھی الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ ہم سب اکٹھے کندھے سے کندھا ملا کر چلیں گے۔ جب ہم تھک جائیں تو ہمیں تسلی ہوگی کہ آپ لوگ اپنے مضبوط بازؤں کا سہارا دو گے اپنی عزت وجان

کے لیے اب ہمیں متحد ہو کے اٹھنا ہے اور یہ
حمیت وعزت کا تقاضا بھی ہے۔ کچھ توقف
!رضا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے باآواز بلـ
سنو بھائیو!! ہماری قوم پر مصائب کـ
ٹوٹ رہے ہیں قوم کی بیٹیوں کی عزتیں تار
ہماری قوم کے بیٹے عزت و ناموس کو بچانـ
لیے خاک وخون میں لت پت اپنے وطن کی
خوشبو پانے کو سرگرداں ہیں ایسے کڑے وقـ
ہمیں اپنی انفرادی خواہشات کو قوم کی
ضروریات پر قربان کر کے ہمہ وقت تیار رہـ
ہماری جان' مال۔ عزت سب داؤ پہ لگے ہیں
اپنے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مـ
عملی جامہ پہنانا ہے' اٹھو بھائیو' ہمارے وطن کـ
ضرورت ہے' دلوں میں نیا جوش ولولہ پیدا
مستقبل کے سنہرے خواب آنکھوں میں سجـ
میٹنگ برخاست ہوئی۔ اس کی تعبیر پانـ
لیے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو زیادہ ا
کرنا پڑا۔ تقسیم ہند کی خبر سے تمام ہندوستا
خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اسی میں امرتسر کا وہ علا
شامل تھا جو رضا کے آباواجداد کا مسکن تھا۔
سے میاں جی کے گھر میں لوگوں کا تانتا بـ
دوست احباب (بیلی) مبارک باد دینے میـ
پیش تھے۔ قرارداد کی منظوری نے جہاں مسلـ
ہیشگی ودیدنی خوشی دی وہیں کانگرس کے
سانپ لوٹ گے۔ ان کی نفرت میں دوچند
ہوا' تقسیم ہند کی مخالفت میں وقت کیساتھ اور
آگئی' جہاں اچھائی ہو وہاں برائی بھی اپـ
گاڑھنے کو تیار ہوتی ہے مسلمانوں میں کئی بدخـ
ایسے بھی تھے۔ جو پاکستان کی مخالفت میـ
ناپاک سوچ سے غداری وکم ظرفی سے ہـ
سے ساز باز کر بیٹھے' مسلمانوں کے

رتے ہوئے علی العلانیہ قائداعظم کے خواب کو ب دیوانے کا خواب کہنے لگے۔ ان کی یہ کینہ دوز رت کسی سے مخفی نہ تھی۔ ساتھ ہی ہندوؤں کا رزِعمل منافقانہ و جابرانہ رویہ کھل کے سامنے آ گیا' رت و بغض کی آگ میں جلتے ہندوؤں کے کالے رتوت کھل کے سامنے آئے۔ ہندو مسلم فسادات ی صورت میں نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

تواتر سے آتی خونی خبروں سے مسلمانوں میں وف و ہراس پھیل گیا' مسلمانوں کا قتلِ عام' گھروں میں لوٹ مار' پڑوسیوں کے گھروں میں ب خون مارنا' بہو بیٹیوں' ماؤں کی عصمت دری' ریانوں تیروں سے شیر خوار بچوں پہ خون رنگ شق کرنا' ہندوؤں سکھوں کی جوان مردی کی قلعی کھول گیا۔

اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ماؤنٹ بیٹن کی یر منصفانہ تقسیم اور دوسرے پلڑے میں برطانوی سامراج کے تمام گزشتہ جرائم کو رکھ دیا جائے تو اؤنٹ بیٹن کا پلڑا بھاری ہوگا' اگر انسانیت کے قاتلوں کی فہرست تیار کی جائے تو ماؤنٹ بیٹن کا نام سب سے پہلے خونی فہرست میں سرخ حروف میں لکھا جائے گا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جسے بظاہر ہندوستان کی تقسیم اور انتقال اختیارات کے لیے کام سونپا گیا تھا' درحقیقت!! اسکا مشن مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے ہندوؤں کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ آبادی کو ہندوستان میں اور ہندوؤں کی کم سے کم آبادی کو پاکستان میں شامل کیا جائے چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے برِصغیر ہند میں مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے صوبوں کی تقسیم کے اصول کو صرف مسلم اکثریت کے صوبوں

(مطلب) پنجاب اور بنگال کی تقسیم میں تبدیل کر دیا' اس نامنصفانہ تقسیم نے نہ صرف پاکستان کو اس کے بہترین علاقوں سے محروم کر دیا بلکہ ہندوستان کی مسلم اور پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کا توازن بھی ختم کر دیا گیا' جس کی بدولت دونوں مملکتوں میں امن کی امید تھی ایسی غیر منصفانہ تقسیم کیوجہ سے ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان خون کے طوفان کا نیا خونی سلسلہ شروع ہوگیا......

اگست کے مہینے میں پٹیالہ' نابھہ کپور' بھرت پور اور گردونواح میں انڈین افواج مشرقی پنجاب میں پہنچ چکی تھی اور حکومت مشرقی پنجاب کی مسلمان پولیس کو مکاری سے نہتا کر رہی تھی مسلم کانسٹیبلوں کو غیر مسلح کر کے ان پہ گولیوں کی باڑ مارنے کے بعد مشرقی پنجاب کے حکام یہ واضح کر چکے تھے۔ کہ وہ کس قسم کا امن چاہتے ہیں۔ پنجاب میں سکھ ڈوگرہ اور گورکھا افواج کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتلِ عام کو روکنے کے لیے (پاکستان کی آواز بیاثر ثابت ہوئی) یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کارفرما تھا' جو چالبازی سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اب ہندوؤں' سکھوں کے ظلم و بربریت کی داستانیں دورافتادہ علاقوں سے تواتر سے آنا شروع ہوگئیں۔

میاں جی اور علاقے کے رہائشی کسی بھی اندیشے سے پاک مطمئن انداز میں معمولات زندگی میں مصروف عمل تھے اکثر اوقات محلے کے بزرگ دوست احباب ہمیشہ کی طرح حویلی میں اکٹھے ہوتے' ملکی و سیاسی حالات پہ کھل کے بحث و مباحث ہوتی۔ ان تبصروں کے دوران کئی چہروں پہ تفکرات کے بادل منڈلاتے دکھائی دیتے لیکن جلد ہی آپس کی محبت۔ بھائی چارہ۔ دوستی حائل ہوتی تو اضطراب و بے چینی کی فضا پھر سے خوشی و انبساط

سے سرشار ہو کے نشستیں برخاست ہو جاتیں۔
سب مطمئین انداز میں بغیر کسی ڈر یا وسوسے کے اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے' اس طرح ان کی معمولاتِ زندگی ایک دوسرے پہ اعتبار و بھروسے پہ رواں دواں تھی۔
ایک شام وہ سب صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے ملکی حالات پہ تبصرہ کرتے ہوئے اپنے گردونواح کے علاقوں پر ہونے والے ظلم وستم کی خبریں سن کر میاں جی کو ہجرت پر آمادہ کر رہے تھے' تمام حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حتی الوسیع رضا کی کوشش تھی کہ والد صاحب جلد کوئی فیصلہ کریں یہ نہ ہو کہ ہمیں ہندوؤں اور سکھوں پہ کیا گیا اعتماد کہیں مہنگا نہ پڑ جائے۔ کیونکہ وہ تمام حالات سے باخبر ہو کے چاہتے ہوئے بھی بڑوں کے فیصلے سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میاں جی جو وقت کے مطابق فیصلہ کرنے والوں میں سے تھے. شش و پنج میں نظر آئے' علاقے کے ہندو اور سکھوں کا حسنِ سلوک و نرم گفتاری ان کی ہجرت کی راہ میں رکاوٹ تھی' دوسری بات وہ سب جانتے تھے کہ یہ سب علاقہ مسلم اکثریت کی وجہ سے پاکستان میں شامل ہو گا تو وہاں جانے کا کیا فائدہ؟ ایک دن آنا تو ہم سب نے یہیں ہے تو ہم ہجرت کریں کیوں؟ علاقے کے تمام ہندو سکھ جس طرح ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ تو ہمیں بھی اپنے دل و دماغ میں اتنی وسعت لانی چاہیئے کہ کسی بھی قسم کے وہم اور اندیشے کو دل میں پنپنے نہ دیں' لیکن تینوں افراد اس بات سے متفق نہ تھے۔ لیکن باپ اور بھائی ہونے کے ناطے انکا جو احترام تھا اسے ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے قائل نہ کر سکے' باتوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ حویلی کے کواڑ زور سے بج اٹھے' چاروں نے چونک کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' اس وقت کون ہو سکتا ہے؟

رضا اٹھا اور دھیمی چال چلتا ہوا دروازے کی
بڑھا' کون ہے باہر؟ ہم ہیں میاں جی سے
بات کرنی ہے۔ دینا ناتھ کی آواز سن کے رضا
تامل دروازہ کھول دیا' باہر دینا ناتھ ان کے
زاد پرکاش بابو کے ساتھ علاقے کے تین جو
تھے جن میں پرکاش بابو کا بڑا بیٹا رام چندر
جنہیں رضا اپنی ہمراہی میں اندر لے آیا'
سلام دعا کے بعد سب وہیں براجمان ہو
پاکستان کی مبارک دیتے سب نے خوشی کا
گفتگو کے دوران میاں جی دینا ناتھ کو غور
رہے تھے۔ جو بچپنی سے اپنے ہاتھوں کو مس
تذبذب کا شکار نظر آیا' انہوں نے فی الفو
پریشانی بھانپتے ہوئے پوچھا' کیا بات
ناتھ؟ پریشان دکھائی دے رہے ہو! کچھ کہ
ہو؟ دینا ناتھ جو اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ
کیسے بتائے میاں جی کے سوال نے اس
آسان کر دی۔
وہ جو بچپن سے اکٹھے منزل در منزل
میں کامیابی کے زینے پھلانگتے جوانی سے
کی دہلیز تک بھی یک جان دو قالب تھے
بات بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دھڑ سے کر
وہی میاں جی کے سوال پہ چونک پڑے'
کی کوشش کرتے ہوئے' نہیں نہیں' میاں
دینے والا لہجہ بات تو کوئی خاص نہیں' کچھ
ہو کے ہاں ایک گھمبیر مسئلہ ضرور ہے جس
نظر نہیں چُرا سکتے......
دینا ناتھ کی بات پہ چاروں اشخاص چو
گے' انہیں خاموش دیکھ کے دینا ناتھ گویا ہو
پرکاش بابو کا بڑا لڑکا رام چندر جو کانگریس
میں شامل ہے۔ اسی کے توسط سے معلوم ہو
شرپسند جتھے جار... علاقے میں فساد کر

ہیں کیونکہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت زیادہ ہے۔ ان کا مقصد لوٹ مار اور لوگوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ علاقے کے لوگوں کی جان و مال اور عزت کی ذمہ داری ہم گنتی کے چند ہندو اور سکھ اٹھانے کو ہمہ وقت تیار ہیں' لیکن آپ جانتے ہیں دور دراز سے آنے والی خبریں کوئی تسلی بخش نہیں۔ جس سے ہم سب پریشان ہیں ہم آپکے ہمسائے دوست اور بھائی ہیں۔ آپ کو باور کروانے آئے ہیں اگر آپ اور آپ کے خاندان والے ہجرت کرنے کو تیار ہیں۔ تو اس علاقے کے مسلمانوں کو فوراً اکٹھا کر کے ہجرت کر جائیں۔ ہم آپ کو وشواس دلاتے ہیں کہ ہم ہر قسم کی مدد کرنے کو تیار ہوں گے۔

اور اگر آپ کا جانے کا ارادہ ملتوی ہوتا ہے۔ تو ہم آپ کو تسلی دینے آئے ہیں کہ آپ اور اس علاقے کے تمام مسلمان کسی بھی قسم کی چنتا نہ کریں ہم ہمیشہ کی طرح آپ کے ساتھ ہیں اور ہر مصیبت کے وقت ایک دوسرے کے لیے ہمنوا اور ہم بازو رہیں گے۔ میں اور پرکاش بابو آپکی فیملی کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہیں' دونوں نے بہ یک وقت اپنی دوستی اور یگانگت کا وعدہ کیا' ساتھ آئے تینوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

میاں جی جو سوچوں میں گُم آنے والے خطرات کی بُو سونگھ چکے تھے ان سب کی تسلی و تشفی سے انہیں کچھ ڈھارس ہوئی اور ان سب کا شکریہ ادا کیا' دینا ناتھ اور پرکاش بابو تینوں کے ساتھ حالات پہ نظر ثانی کرتے اجازت لیتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جاتے ہی رضا اور دونوں بھائی فی الفور ہجرت کرنے پہ مُصر ہو گے۔ سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے میاں جی باریک بینی سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ دل تھا کہ یہاں سے جانے کو تیار نہ تھا لیکن دماغ برے وقت سے خبردار کرتا ہجرت پہ آمادہ تھا' اتنے مسلمانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہونے کا اندیشہ بھی دامن گیر تھا۔ الجھن بڑھتی جا رہی تھی وہ جو دوسروں کے فیصلے چٹکی بجا کے نہایت دانشمندی و ایمانداری سے کرتے چلے آئے تھے آج خود کا فیصلہ کرتے ہوئے عجب تذبذب کا شکار نظر آئے۔

دونوں بھائیوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اُٹھے اور آہستہ روی سے چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گے۔

لیکن!! تینوں جانتے تھے کہ یہ معمولی بات نہ تھی اب ان کی تمام رات بےچین و مضطرب گزرے گی جب تک فیصلہ نہ کر لیں کیونکہ ان کے فیصلے پہ علاقے کے مسلمانوں کی زندگیاں وابستہ ہیں تینوں آنے والے لمحات سے نبرد آزما ہونے کے لیے سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔

مُرغ کی بانگ کیساتھ جونہی صبح کی سفیدی نمودار ہوئی سب چرند پرند رب کائنات کی حمد و ثناء کرتے خوراک کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے 'معمول کے مطابق میاں جی کا گھرانہ بھی نیند سے بیدار ہوا ناشتے پہ سب نے ایک دوسرے سے رسمی سی بات چیت کی۔ میاں جی دونوں بھائیوں کو اشارہ کر کے ضروری کام کا کہہ کر باہر نکلے رضا نے بھی ان کی تقلید کی۔ ان سب باتوں سے بے نیاز خواتین گھر داری میں مصروف ہو گئیں۔

دوپہر کو مرد حضرات گھر آ کے کھانا تناول کرتے جسکی تیاری میں خواتین صبح سے مصروف عمل ہو جاتیں۔

ابھی کام شروع کیے کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ اچانک حویلی کا بڑا دروازہ دھڑام سے کھلا۔ رضا اور دونوں چچا سُرعت سے اندر داخل ہوئے ان

کے پیچھے میاں جی اور دونوں چھوٹے بیٹے جو لاہور میں زیرِ تعلیم تھے والد کے ساتھ ہراساں و پریشان اندر داخل ہوئے. انہوں نے بتایا کہ وہ دو دن کی چھٹی پہ آئے ہیں' لاہور میں پہنچی ہوئی خبروں کے مطابق یہاں کے حالات انتہائی ناسازگار ہو چکے ہیں. ہمیں اب ہندوؤں اور سکھوں کے دوستانے کو لیکر زیادہ خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے. صورتحال انتہائی گھمبیر ہے۔ دانش مندی کا تقاضا یہی ہے ہم فی الفور پاکستان ہجرت کر جائیں......

میاں جی نے ریاست علی اور شفقت حسین کے ذمہ علاقے کے تمام لوگوں کو اکٹھا کرنے کی ذمہ داری سونپی. جس کی فوراً تکمیل کرتے ہوئے اطلاع دینے وہ باہر نکل کھڑے ہوئے' آناً فاناً علاقہ و محلے کے مسلمان جوق در جوق میاں جی کی حویلی میں اکٹھے ہونا شروع ہو گئے آنے والے چند ہی لمحوں میں ڈیڑھ ہزار کے قریب لوگ حویلی میں آ موجود ہوئے جس میں محلے کے بااثر لوگ بھی شامل تھے۔ جن میں دینا ناتھ اور پرکاش بابو بھی تھے

......

میاں جی نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو مجمع پہ سکوت طاری ہو گیا۔ میاں جی سب سے یوں مخاطب ہوئے ...... میرے عزیز بچو' بیٹیوں' بھائیو اور بزرگو اس وقت انتہائی مشکل کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ اور وقت کا بے رحم تقاضا ہمیں مزید یہاں رکنے کی اجازت نہیں دے رہا کہ ہم اپنا پڑاؤ اور طویل کر سکیں حالات ہمارے بس سے باہر ہیں ہمیں پیارے وطن کی مٹی کی خوشبو پکار رہی ہے۔ جس کو حاصل کرنے میں عزت و جاں داؤ پہ لگے ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اس سے پہلے کہ ان ندیوں میں زائد ہماری ماں' بہن' بیٹیوں کا خون بھی شامل ہو اپنی عزت و ناموس بچا کے یہاں

کھڑے سب افراد اپنے اپنے اہلِ خانہ
ہجرت کر جاؤ۔ میرے بیٹے اور بھائی ا
احسن طریقے سے انجام دینے کے لیے آ
کے ہمراہ رہیں گے۔ رام چندر اور اس
آپکی حفاظت کے لیے ساتھ جائیں
سب کے جانے کا بندوبست کر دیا گیا ہے
کچھ اسلحہ ان نوجوانوں کو ہندو اور سکھ
نے دیا ہے راستے میں کام آئے گا اگر آ
کے گھروں میں کچھ اسلحہ ہے تو وہ اپنی حفا
لیے رام چندر کو دے دیں۔ راستے میں
رجمنٹ کے سپاہی مل کے تم لوگوں کو
لاہور تک پہنچا دیں گے۔۔ اب تم لوگوں ک
کے جال سے نکل کے ہوش مندی سے
یہاں سے ہجرت کرنی ہے۔ مجمع میں
کے کھلبلی مچ گئی۔ دینا ناتھ جو سب سن رہا
بنا نہ رہ سکا۔ میاں جی! کیا آپ ساتھ نہیں
؟؟ میاں جی جو لوگوں کو سراسیمگی میں دیکھ
سنگین حالات پہ سمجھانے کی کوش
تھے۔ چونک کر بولے کہ۔۔۔۔۔ نہیں
دوبارہ مجمع کی طرف متوجہ ہو گے۔۔ دینا
پل کے لیے خاموش ہو گیا۔ لیکن زیادہ دیر
سکا۔ میاں جی۔ سمجھانے والے انداز میں
سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس
میں۔۔۔۔۔۔ ابھی بات مکمل بھی نہ ہو
کہ میاں جی بول اٹھے۔۔ دینا ناتھ۔۔ سن
اس علاقے و محلے کی تمام تر ذمہ دا
عائد ہوتی ہے جو لوگ یہاں موجود نہیں
بیٹے کام کے سلسلے میں دوسرے علاقوں تک
ہیں ان کی واپسی شام تلک ہو گی۔ ان کی
ساتھ ہی جو بچے کھچے خاندان یہاں ہونگے
ساتھ رات کی ٹرین سے ہج

یں لگے۔۔۔۔دینا ناتھ پُر سوچ انداز میں۔۔۔انہیں دیکھتے ہوئے۔۔۔ میاں جی !! آپ ان لوگوں کی کوئی چنتا نہ کریں۔۔ہم ہیں ناں یہاں پہ۔۔۔۔ ہم پہ وشواس رکھیں ہم وعدہ کرتے ہیں جونہی علاقے کے دوسرے مسلمان اکٹھے ہوئے ہم خود بحفاظت انہیں اسٹیشن تک چھوڑ آئیں گے۔آپ بات سمجھیں اور دوسروں کے ساتھ خاندان کو لے کے چلے جائیں۔۔۔

میاں جی نے دینا ناتھ کی طرف دیکھا اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے دبایا۔۔۔ مسکرائے۔۔۔۔ پھر اٹل لہجے میں بولے۔۔۔نہیں میرے دوست۔۔۔۔میں اگر یہاں سے نکل گیا تو وہ مسلمان جو مجھ پہ اندھا اعتماد و بھروسہ کر کے میری خاموشی پہ وقت پہ ہجرت نہ کر سکے۔۔کیا کہیں گے۔۔کہ ہمیں تسلی و تشفی دینے والے میاں جی۔۔ ہماری حفاظت کی ذمہ داری لینے والے میاں جی۔۔۔ اب مشکل کی گھڑی آئی تو ہمیں اس مصیبت میں اکیلا چھوڑ کے بزدلوں کی طرح بھاگ گئے۔۔

"نہیں دینا ناتھ......"

میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ لوگ مجھے بزدلی کا طعنہ دیں'ان بچے کھچے مسلمانوں کی سر بلندی اور حفاظت اب میرے ناتواں کندھوں پہ ہے جب بھی ہجرت کرونگا اپنے بچوں'بیٹوں' بیٹیوں کے ساتھ ہی کرونگا۔

دینا ناتھ جانتا تھا کہ میاں جی جب ایک بات کا تہیہ کر لیں تو پھر ان کی ضد کے آگے کسی کی نہیں چلے گی'سو!! دینا ناتھ ٹھنڈی سانس لیتا ایک طرف ہو گیا۔

دو گھنٹوں میں ڈیڑھ ہزار کا قافلہ ہجرت کے لیے تیار کھڑا تھا جسکی کمانڈ رضا اور پرکاش بابو کا بیٹا رام چندر کر رہے تھے بیگم صفدر حسین نے بھی بچوں کیساتھ ہجرت کے لیے جلدی سے بُرقع ابھی ایک بازو پہن کے دوسرا پہننا ہی چاہتی تھیں میاں جی کی نظر پڑ گئی'تو بولے'بیگم اس نازک میں ہمیں چھوڑ کے جا رہی ہیں'نہ جانے ان میں کیا تھا کہ انہوں نے برقعہ اتار کے کھونٹی اور اعتماد سے گویا ہوئیں آپ بے فکر رہیں ہم سے لیکر اب تک ہر دکھ سکھ میں ساتھ رہے ہیں نے چاہا تو آگے بھی آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے'میں اپنے بچوں کو خدا کی امان میں ہوں وہی ان کی حفاظت فرمائے گا میں آپکے ہی ہوں'انکا جواب سن کے میاں جی مسکرا اٹھے

کشمالہ میاں جی کے زیادہ نزدیک ہو وجہ سے جانے پہ راضی نہ ہوئی تو انہوں نے ا کہہ کے پاس رکھ لیا کہ رات یا صبح والی ٹرین آجائیں گے جس کی رضا اور چچاؤں نے مخ بھی کی'پھر اس وعدے پہ چھوڑا کہ میاں جی جی نے کل پاکستان آنے کا وعدہ کیا ہے۔

سب ایک دوسرے سے گلے مِل کے ہزار کے قافلے کے ساتھ پاکستان آنے کا کر کے رخصت ہوئے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح چہار سُو پھیل مسلمان اکثریت کا بہت بڑا قافلہ اس جگہ ہجرت کر گیا ہے اُس وقت دوسرے علاقہ کے شرپسند جتھے اِسی سن گن میں تھے کہ کہیں بھی کوئی خبر آئے تو فوراً بلوہ کر دیں اپنی نا کانگریس میں ظلم وتشدد کی ایک اور کہانی دیں۔

یہ اُن مسلمانوں کی خوش قسمتی کہ خبر پہنچ پہلے ہی ڈھائی ہزار کا قافلہ اِس علاقے خیر و عافیت سے ہجرت کر گیا جس میں میاں

خاندان٬ دوست احباب اور علاقے کے مسلمان شامل تھے۔ جلد ہی قافلے کو رضا٬ رام چندر اور تحریکِ پاکستان میں شمولیت کی وجہ سے ٹرین میں جگہ مِل گئی٬ لیکن ٹرین کھچا کھچ بھرنے کی وجہ سے قافلے کے تین سو ساٹھ مسلمان ہی آ سکے٬ باقی ماندہ اسٹیشن پہ دوسری ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گے۔

جہاں پہلے سے دُور افتادہ علاقوں سے آئے ہوئے کثیر تعداد میں قافلے خود پہ بیتی ظلم و جبر کی داستانیں سُنا رہے تھے٬ جو اس علاقے کے مسلمانوں کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا میرا سارا کنبہ مارا گیا٬ کوئی بولا۔

''ہائے میرے خاندان میں میرے اور دو سال کے بچے کے کوئی نہ بچا۔ ظالموں نے سب کو مار ڈالا٬ رو کے چیخ کے اپنے دُکھ بتا رہے تھے سکھ ہماری عورتوں کو اٹھا کے لے گے میرے دودھ پیتے بچے پہ نیزہ کشی کی گئی۔ ہر مرد٬ عورت٬ بچہ٬ بوڑھا٬ جوان اک نئی کہانی سُنا رہا تھا۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے منہ میں الفاظ تھے نہ آنکھوں میں آنسو٬ اِدھر اُدھر دیکھتے اور ہلکی ہلکی سسکیاں لے کے خالی نظر سے خاموش ہو جاتے٬ اچانک کوئی بوڑھا پکار اٹھا٬ ہائے میرے پانچ جوان شیر بیٹے...... ظالموں نے میرے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جو اپنی جوان بہنوں کی عزت بچانے کو آگے بڑھے ظالموں نے مار کے بھی نہ بخشا٬ میری بیٹیوں کو اٹھا کے لے گئے ٬ہائے مجھ بدنصیب کو اکیلا چھوڑ دیا۔ کوئی شخص آگے بڑھا اور بوڑھے کو گلے لگایا عورتوں کی دبی دبی چیخیں بُلند ہوئیں۔

رضا اور علاقے کے لوگ حیرت وخوف سے یہ خون رنگ منظر دیکھ رہے تھے٬ حیرت سے زبانیں گنگ تھیں ابھی ان کے علاقے میں میاں جی اور سکھ برادری کے اثر ورسوخ کی وجہ سے یہ سب نہ ہوا

تھا لیکن انہیں دیکھ کے دہشت وخوف کی جو لہر ا
سے اُٹھی٬ رضا نے چاہا کہ وہ واپس چلا جائے۔
چندر !! چچا اور دوسرے مسلمانوں کو حفاظت
ٹرینوں میں سوار کرا دے گا اور وہ خود میاں جی
ساتھ ہی آئے گا چچاؤں نے سُنا تو کہا کہ ا
بڑے قافلے کی سرکوبی کے لیے ہم نہ کافی ہیں ا
نہ ہونے کے برابر ہے راستے میں کچھ بھی ہو سکتا
تمہارے ساتھ آئے ہوئے تمھارے دوست
ساتھ جانے سے انکار کر سکتے ہیں اس لیے ان س
مسلمانوں کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔ سب
بھی سُن کے منع کر دیا اور یاد دہانی کروائی کہ می
جی نے وعدہ کیا ہے تو وہ ضرور آئیں گے تم فکر ن
اللہ نے چاہا تو باقی سب صبح کی ٹرین سے ہم
آملیں گے۔ رضا نے سب کی طرف دیکھا
چہرے پہ فکر غم افسوس کے ساتھ آس وامید کے د
بھی جھلملاتے نظر آئے٬ میاں جی کی آواز کا
میں گونجی٬ میرے بیٹے اس کام کو احسن طریقے
کریں گے٬ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو چ
دھکیلتے ہوئے رضا اک نئے جوش اور ولولے
اٹھا٬ جیسے میاں جی کے بھروسے کو کبھی ٹوٹنے نہ د
گا..

پانچ گھنٹوں کے طویل انتظار کے بعد ٹر
اسٹیشن پہ آرکی تو اسٹیشن پہ بیٹھے لوگ جلدی
افراتفری میں سوار ہونے لگے چند منٹوں میں
ٹرین کھچا کھچ بھر گئی اور اپنے وطن کی مٹی کی سون
خوشبو پانے کو نئے سفر پہ رواں دواں ہو گئی۔

آہستہ روی سے چلتی گام ابھی پنڈ کال
خاصہ تک کا سفر طے کر پائی کہ اچانک دور سے آ
کے بادل منڈلاتے دکھائی دیئے٬ تھوڑی دیر
لیے ٹرین کو روک دیا گیا دو بلوچی رجمنٹ کے جو
اُترے کہ جا کے دیکھیں شاید کسی کو مدد کی ضرور

ہو' پتہ چلا کہ پہلے جو ٹرین کھچا کھچ بھرنے کی وجہ سے تین سو ساٹھ علاقے کے مسلمانوں کو لیکے نکلی وہ بلوائیوں اور جتھوں کے ظلم کا شکار ہوگئی کسی بھی شخص کو زندہ نہ چھوڑا سب کو مار کے اب اِس ٹرین کو لوٹ مار کا نشانہ بنانے والے ہیں' یہ سنتے ہی مٹھی بھر فوجی رضا اور اس کے ساتھیوں نے پوزیشن سنبھال لی' شر پسند جتھے ٹولیوں کی صورت میں کرپانیں' تلواریں اور برچھیاں لہراتے اس ٹرین کی طرف بڑھے جونہی ان کی نظریں جوانوں اور بلوچی رجمنٹ پہ پڑی' اُنہیں وہاں تعینات دیکھ کے کسی سکھ اور ہندو کی جرات نہ ہوئی کہ آگے بڑھے' دور سے جانوروں کی طرح ست سری آ کال' خالصتان کی جے کے مکروہ نعرے لگاتے ٹرین سے دور ہو گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین نے اپنا سفر جاری رکھنے کا سگنل دے دیا' قریب سے گزرتے ہوئے اس اُجڑی اور بربریت کا نشانہ بنی ٹرین کو دیکھ کے ہر آنکھ اشک بہار تھی ہر دل خون کے آنسو رویا کٹی پھٹی لاشوں کا اژدھام تھا جو انسانیت کے رکھوالوں پہ کالا داغ تھا۔

کانپتے' سسکتے' سہمے وجود لیے حب الوطنی کے جزبے سے سرشار وطن کی سرحد پہ جونہی ٹرین رُکی تو دیکھنے والوں نے دیکھا ہر وجود' چاہے چھوٹا تھا یا بڑا' بچہ تھا یا بوڑھا' بیمار یا لاغر' وطن کی سوندھی مٹی پہ سر بسجود ہو گیا' اُس مٹی پہ جس کی خوشبو پانے کے لیے خون پانی کی طرح بہایا گیا آنکھوں کے سامنے پیاروں کے گلے کٹے' عزتیں لٹیں' جلتے مرتے دیکھا کِن کِن عذابوں سے گزرے ظلم و وحشت کے بازار گرم ہوتے دیکھے۔ (اب وطن کی مٹی کی خوشبو پانے کی وجہ سمجھ میں آچکی تھی)۔

کہ!! کیوں ہمارے قائد نے ایک الگ وطن کا

ہندوؤں کی مفادانہ چالیں زبان کا ہیر پھیر س
کھل کے سامنے آچکا تھا' اتنا اندوہناک ا
جسے دیکھ کے انسانیت بھی شرما جائے۔

میاں جی نے تعلیم کے دوران جو گھر بیٹوا
لے کر دیا تھا آج کڑے وقت میں وہ کام آ
باقی آئے مسلمان گورنمنٹ خیموں میں منتقل ہو
ہر آنے والا شخص بے چین و مضطرب اپنے پیاروا
متلاشی تھا کہ کب صبح ہو اور وہ اپنوں سے ملیں جنہ
وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

اسی ادھیڑ پن میں صبح کی سپیدی نمودار ہو
ہر شخص ریلوے اسٹیشن دوڑا' پہلی گاڑی کے آ
بھگدڑ رچ گئی لوگ دیوانہ وار گاڑی پہ ٹوٹ پڑے
شاید ان میں کوئی شناسا چہرہ دکھائی دے جائے
میری ماں اسی میں ہو' کہیں میری ماں جائی
کوئی بوڑھے باپ کا متلاشی' ہر آنکھ غم کی تصویر
بس اک اُمید' اک بھروسہ۔

ٹرینوں کی ابتر حالت دیکھ کے ہی سب اند
کر چکے تھے کہ آنے والوں پہ کیا کیا قیامتیں ٹوٹی
' ہر چہرہ وحشت زدہ' ڈرا سہما' ہندوؤں کے ظل
داستان رقم کر رہا تھا۔

اک قیامتِ صغریٰ تھی جو تقسیم ہند کی صو
میں مسلمانوں کی جھولی میں ڈال دی گئی تھی۔

اسٹیشن سے ہزاروں لوگ ناکام لوٹ آ
انھی میں رضا اور اس کی فیملی تھی دو ٹرینوں
کسی ٹرین کا سگنل نہیں آیا دوسرا دن اور رات
بیقراری و بے چینی میں گزر گئی۔

تیسرے دن دوبارہ سب اسٹیشن پہ پہنچ گے
گھنٹے انتظار کی سولی پہ لٹکتے گزر گے' بالآخر
اسپیکر پہ اعلان ہوا ٹرینوں کی آمد و رفت پیچھے
روک دی گئی ہے۔ اب انڈیا سے کوئی ٹرین

فضا میں سانس لینا مقدر تھا وہ ہر رکاوٹ و جبر روندتے آ گئے اور جن کے نصیب میں غلامی کی مہر چسپاں تھی وہ وہی رہ گے۔

انڈیا اور پاکستان کے بیچ نفرتوں کدورتوں' ظلموں و ناانصافیوں کی خونی دیوار کھینچ گئی......''

رضا اور دونوں بھائی جو دو دنوں سے ریلوے اسٹیشن پہ مارے مارے پھر رہے تھے اِس آس پہ کہ شاید کوئی ٹرین آ جائے۔ مسافروں میں کوئی چہرہ دِکھے جو اپنا ہو۔ جنہوں نے وعدے کیے تھے شاید اپنا وعدہ ایفاء کرنے آ جائیں لیکن (یہ معجزہ نہ ہوا)! اسی کشش و پنج میں پندرہ دن گزر گے۔ نہ ادھر سے کوئی خبر آئی نہ ادھر والوں کو صبر!

حالات کی کشیدگی کچھ کم ہوئی تو ہمسایہ ملک سے ٹرینوں کی آمدورفت جاری کر دی گئی' خبر سنتے ہی جو اپنے پیاروں کو پیچھے چھوڑ آئے تھے فوراً سے پیشتر ٹرینیں پکڑ کے انڈیا روانہ ہو گے' انہیں میں رضا اور دونوں چچا شامل تھے جو امرتسر جانے کو بے تاب تھے تمام راستہ کیسے کٹا وہ خود نہ جان سکے' کوئی دعا ایسی نہ تھی جو لب پہ نہ ہو۔ خُدا خُدا کر کے سفر تمام ہوا' جونہی انڈیا اسٹیشن پہ قدم رکھے تمام واقعات نظروں کے سامنے گھوم گے' وہی گلیاں' وہی بازار' وہی سڑکیں' آہ......درد والم کی تصویر بنے ظلم و بربریت کی داستاں سُنا رہے تھے' مسمار دوکانیں' جلے منہدم گھر' ملبوں کے ڈھیر...... پرکاش بابو کے گھر کا اَدھ ٹوٹا دروازہ کھٹکاتے تینوں کی آنکھیں اشک بار تھیں' اپنی حویلی کا خون رنگ منظر وہ دیکھ چُکے تھے' لیکن پھر بھی اک اُمید اک بھرم' اک آس۔ کہ شاید......

سفید ساڑھی میں ملبوس بیگم پرکاش ،جنہیں سب چاچی کہتے تھے حیرت وافسوس سے اُنھیں دیکھ رہی تھی' جیٹھ کی ... میں بیٹھا ... اپنی ساڑھی کے پلو

سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی' (تیرہ اگست) کبھ
نہ بھولنے والا دن' جب رضا اور خاندان ک
دوسرے افراد ڈیڑھ ہزار کے قافلے کے سات
ہجرت کر گے تو کینہ دوز ہندوؤں کی نظر سے پوشی
نہ رہ سکے وہ دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ ا
مسلمان ان کے ہاتھوں شکار ہونے سے بچ کی
گے؟ رات بارہ بجے کی ٹرین سے باقی بچے ہو
مسلمان قافلے کو روانہ ہونا تھا' جن کی تعداد ساڑ
چھ سو ہو چکی تھی انہیں لے کے میاں جی نے نکلنا
جانے کے سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔

نجانے بلوائیوں کو کس نے اطلاع دی ک
جس علاقے سے ہجرت ہوئی ان کے باقی سا
بھی ہجرت کرنے والے ہیں بعد میں اپنے تئیں
چلا کہ اطلاع دینے والا محلے کی نکڑ پہ بیٹھنے والا ر
داس تھا جس نے بالا آخر مسلمانوں سے نفرت
بغض کا اظہار کر ہی دیا' جس کا دینا ناتھ کو بڑا افسو
تھا۔

آپ لوگوں کے جانے کے ٹھیک گیارہ گھنٹو
بعد بلوہ ہو گیا' دینا ناتھ اور میرے شوہر پرکاش
اُنھیں روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی' وہ تعداد
زیادہ تھے' لڑائی میں چھینا جھپٹی کے دوران جتھے
دینا ناتھ اور پرکاش کے ساتھ اُن نو سکھوں کو بھی
ڈالا جو انہیں بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی
رہے تھے' اس طرح دینا ناتھ اور پرکاش بابو نے
مسلم ہوتے ہوئے بھی اپنی جانوں کا نذرانہ د
بچپن کی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اب میدان صاف
اس جتھے کو روکنے والا کوئی نہ تھا اسلحہ نہ ہونے
برابر تھا۔ حملہ آوروں نے حویلی کے اندر تاک تا
کے وار کیے حویلی کے اندر تعداد زیادہ ہونے
باوجود سب نہتے تھے اپنی جانیں' عزتیں بچا
کے لیے سب اپنے ... ڈنڈوں ... سے مقابلہ کرنے

سرتوڑ کوشش کر رہے تھے بندوقوں' کرپانوں'
تلواروں کے زعم میں انسانی جانوں سے کھیلنے والے
نفرت کی آگ میں اندھے ہو چکے تھے گلی کے تمام
راستے بند کروا دیے گے تاکہ کوئی بھی مسلمان زندہ
نہ بچ سکے۔ مسجدوں میں پناہ لینے والوں کو گلیوں میں
کھینچ کھینچ کے ذبح کیا گیا۔ آخر کار سکھ جتھیانی
کرپانوں اور تلواروں کے بل بوتے پہ چھتوں کو
پھلانگتے حویلی میں داخل ہو گے۔ پانچ سو بندوں کو
بھیڑ بکریوں کی طرح چن چن کے مارا گیا۔ جس
میں میاں جی اور بی جی کے ساتھ محلے کے دوسرے
خاندان شامل تھے۔

لڑکیوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر اپنے
خاندان کی عزتیں بچائیں اور موت کو گلے لگا لیا انھی
میں تمھاری لاڈلی بہن کشمالا بھی تھی جو ظلم کا نشانہ
بنی' ظالموں نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا ساری حویلی پہ
مٹی کا تیل چھڑک کے آگ لگا دی ......انصاف
کے ٹھیکیداروں نے جھوم جھوم کے اپنی بیایمانیوں
کے تماشے دیکھے۔

آفتاب نے شرم سے ٹوٹے ہوئے بازوؤں
اور ڈوبتے ہوئے حوصلوں کا آخری منظر دیکھ کے
بادلوں میں منہ چھپایا' شام کے دھندلکے آگ کے
شعلوں میں اور زیادہ اندوہناک منظر پیش کر رہے
تھے' جلتے ہوؤں پہ شعلے برساتی گولیاں اور درندوں
کے نعرے پنتھ کی جے خالصتان کی جے چاروں
طرف ظلم و بربریت کا ایک سیلاب تھا جو اُمنڈ پڑا تھا
اقوامِ متحدہ کی راہنمائی کا دعوی کرنے والی
سلطنت کی سرپرستی میں لڑنے والا لشکر بالآخر اپنے
حریف پہ غالب آچکا تھا' سکھوں کی کرپانوں کے
لیے بچوں' بوڑھوں' عورتوں کی گردنوں تک جانے کا
راستہ صاف ہو گیا تھا۔ بیگم پرکاش کے ساتھ دونوں

رہے۔ وہ چیخ چیخ کے انصاف کی رٹ لگانے والو
سے پوچھنا چاہتے تھے۔ کہ اسے کہتے ہیں انصاف
کیا ایسا انصاف کسی بھی کتاب میں پڑھا۔ جسے
لوگوں نے پتھر کے زمانے کی وحشت و بربریت ک
کو بیسوی صدی میں اپنی بددیانتی و بے ایمانی سے
تازہ کر دیا۔

ماں باپ کو لینے آئے تھے ان کی قبروں کے
نشان تک نہ پا سکے۔ یہ ایک کہانی نہیں وہ سچائی ہے
جو ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں کے
چراغ گل کرنے کے بعد کڑوڑوں گھروں کو آزاد
کی صورت میں نصیب ہوئی۔

ہم مقروضوں کے لیے چودہ اگست کی تار
صرف گورنر ہاؤس میں تقریب کا نام نہیں اور نہ ہ
اُن شہداء کو سلامِ عقیدت پیش کرنے کے لیے چو
توپوں کی سلامی ہے۔ جن کی گن گرج میں نہ
مسلمانوں کے خون کے چھینٹے' بیٹیوں' بہوؤ
ماؤں کی لٹتی عزتیں۔ ان کی چیخ و پکار کو دبا دیا ج
ہے۔

یہ دن رائیگاں جانے کا نہیں بلکہ تاریخ کے س
باب سے کچھ سیکھنے اور آنے والی نسل کو سکھانے
دن ہے۔ اگر اب بھی ہم اور ہمارے بھائیوں
ہوش کے ناخن نہ لیے تو ہمیں اور ہماری آنے وا
نسلوں کو کوئی بھی مردِ مجاہد ذلت و رسوائی سے نہ
سکے گا۔

ہمارے لیڈر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ا
ملک کو حاصل کرنے کے بعد ہی تو اسی قوم
نونہالوں سے کہا تھا۔

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس ملک کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے

اللہ تعالی ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

☆☆☆



وہ اچھی لڑکی تھی بس کم ظرف لوگوں کے عتاب کا شکار ہونے لگی تھی۔مگر اس کا رب اس کے ساتھ تھا' معاشرے میں پنپتی ایسی برائی جو بڑی تیزی سے ہر گھر میں داخل ہو رہی ہے جہاں ہر شخص دوسرے پر کیچڑ اچھالتا نظر آتا ہے

عظمیٰ صدیقی

آج رات بھی روتے روتے کب اس کی آنکھ لگ گئی اس کو پتہ ہی نہ چلا۔رقیہ نے اس کو صبح فجر کے لیے اٹھایا مگر وہ سننے کے باوجود بھی نظر انداز کر کے سوتی رہی۔ نیند پوری کر کے وہ دیر سے اٹھی اور فریش ہو کر کچن میں رقیہ کے پاس آ گئی۔رقیہ نے اس سے اس کے رویہ کی بابت پوچھنا چاہا مگر پھر اس کی بادامی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو ارادہ ملتوی کر دیا اور ناشتہ اس کے آگے رکھا۔اس نے صرف چائے کا کپ اٹھایا اور اپنی پسندیدہ جگہ آ گئی۔اسے باغبانی کا بہت شوق تھا، گھر چھوٹا ہونے کے باوجود بھی اس نے صحن کے اطراف میں بہت سارے پودے لگا رکھے تھے۔خوشنما پھول اور پودے کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن سے کل کی باتوں کا اثر زائل ہو چکا تھا۔

"امی! آپ نے میرے گلاب کے پودے کو پانی دینا چھوڑ دیا ہے؟ دیکھیں کیسے مرجھا رہے ہیں۔" کل کے بعد یہ پہلی بات تھی جو اس نے کہی تھی۔

بھی۔" رقیہ نرمی سے بولیں۔

"کیوں پریشان ہو کل سے؟"

"بس طبیعت خراب ہے۔" وہ ٹالنے انداز میں بولی۔

"ماہا! تم میری ماں نہیں ، میں تمہاری ہوں۔تم مجھ سے چاہ کر بھی کچھ نہیں چھپا سکتی، میں کیا بات ہوئی ہے؟"

آفس کے نام پر وہ چونکی اور کو دیکھا۔آٹھ بج کر دس منٹ! آفس کی دیر چکی تھی، وہ انگلی پر حساب کرنے لگی، اگر آٹو پکڑ تو نو بجے تک تو پہنچ ہی جائے گی۔وہ جلدی تیار ہونے لگی۔

"آج چھٹی کر لو، ویسے ہی تمہارا ہاف ہے۔ بارہ تک واپس آ جاؤ گی۔ فائدہ کا۔" رقیہ اسکی تیاری دیکھ کر بولیں۔

"ضروری کام ہے، جانا پڑے گا۔" وہ اللہ کہہ کر نکل آئی۔

لگی۔کل والی بات اب تک اس کے ذہن میں نہیں تھی کیونکہ اسکا ابھی تک اس سے سامنا نہیں ہوا تھا، جس نے اسے ہرٹ کیا تھا۔

''مس ماہا آپ کو سر نے آ ڈی ارایم بلوایا ہے۔'' وہ اپنے کام میں اتنا مگن رہی کہ سعید کی آواز بھی نہیں سن پائی اور وہ چائے رکھ کر چلا گیا۔

تقریباً پچیس منٹ بعد وہ بہ نفس ونفس اس کے سر پر کھڑا تھا اور وہ ابھی بھی مصروف تھی۔چائے کا کپ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور اس پر بالائی کی تہہ آ گئی تھی۔اس نے اپنے بال کان کے پیچھے کرتے ہوئے سر اوپر اٹھایا، اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔وہ اب حیران اور کچھ خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مس ماہا! میں نے غالباً آپکو پچیس منٹ پہلے اپنے آفس بلوایا تھا؟'' اس نے اسے مخاطب کیا۔اسکا لہجہ اکھڑ تھا۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔کل سب
سامنے اس کی کی گئی بے عزتی یاد آنے لگی۔اس
اپنا چہرہ نیچے کر لیا۔

اور وہ جو بہت کچھ سنانے کے ارادے سے
تھا، اس کے آنسوں دیکھ کر خاموشی سے چلا گیا۔اس
جاتا دیکھ کر اسکا خوف کم ہوا، وہ بیٹھنے لگی تو نظر چا
کے کپ پڑی تو یاد آیا کہ سعید چائے دینے کے عا
کچھ کہہ کر بھی گیا تھا، اس نے تاسف سے ٹھنڈ
چائے کو دیکھا اور واپس کام میں مصروف ہو گئی۔

دو منٹ بعد ہی ایکسٹینشن سے کال کر کے م
نے اسے اپنے روم میں طلب کیا۔

وہ ہاتھ سے ڈوپٹہ درست کر کے برے دل
ساتھ معیز کے روم کی طرف چل دی۔روم کے
سر معیز کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''اس میں مس ماہا کی کوئی غلطی نہیں تھی سر، آ



کسی نے مس گائیڈ کیا ہے اور ویسے بھی اتنی چھوٹی سی مس انڈراسٹینگ کے تحت ہم کسی کو بے روزگار نہیں کرسکتے۔" وہ یقیناً باس سے بات کرنے میں مگن تھا۔

"سر آپ یقین کریں یہ اس کی پہلی اور آخری غلطی ہے، اور اخلاقیات کے حوالے سے بھی مس ماہا میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔"

وہ جو برے دل کے ساتھ آئی تھی، ایک منٹ میں خوش ہوگئی، سر معیز اس کو فرشتہ نظر آنے لگے۔ ورنہ کل پراجیکٹ میں جتنی بڑی غلطی اس سے ہوئی تھی اور سر معیز نے سب کے سامنے جس طرح بے عزت کیا تھا اس کے بعد تو اسکا خیال تھا کہ آج آفس میں اسکا آخری دن ہی ہوگا۔

"اوکے سر!" سر معیز نے کال ڈسکنکٹ کردی اور وہ دستک دے کر روم میں داخل ہوگئی۔

اب رونی صورت کے بجائے وہ ہلکی مسکراہٹ چہرے پر لیے کھڑی تھی۔

"مس ماہا!" وہ زرہ سخت لہجے میں بولا۔ "کل جو آپ سے غلطی ہوئی ہے وہ کسی طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ آئندہ مجھے آپ سے اس قسم کی کوئی شکایت نہ ہو۔ آپ جاسکتی ہیں۔"

"نیکسٹ ٹائم وِل نیور اگین۔" وہ مسکراتی ہوئی واپس آگئی۔

"عجیب لڑکی ہے جب میں صرف اس کے روم میں کھڑا ہوا تو رونے لگی اور ابھی میں نے اتنا کچھ کہا تو مسکرا رہی ہے بیوقوف۔" وہ بڑبڑا کر واپس لیپ ٹاپ پر مصروف ہوگیا۔

وہ مطمئن سی اپنی سیٹ پر آکر بیٹھی اور شروع سے اب تک کی تمام تر باتوں پر غور کرنے لگی۔ کس طرح وہ جاب کی تلاش میں اس کمپنی میں آئی۔ جاب تو اسے فنانس ڈپارٹمنٹ میں چاہیے تھی مگر وہاں جگہ نہ ہونے کے باعث اسے ریفوز کردیا گیا اور دوسرا

ڈپارٹمنٹ ریفر کردیا، جس کے بارے میں بلکل بھی نولیج نہیں تھی۔ لیکن اس وقت حالات حل کرنا زیادہ اہم تھا۔ وہ جس ڈپارٹمنٹ آئی اس میں صرف ایک لڑکی اور تھی، وہ بھی تیز باک۔ اور کہاں ماہا، تین گز کا ڈوپٹہ نماز کی طرح والی۔ اسکا انٹرویو سر معیز نے ہی کیا تھا۔ اور نے اپنے ٹیم ممبران سے اس کی ہائیرنگ کے میں رائے لی تو سب نے اس کو ریفوز کرنے کا

"سر معیز یہ اتنی ڈری سہمی لگ رہی ہے۔ کیا کرے گی؟" اک ممبر نے صاف کہہ دیا۔

اتنے میں سر معیز کو سر شمیم کی کال آگئی، وہ متعلق ہی بات کررہے تھے۔

"معیز جس لڑکی کو تمہارے پاس بھیجا ہے کسی بھی طرح ڈپارٹمنٹ میں ایڈجسٹ کرو ضرورت مند ہے۔ بھائی نہیں اسکا کوئی او صاحب کا بھی ایک ماہ پہلے انتقال ہوگیا ہے۔"

سر معیز سوچ میں پڑگئے کہ ٹیم ممبران کی را اہمیت دیں یا سر شمیم کو۔

"میں مس ماہا کو پندرہ دن کے مشاہدے رہا ہوں، اگر انہوں نے ایڈجسٹ کرلیا تو ٹھیک ہم انہیں ریفوز کردیں گے۔ از دیٹ کلیئر ٹو ون؟" انہوں نے روم میں آکر اپنا فیصلہ سنایا۔ خاموشی سے اپنی فائل سمیٹ کر روم سے نکل گ

وہ سر معیز کو ممنون نظروں سے دیکھتی باہر آگ

"آپ کل سے جوائن کریجیے گا۔" رسپش اسے دیکھ کر بولی اور کمپنی کے اصول اور دی بارے میں اسے سمجھانے لگی۔ وہ خوشی خوشی جی!" کرنے لگی۔

تب سے لے کر اب تک سر معیز نے سپورٹ ہی کیا تھا۔ اگر وہ سپورٹ نہ کرتے تو ہی تھا کہ وہ اس ڈپارٹمنٹ میں ٹک پاتی۔

معیز ہمیشہ اس کی چھوٹی چھوٹی غلطی کو ہائے لائٹ کرتے اور پورے ڈپارٹمنٹ کے سامنے اسے ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں ماہا اس وہ سے سر معیز سے بدظن رہتی تھی۔ اس کو نہیں پتہ تھا کہ سر معیز یہ سب اس کے اور اپنے کردار کو صاف رکھنے کے لیے ہی کرتا تھا۔ کیونکہ جس طرح سے معیز نے اسے آفس میں رکھا تھا اس کے بعد آفس میں سب کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس لیے ماہا کے ساتھ سخت رویہ رکھنا اس کی مجبوری تھی۔

ڈپارٹمنٹ میں دوسری لڑکی سدرہ تھی۔ اس کے بے باک اور ماڈرن انداز کی وجہ سے ماہا کو یہی گمان گزرا کہ وہ مغرور لڑکی ہوگی مگر وہ ایک ملنسار اور دوستانہ فطرت کی مالک تھی اس لیے ان دونوں کی جلد ہی دوستی ہوگئی۔

"میں نے ہمیشہ نوٹ کیا ہے کہ سر معیز ہر میٹنگ میں آپکو سپورٹ کرتے ہیں۔ اور اکثر پروٹکٹ بھی کرتے ہیں۔" سدرہ اس کے روم میں بیٹھی اس کو سمجھا رہی تھی۔

اس وقت سر معیز بوتل کی جن کی طرح حاضر ہوا اور اس کی عزت افزائی کرنا شروع ہوگیا۔ ابھی سدرہ جس طرح اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ سب زائل ہوگیا۔ اور اس کی آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا۔

"کیا لگتا ہے آپکو کہ آپ اتنی بڑی غلطی کر دیں گی اور کوئی آپکو کچھ نہیں کہے گا؟" اس نے فائل اس کی ٹیبل پر پھینکی۔ "آپ اس غلطی کی وجہ سے مجھے اتنی مشکل ہوئی ہے اگر آپکو کام نہیں کرنا تو گھر بیٹھیے، ہم سب کا وقت ضائع نہ۔۔۔۔" وہ اس کے آنسو دیکھ کر بولتے بولتے رک گیا اور اپنے روم میں چلا گیا۔

"میں کل سے نہیں آؤں گی۔" وہ روتے روتے ہوئے سدرہ سے بولی۔ ہر بار جب بھی اسے سر معیز سے ڈانٹ پڑتی تو وہ یہی کہتی تھی مگر معاشی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے مجبور ہو کر آجاتی تھی۔ اور آ بھی اسی وجہ سے وہ آفس آگئی تھی۔

☆......☆......☆

آپی نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا ساتھ میں لڑکیوں کی تصویریں بھی۔ وہ پورے ا ہفتے بعد آپی کے گھر آیا تھا۔

معیز نے کپ اٹھایا اور تصویروں کو نظر اند کر دیا۔

"آپی سوہا اور ریحام کہاں ہیں؟" اس نے ا بھانجیوں کا پوچھا۔

"اپنے بابا کے ساتھ باہر گئی ہیں، تم تصویر نہیں دیکھی۔" آپی خفا خفا سی تھی۔

"میری ڈولز کب تک آئیں گی؟" اس نے نظر انداز کر دیا۔

"تم انکو چھوڑو اپنی فیملی کا سوچو۔ تم اسٹیبلش سیٹلڈ ہو۔ کچھ سوچا اپنا۔ اور مجھے بھی اتنا شوق تمہاری شادی دیکھنے کا۔ کچھ اپنی بہن کے ارمانو بھی خیال کرو۔"

"ماموں!" سوہا اور ریحام اسے دیکھ کر خو سے چلاتی ہوئی آئیں۔

"بھئی سالے صاحب میری زوجہ محترمہ بلک بجا فرما رہی ہیں۔ بہت دن ہو گئے دعوت کھا ہوئے۔" تابش بچیوں کے ساتھ اندر آتے ہو بولا۔

"یار آپ لوگ بس بھی کریں۔" وہ کہہ کر سوہا ریحام کے ساتھ مصروف ہوگیا جو ایک اس کی گود میں اور دوسری اس کے کندھے سے لگی پتہ نہیں کون کون کہانی سنا رہی تھی اور وہ مزے لے کر سن رہا تھا۔

آپی کو غصہ آیا۔ "معیز میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو بتا دو باہر کہیں

آفس میں۔

آفس کے نام پر اس کی نگاہ میں ماہا گھوم گئی اور مسکراہٹ نے لبوں کو چھوا۔

"معیز! چھپے رستم! بتاؤ کون ہے؟" آپی تو فوراً پیچھے پڑ گئیں۔

"ارے میری بہن کوئی ہوگی تو بتاؤں گا نا۔" اس نے جان چھڑائی۔

☆......☆......☆

وہ آج آفس آئی اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ دس بجے اس کو احساس ہوا کہ سدرہ غیر حاضر ہے۔

"تم آج کیوں نہیں آئی؟" اس نے اخلاقی فرض نبھاتے ہوئے سدرہ کو کال کر کے پوچھا۔

"ہاں وہ میرے سسرال والے آرہے ہیں آج تو اس لیے چھٹی کر لی۔" اس نے وجہ بتائی۔

ایک ہی تو لڑکی تھی ڈپارٹمنٹ میں وہ بھی نہیں آئی۔ اسکا رہا سہا اعتماد بھی جانے لگا۔ صبح سے معیز سے سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ سدرہ کی غیر حاضری کی وجہ سے کام کا لوڈ ہوگیا تھا تو وہ اس میں مصروف ہوگئی اور اسکا دھیان بٹ گیا اور وقت جلدی گزر گیا۔ ساڑھے پانچ بجے عصر کی نماز پڑھ کر وہ ویٹنگ روم میں آگئی۔ اور وین کا ویٹ کرنے لگی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ معیز سیل فون کان سے لگائے اندر داخل ہوا۔

"جی جی او کے!" اس نے کال کاٹ دی اور سوالیہ نظروں سے ماہا کو دیکھا۔

اسے دیکھ کر ماہا کا حلق تک کڑوا ہوگیا، اس نے پہلو بدلا۔ ایک تو آج کا دن خراب اوپر سے موسم خراب پھر اس کھڑوس انسان سے سامنا۔ پورا دن ہی بُرا ہوگیا اسکا۔ معیز کا سوالیہ انداز اسے سمجھ نہیں آیا۔

"ماہا آپ اب تک کیوں نہیں گئی؟"

"سر وین نہیں آئی۔"

تیز سے بڑھ کر ہلایا۔

"ماہا آپ کی فیملی میں کون کون ہے؟" اس
یونہی برائے بات پوچھا۔

اس نے پہلے حیرانی سے اسے دیکھا۔ معی
اسکا یہ انداز دیکھ کر نظر انداز کر دیا۔

"میں اور امی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
پھر معیز کو یاد آیا کہ سر شمیم بتایا تھا کہ اس
کی کچھ دن پہلے ہی فوت ہوئے تھے۔ اب
اخلاقی فرض تھا کہ وہ بھی اس کی فیملی کے بار
پوچھتی، مگر اس سے پہلے کے وہ منہ سے کچھ بول
معیز بولے۔

"آپ کی وین کے آنے کے ٹائمنگ
ہیں؟"

"ساڑھے پانچ!"

"اور اب سوا چھ بج رہے ہیں۔ حد ہو
لاپروائی کی۔ اگر وین نہیں آئی تو پتہ کرتے ہ
آرڈ پارٹمنٹ سے۔ مگر آپ کا کچھ نہیں ہوسکتا
نے تاسف سے سر ہلایا اور موبائل سے ا
ڈپارٹمنٹ میں کال ملائی۔

"جی یہ مس ماہا کی وین اب تک کیوں
آئی؟"

"سر آج سدرہ غیر حاضر ہے اور انکا ڈرائ
خراب موسم کی وجہ سے نہیں آسکا۔ سو ابھی
ایڈجسٹ کریں۔

"تو یہ بات آپکو انفارم کرنی چاہیے انہی
کب سے آپکا یہاں انتظار کر رہی ہیں۔"

اس نے کال بند کر کے اسے صورتحال بتائ

"میں اب کیسے جاؤں گی۔ اس موسم میں
نہیں ملے گا۔" کہتے کے ساتھ ہی اس کے آ
میں آنسو آگئے اور وہ اپنے پسندیدہ مشغل میں مص
ہوگئی۔

پیشانی مسلی۔
''یہ رونا بند کریں اور میرے ساتھ آئیں۔''
وہ تھوڑا جزبز ہوئی پھر کھڑی ہو کر اس کے پیچھے ہولی۔
اسنے اپنی کار پارکنگ سے نکالی اور اس کو بیٹھنا کا اشارہ کیا، وہ پیچھے کا دروازہ کھولنے لگی مگر معیز کے گھورنے پر چارونہ چار فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔
پیچھے بیٹھنے پر شاید وہ سکون سے سر معیز کے ساتھ سفر کاٹ لیتی مگر آگے بیٹھ کر وہ تھوڑا نروس ہو رہی تھی۔
''سر میں آپکے ساتھ آ گئی تو کوئی ایشو تو نہیں ہوگا؟'' اسے فکر ہوئی۔
اس نے غور سے اسے دیکھا پھر ''نہیں!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
معیز جانتا تھا کہ چائے والے نے انکو ساتھ آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور کل یقیناً آفس میں چہ میگوئیاں ہو گئیں، مگر پھر بھی اس نے ماہا پہلے ہی پریشان تھی تو اس لیے اس نے اسے تسلی دے دی۔
انکی گاڑی سگنل پر رکی تو ماہا بے اختیار فٹ پاتھ پر کھڑے آئس کریم والے کو دیکھنے لگی۔ پہلے وہ آئس کریم کو دیکھ کر دیوانی کو جاتی تھی، اور پاپا سے ضد کر کے ضرور کھاتی تھی۔
''آئسکریم کھانی ہے؟'' معیز نے اس کی دلچسپی نوٹ کر لی۔
اسنے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''پاپا کے ساتھ جب باہر جاتی تھی تو وہ مجھے ضرور آئسکریم کھلاتے تھے۔'' وہ ماضی میں کھوئی ہوئی تھی۔
''آپ کی فیملی میں کون کون ہے؟'' خیال نے پر اس نے پوچھا۔
''میری ایک سسٹر ہیں، میرڈ ہیں! اور میری دو

اس نے سوالیہ نظروں سے سر معیز کو دیک
جہاں تک اس کے علم میں تھا سر معیز کی عمر تھا
سال کے لگ بھگ تھی اور انکی شادی بھی نہیں ہ
تھی۔ پھر یہ دوڈولز؟
''میری بہن کی بیٹیاں ہیں۔'' معیز اسکا سو
سمجھ گیا۔
رقیہ کا دل ہول رہا تھا۔ اسے دیکھ کر تسلی ہوئی۔
''میں سر معیز کے ساتھ آئی ہوں۔'' اس
مختصر ساری بات بتائی۔
''تمہیں معیز کے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔''
''جانتی ہوں، مگر فی الحال مجبوری تھی۔''
''جو ہونا تھا ہو گیا مگر آئندہ خیال کرنا۔'' انہو
نے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

☆......☆......☆

دوتین سے آفس میں سب کا رویہ اس کے سا
بہت طنزیہ اور روکھا پھیکا تھا۔ چائے والے
چائے اس کی ٹیبل پر رکھی۔
''ہر نمازی باحیا نہیں ہوتا، اور ہر با
پرہیزگار نہیں ہوتا۔'' چائے والا اونچی آواز میں س
سے بولا۔
ماہا حیرانی سے بات سمجھنے کی کوشش کر
لگی۔ سدرہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
کپ اٹھا کر سدرہ کے پاس آئی۔
''اس کی بات کا مطلب کیا تھا؟''
''اوہ کم آن ماہا۔ اتنی انجان نہ بنو۔ آج ک
آفس میں تمہاری اور سر معیز کے محبت کے افسا
گردش کر رہے ہیں۔ سب کی زبان پر ہی تم دونو
کی حسین شام کے قصے ہیں۔ لیکن ایک تمہیں وا
کردوں ماہا! سر معیز جیسے لوگ صرف مزے لو
ہیں، انجوائمنٹ دیکھتے ہیں۔''

کی ٹیبل سے ہی پیپر اور پین اٹھایا، چار لفظ گھسیٹے سائن کیا اور سر معیز کے روم کے باہر آ گئی۔اس نے ناک کیا تو اندر سے معیز نے ہاتھ سے دومنٹ کا اشارہ کیا۔وہ دومنٹ کا انتظار کرنے کے بعد ناک کرنے کی زحمت کیے بغیر اندر گھس گئی۔

معیز کال پر بزی تھا،کال منقطع کر کے اس کی حرکت پر غصے سے اسے گھورا۔

''مس ماہا آپ تمام مینرز بھول گئی ہیں کیا؟ میں نے آپ کو رکنے کا۔''

اس کی پوری بات سنے بنا پیپر آگے کر دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''میرا استعفیٰ!''

پہلے وہ حیران ہوا پھر اس کے ذہن میں آفس میں گردش ہونے والی چہ میگویاں گھوم گئیں۔اور اسے سمجھ آ گیا کہ کسی نے گردش ہونے والی بات اسے گوش گزار کر دی ہے۔

''ویسے یہ آپکا پرسنل میٹر ہے مگر کیا میں وجہ جان سکتا ہوں آپکی اس ناسمجھی کی؟''

''ہاں میں ناسمجھ ہوں اور سب سے زیادہ سمجھ دار ہی ں۔آفس کے ماحول سے اور یہاں کے لوگوں کی ذہنیت سے بھی آپ اچھی طرح واقف ہیں۔اگر اتنے ہی سمجھدار ہیں تو اس دن میرے پوچھنے پر جھوٹ کیوں بولا آپ نے کہ آپ کے ساتھ جانے پر کوئی ایشو نہیں ہوگا۔اور اس وقت آفس میں کوئی نہیں تھا، پھر کس نے بتایا یہ سب کو؟'' وہ غصے میں نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

وہ دم سادھے اسے سن رہا تھا۔

''آپ نے خود اس کینڈل بنوایا ہے اپنا اور میرا۔ اور آپ تو مرد ہیں۔ مردوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔وہ تو نہا دھو کر صاف ہو جاتا ہے۔

لگتا ہے۔ایسی لڑکی سے کون شادی کرے جس
ساتھ رسوائی اور بدنامی کے داغ ہوں۔کی
کریں گے؟نہیں! آپ تو بس انجوائے ک
تھے، اور وہ آپ کر چکے۔اب سب ختم! آپ
مجھے ڈس ہارٹ کرتے رہے، میں نے کچھ نہیں
اب نہیں۔''

''مس ماہا نہ میں ایریل ہوں نہ صرف
کے داغ دھوں کسی کے۔'' وہ ہنسا تھا۔

''آپ کو سب مذاق لگ رہا ہے۔می
میری جاب کی وجہ سے اتنا پریشان رہتی ہیں
بات انہیں پتہ لگی تو وہ۔'' آنسوؤں کا پھندا ا
حلق میں اٹکا اور اس سے مزید نہیں بولا گیا۔

''ماہا آپ خواہ مخواہ اتنا ایشو بنا رہی ہ
آرام سے بیٹھ کر یہ سیٹل ڈاؤن کر سکتے ہیں۔
''میں ایشو بنا رہی ہوں؟ آپ کو یہ چھ
بات لگ رہی ہے۔کوئی بھی ایسی لڑکی کو قبول نہ
جو اس کینڈلائز ہوئی ہو۔'' وہ مزید کچھ بھی
بنا اس کے روم سے باہر آ گئی۔

معیز لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔اس کی
نگاہوں نے دور تک ماہا کا پیچھا کیا۔وہ فیص
تھا۔اس نے آپی کو خوش خبری سنائی تھی۔و
سے جلدی آف کر کے نکل آیا، اور آپی کو مختصر
ت بتائی اور شام کو ماہا کے گھر جانے کے لی
کر لیا تھا۔آپی کی خوشی دیدنی تھی، جلدی جلد
ہو کر وہ دونوں کچھ دیر میں ماہا کے گھر تھے۔

رقیہ کے دروازہ کھولنے پر آپی نے آگے
اپنا تعارف کروایا۔رقیہ انہیں اندر لے آئ
چھوٹا تھا مگر صاف ستھرا تھا،صحن کے احاطے م
باغبانی پورے گھر کو خوبصورتی بخش رہی تھی۔
''ماہا کو بلوائیے!'' آپی کو ماہا سے ملنے

"کچن میں ہے میں بلاتی ہوں۔"

ماہا کچن میں سوچوں میں گم تھی، اس نے جاب تو چھوڑ دی تھی، مگر ٹینشن ہورہی تھی کہ امی کو کیسے بتائے گی۔

"مہمان آئے ہیں آکر مل لو۔" رقیہ کہہ کر چلی گئی۔

"پتہ نہیں کون آیا ہے۔" وہ بڑبڑائی ویسے بھی رقیہ اسے ہر آنے جانے والے سے ملواتی تھی کہ کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتائیں۔

ڈرائنگ روم میں آکر اس کی نظر ایک نفیس سی خاتون پر پڑی، اس نے انہیں سلام کیا۔ دوسری نظر جب معیز پر پڑی تو وہ حیران رہ گئی، معیز نے اس کی حیرانی پوری طرح سے نوٹ کی تھی۔

وہ معیز کی بہن سے ملتے ہوئے رکی نہیں۔ اسکا یہی خیال تھا کہ وہ آفس میں اسے نہیں سنا سکے تھے تو اب جی بھر کر بے عزت کرنے کے لیے گھر آگئے۔

میز کی بہن کو گندمی رنگت، متناسب جسامت اور بادامی آنکھوں والی ماہا بہت پسند آئی تھی۔ ماہا جلدی اٹھ کر کچن میں آگئی۔

"شاید آفس جوائن کرنے کے لیے انسسٹ کرنے آئے ہوں۔" اسے نیا خیال آیا۔

"ماہا! یہ کیا طریقہ تھا، مہمان بیٹھے تھے اور تم اٹھ کر کچن میں آگئی۔ میں اتنا پریشان تھی کہ تمہاری شادی کیسے ہوگی مگر تمہاری تو قسمت کھل گئی، مجھے تو یقین ہی نہیں آیا جب معیز کی بہن نے تمہارا رشتہ مانگا۔ اتنا اچھا کم گو، پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا لڑکا لگا مجھے معیز۔ بہت تکلیفیں دیکھیں ہیں تم نے بیٹا، بس اب معیز کے ساتھ خوش رہنا۔ اس کی بہن کو تو اتنی جلدی ہے شادی کی، کہہ رہی تھی کہ دو ماہ میں شادی کردیں گے ورنہ معیز پھر شادی سے انکار نہ کردے۔" رقیہ

"تو کیا یہ لوگ اس لیے آئے تھے؟" و
کے انداز میں بولی۔

"ہاں بیٹا شکر ادا کرو تم، میں بھی نماز پڑ
رہی ہوں۔"

امی کے جاتے ہی اس نے معیز کو کال کی
نے جو سنا اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ اتنا کچھ
تھا اس نے انہیں، پتہ نہیں وہ اب کیا کریں
کے ساتھ۔ کہیں شادی کے بعد چھوڑ نہ دیں۔

"ماہا میں وہ انسان نہیں ہوں جو صرف
باتیں کرتے ہیں، تسلی دے کر چلے
ہیں۔ میں تھوڑا پریکٹیکل بندہ ہوں۔ عمل پر یقین
ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"نہیں سر!"

"اور ہاں میں آپکے دامن پر لگے داغ کو
سرف شادی اور ہم سفر پاؤڈر سے دھوسکتا ہوں
دونوں سرف قبول ہیں تو نکاح نامے پر سائن
یہ سروس حاصل کریں۔" وہ شرارت سے بولا۔
جو پریشان تھی اس کی اس بات پر کھل کر مسکرادی

کال منقطع کر کے وہ سیل فون ہاتھ میں
میں اپنی پسندیدہ جگہ آگئی۔ اور آسمان کی
دیکھنے لگی۔ وہ مجبوری کے تحت معیز کے ساتھ ا
گاڑی میں گھر آئی تھی، اس کی نیت صاف تھی
بھی سب نے اس کو بدنام کیا، مگر وہ بھول گئی
نیتوں کا حال تو اللہ جانتا ہے، لوگوں کو کیا خبر ک
نیت کیا ہے تو وہ لوگوں سے اچھائی کی امید
کررہی تھی۔ آج اللہ نے اسے اس کی نیت
معیز کی صورت میں دے کر اس کے حق میں
فیصلہ کیا تھا۔ اسکا دل اللہ کے حضور شکر بجا لا
طمانیت سے مسکرانے لگی۔

☆☆……☆☆

ترکی میں عباسی

URDUSOFTBOOKS.COM

سچی کہانیاں کا پسندیدہ ترین سلسلہ
ایک بار پھر قارئین کے پُر زور اصرار پر......

قمر علی عباسی

ان میں سے ایک ہم بھی تھے۔ اینٹوں سے
بنے راستے پر چل کر مراد کے ساتھ ایک شیڈ میں

کھڑے ہوئے تو اس نے دیوار پر لگے نقش
مدد سے سمجھانا شروع کیا۔



ٹرائے شہر 3500 ق م میں تعمیر ہوا۔ اس کی نو تہیں ہیں۔ یعنی نو بار برباد ہوا اور ایک شہر پر دوسرا شہر آباد ہوا۔ ایک رنگین نقشے کی مدد سے ہر شہر واضح تاریخ کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ یہ یونانی' رومن کا پیریڈ رہا ہے اور اب موہن جودڑو کی طرح اس کے آثار ملتے ہیں۔ ہماری دلی بھی سات بار اجڑی' بسی بس فرق یہ ہے کہ اوپر نیچے آباد نہیں ہوئی ہم نے مراد سے پوچھا۔

''ٹرائے اب کب بسایا جائے گا......'' اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

ٹرائے کے بارے میں عجیب کہانی مشہور ہے۔ 3200 قبل مسیح پہلے ٹرائے میں کاشتکاری اور ماہی گیری کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ ان کے بادشاہ پرائم کی ملکہ حکوبہ نے خواب میں دیکھا کہ اس کے معدے سے آگ نکل رہی ہے۔ جس کا دھواں سارے شہر کی دیواروں کو ڈھک رہا ہے۔ یہ خواب جب اس وقت کے عالموں نے سنا تو تعبیر دی ملکہ کے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہوگا اسے فوراً ہلاک کر دیں ورنہ وہ ٹرائے شہر کو برباد کر دے گا۔ ملکہ حاملہ تھی اس کے بچہ پیدا ہوا تو اسے فوراً قتل کا حکم دیا گیا۔

جو شخص بچہ لے کر گیا اسے ترس آ گیا اور وہ بچہ جنگل میں چھوڑ آیا جسے ایک گڈریا لے گیا۔ اسے پال کر بڑا کیا اس کا نام پیرس رکھا۔ وہ بے حد حسین' بہادر اور عقلمند تھا۔

ایک بادشاہ نے اولمپس پہاڑ پر شادی کی دعوت کی سب کو بلایا لیکن ارس دیوی کو دعوت نہیں دی۔ کیونکہ وہ اکثر لوگوں کو ناراض کر دیتی تھی اور دیوتا اسے پسند نہیں کرتے تھے ارس کو غصہ آیا اور اس نے شادی کے ہال میں ایک سونے کا سیب چھینک دیا۔ اس پر لکھا تھا۔

''جو سب سے حسین ہو۔'' اس بات دیوی لڑنے لگی کہ وہ سب حسن و جمال میں تھیں اور ہر ایک یہ سیب چاہتی تھی۔ آخر میں دیویوں کو اس سیب کے لیے چنا گیا۔ ہیرا' ایتھنا' اور اپاروڈائس یہ تینوں ایک جج کے پہنچیں۔ اس نے کہا تم تینوں حسین و جمیل خوبصورتی میں لازوال ہو۔ میں کیسے ا کر سکتا ہوں تم لوگ ماؤنٹ ایڈا پر جاؤ وہاں ملے گا وہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ شہزادہ حسن کا پرستار......

یہ دیویاں دیوتا کے ذریعے پیرس کے پہنچیں تو وہ ان کے حسن کو دیکھ کر چکرا گیا اور فیصلہ کرنے میں دقت ہوئی تب تینوں نے رشوت کی پیش کش کی ہیرا نے کہا وہ اسے یو اور ایشیا کا بادشاہ بنا دے گی' ایتھنا نے اسے اور طاقتور بادشاہ بنانے کی پیش کش اپاروڈائس نے پیرس کو دنیا کی سب سے عورت پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

شہزادے نے حسین عورت کے چکر میں اپاروڈائس کو دے دیا۔ دو دیویاں ناراض ہ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا وہ ٹرائے کو برباد کر گی۔ اپاروڈائس شہزاد پیرس کو حسب وعدہ ا لے آئی جہاں دنیا کی حسین ترین عورت ہیلن تھی جو مینی لاؤس کی بیوی تھی۔ وہ اسپا بادشاہ تھا۔ اس نے پیرس کو بہت عزت دی نوازی کی اور اس پر مکمل اعتماد کیا۔ بادشاہ کس سے اسپارٹا سے باہر گیا۔

واپس آیا تو ہیلن پیرس کے ساتھ جا چکی تھی۔ بادشاہ نے اسے اپنی بے عزتی تمام یونانی بادشاہوں کو جمع کیا اور ہیلن کو

لانے کے لیے ٹرائے کا سفر کیا۔ اس میں سینکڑوں جہاز اور ایک لاکھ بہادر سپاہی شامل تھے۔ انہوں نے ٹرائے کے ساحل پر پڑاؤ کیا۔ پرائم کے بہت سے بہادر بیٹے اور آس پاس کے بادشاہ بھی مدد کو آگئے۔

جنگ شروع ہوئی اور یونانی بادشاہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ یہ جنگ دس سال تک لڑی گئی کچھ دیوتا ٹرائے والوں کے ساتھ تھے باقی یونانیوں کے ہمنوا تھے۔ جب دشمن لڑتا ہوا ٹرائے کے قلعے کی دیوار تک آ گیا تو پرائم نے طے کیا کہ پیرس اور ہیلن کا شوہر بادشاہ مین الاوس آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لیں۔

یہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو ناراض دیویوں نے لڑنے نہیں دیا اور پیرس بھاگ کر قلعے کی طرف آیا۔ لیکن ٹرائے والوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ وہ کہیں روپوش ہو گیا کچھ کا خیال ہے وہ ٹرائے شہر میں داخل ہو گیا تھا اس اور اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

یونانیوں نے ٹرائے کو برباد کرنے کے لیے ایک چال چلی۔ لکڑی کا ایک بڑا گھوڑا بنایا اس میں اپنی فوج کے بہادر جوان چھپا دیے۔ ایک سپاہی کو باہر چھوڑا اور جہاز لے کر سمندر میں روانہ ہو گئے۔ رات کو یہ کارروائی ہوئی' صبح ٹرائے والوں نے دیکھا یونانی بھاگ گئے تو وہ بہت خوش ہوئے اور باہر نکل کر اکیلے روتے سپاہی سے یونانیوں کے جانے کی کہانی سنی اور گھوڑے کو گھسیٹ کر قلعے میں لے آئے۔

اس رات سپاہی گھروں کو لوٹ گئے اور فتح کا جشن منایا جانے لگا رات کے آخری پہر لکڑی کے گھوڑے سے یونانی سپاہی ایک ایک کر کے نکلے اور قتل عام شروع کر دیا۔ شہر کو آگ لگا دی۔ کو گرفتار کر کے اس کے شوہر کے سامنے پیش گیا۔

جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا جب یو سپاہی جا رہے تھے تو ہیلن ان کے ساتھ تھی ایشیا کے شہر ٹرائے میں خون' لاش اور ہر طر دھواں تھا اور یوں اس کہانی کا انجام ہوا۔

اس عظیم شہر کے کھنڈرات پر ہم کھڑے جس کے بارے میں مراد بتا رہا تھا کہ اوپر شہر آباد تھے۔ باتیں کرتے وہ ہمیں پتھر سے راستے پر لے آیا۔ گھاس پر چند پرانے زما کے برتن رکھے تھے ایسے جن میں سندھ پنجا کے دیہاتوں میں اناج ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ کھدائی سے نکلے تھے' ہم دیکھنے لگے وہ آ بڑھتا رہا' پھر ایک چوڑی گلی جو چند قدم بعد ہوئی تو نیچے کھائی آ گئی۔

مراد کونے پر کھڑے ہو کر کھدائی کی تفص بتانے لگا۔ پھر اچانک ایک شکستہ زینہ اتر کر چلا گیا۔ جب وہ اتر رہا تھا ہم نے دل میں کہ گائیڈ کا پیشہ بھی عجیب ہے مراد غریب کو بغیر سہارے کے شکستہ بے ڈھب سیڑھیوں سے اتر نیچے جانا پڑا۔ اب ہم انتظار کر رہے تھے کہ وہ سے ہمیں بتائے گا اس جگہ کی تاریخ کیا ہے۔ لیکن اس نے زور سے کہا۔

''نیچے آ جاؤ۔'' ہم سیڑھیوں کے نزدیک اس لیے ہمیں سب سے پہلے سیڑھی سے اترنا ہم اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ خطرناک سیڑھیاں اب ہمیں اترنی تھیں اور تیزی سے باقی سیاح پشت پر تھے۔ ہم سمجھ ٹرائے کا سارا چکر اس لیے بنایا ہے کہ ہمیں ا زینے سے نیچے گرا دیں بلکہ ہم خود گر جائیں

3500 بل تیج کی شکستہ سیڑھیاں......

''مسٹر عباسی جلدی کریں۔'' مراد کی آواز آئی۔

ہم نے صدق دل سے اپنے خدا کو یاد کیا اور سیڑھی پر پہلا قدم رکھا پھر دوسرا اس کے بعد توازن برقرار رکھ کر دوسری سیڑھی پر' نہ جانے وہ کتنی سیڑھیاں تھیں۔ لیکن یوں محسوس ہوا ساری ترکی میں صرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ہیں' وہ ختم لینے کا نام ہی نہ لیتی تھیں ہم ان لوگوں کو یاد کرنے لگے جنہوں نے لفٹ ایجاد کی ہے۔ سیڑھیوں پر ریلنگ لگائی ہے پھر معجزہ ہو گیا سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور ہم اونچے نیچے راستے پر آ گئے اور ہمارے ساتھ دوسرے سیاح بھی' یہاں دو طرف بڑے بڑے پتھروں کی دیوار تھی جن کے بارے میں مراد بتا رہا تھا۔

اس کی ساخت مضبوطی اور تاریخ' ہمیں صرف ایک خوف تھا اسی راستے سے واپسی ہو گی تو کیا ہو گا' باتوں میں مصروف مراد آگے بڑھا دونوں دیوار ختم ہوئی اور عجیب طرح کے ٹیلے شروع ہو گئے اور مراد کا حکم کہ ان پر چڑھو' چار سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی تھیں بغیر سہارے کے وہ چڑھیں تو چھ نیچے اتر گئیں۔ یہ سب ٹوٹی پھوٹی اور بے ہنگم تھیں۔

پہلے ہم صرف نیچے دیکھتے جب سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ اتر جاتے تب اطمینان کا سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھتے اور دل ہی دل میں ہیلن کو برا بھلا کہتے جاتے کہ لعنت ہو اس عورت پر کہ اچھے خاصے بادشاہ کو چھوڑ کر ایک ننگے شہزادے کے ساتھ بھاگ لی جس کے نتیجے میں پورا ٹرائے تباہ ہوا اور ہمیں ملے تو کھنڈر......

مراد نے ایک ٹیلے کا رخ کیا۔ اس کے پیچھے سیاح چل پڑے ان میں ہم بھی شامل تھے۔ شکستہ ٹوٹے' اکھڑتے بے ڈھب پتھروں پر پاؤں رکھتے' اوپر چڑھنے لگے۔

وہاں کیا تھا ایک طرف کھائی اور دو پہاڑ ان کے درمیان کھیت' اس کی بھی ایک تاریخ تھی۔ غالباً یونانی اس میدان میں دس سال تک ایک بے وفا عورت ہیلن کے لیے جنگ لڑتے رہے۔ یہاں سے مراد کو منظر اچھا نظر آ رہا تھا۔ سیاح تو ویسے ہی باؤلے ہوتے ہیں۔ وہ تصویریں بنانے لگے۔ اس سے بہتر ہے انسان جہاز کی کھڑکی سے یا ہیلی کاپٹر سے اس قسم کے میدان اور کھیت دیکھ لے۔ لیکن سیاح کا کام دیکھنا اور تصویریں اتارنا ہے۔ ہم سوچتے ہیں اگر دنیا میں سیاح نہ ہوتے تو کیمرے اور فلموں کے لاکھوں رول کیسے فروخت ہوتے۔ یوں یہ انڈسٹری اس طرح نہ پھلتی پھولتی۔

ٹیلے سے اتر کر سیڑھیاں پار کر کے ایک لکڑی کے پل پر چڑھے۔ دونوں طرف گہرائی تھی مراد نے بتایا یہاں سے ایک جرمن نے ٹرائے کا خزانہ نکالا۔ وہ ایک ماہر آثار قدیمہ ہچلی مان تھا یہ جرمن تھا اسے آثار قدیمہ سے عشق تھا۔ ٹرائے آیا تا کہ پرانا خزانہ تلاش کر سکے۔ اپنی روسی بیوی کو طلاق دی اور یونانی عورت صوفیہ سے دوسری شادی کر کے یہاں آ کر عثمانی بادشاہوں سے اجازت لے کر کھدائی شروع کی اور پیرس کے باپ پرائم کا خزانہ نکال لیا اور کسی طرح ترکی سے باہر لے گیا۔ پہلے وہ خزانہ جرمنی میں رہا پھر جنگ عظیم کے بعد روس کے میوزیم میں رکھا گیا۔ سنا ہے ہیلن کے گلے کا ہار ماسکو کے میوزیم میں رکھا ہے۔ کچھ حصہ استنبول کے عجائب گھر میں ہے اور اب بھی بہت خزانہ اندر دفن ہو گا۔

''تم کوئی خزانہ نکالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔'' وہ ایک آہ بھر کر رہ گیا۔

ٹرائے کا علاقہ ہمیں پسند نہیں آیا۔ پہلے ایک بے وفا کے لیے شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ پھر وہ جرمن جو خزانے کی تلاش میں آیا اسے بھی پہلی بیوی کی قربانی دینی پڑی۔ خواتین اس علاقے سے ہوشیار رہیں اور مرد بھی احتیاط رکھیں۔ لکڑی کے پل سے دوسری طرف اتر گئے۔ یہاں ٹرائے والوں کے چھوٹے چھوٹے تھیٹر تھے جہاں روساء موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ اس کے بعد کچھ گھروں کے حصے جو شکستہ ستون اور دیواریں...... اور اُن کے درمیان بغیر ٹوٹے پتھروں کی ایک پگڈنڈی تھی جو کوچ تک لے جا رہی تھی...... ٹرائے میں اُس وقت سب سے اچھی یہی پگڈنڈی لگی۔

☆......☆......☆

ازمیر کا ساحل

کوچ جنگل سے گزر رہی تھی دونوں طرف ہرے درخت تھے۔ جن میں زیتون لگے تھے مراد کا کہنا تھا پہاڑوں اور جنگلوں میں یہ خود بخود اُگ آتے ہیں۔ ہمیں اس کی بات پر شک تھا مگر اظہار نہیں کیا...... ترکی ان ملکوں میں شامل ہے جو دنیا میں زیتون اُگاتے ہیں۔ جگہ جگہ نارنگیوں کے باغ بھی آتے ہیں۔

سردیوں کے موسم میں شاخیں نارنجی پھلوں سے لدی تھیں۔ اِن کا ذائقہ کھٹا ہوتا ہے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ترکی میں نارنگی کا رس نہیں ملتا۔ پورے ملک میں کوئی بوتل یا ڈبا نہیں ملا۔ ہوٹل میں تازہ رس نکال کر دینے کا رواج ہے۔ ہم چاہتے تھے کوچ میں ساتھ لے کر چلیں

راحت کا سامنا کریں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ہوٹلوں میں ناشتے یا رات کے کھانے
بھلے نارنگیاں نظر آتی تھیں تو حجم میں
ذائقے میں ترش' ہمیں تو یوں محسوس ہوا
ملک میں نارنگیاں سجاوٹی ہیں صرف دکھا
لیے۔

جنگل سے کوچ گزر رہی تھی تو بارش
لگی۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں پھر شہر آ
سڑکیں پھیل جاتیں' پھر سکڑ کر ایک رہ جا
ہم سفر کرتے ترکی کے شہروں میں چاہے
ہی چھوٹے ہوں اپارٹمنٹ میں رہنے
ہے۔ ان کی تعمیر کثرت سے ہوتی ہے
خیال ہے ملک میں افراط زر اور غربت کی
پیداواری سرگرمی ہے۔

ایک جگہ کافی کے لیے رُکے تو فورا
چاروں طرف سے دھویا گیا۔ ڈرائیور
ہوٹل کے باہر دو آدمی نل سے پانی ڈا
بڑے برش سے کوچ کے شیشے صاف کر
ناشتہ کیے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن ہر ا
کی طرف لپکا۔ بعض نے باتھ روم کا رخ
کا ٹکٹ دو لاکھ لیرا تھا۔ یہاں ترکی کے
کے ساتھ دوسرے ملکوں کے جھنڈے بھی ا
تھے لیکن پاکستان کا نہیں تھا۔

کوچ روانہ ہوئی تو منظر بدل گیا
طرف نیلے پانی کی ایک طویل جھیل پھیل
کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر جاگتا
مصروف پھر یہ گزر گیا تو گامہ آ گیا۔ لوگ
بھرا بازار' ایک جگہ رک گئے۔ مراد نے
طرف اشارہ کیا اور سب کو لے کر داخل
سکلام ریسٹورنٹ ہے۔

ہے جس سے گرم گرم نان نکل رہے تھے۔

دوسری طرف لائن سے شیشے کے کاؤنٹر میں کھانے سجے تھے۔ مراد نے کھڑے ہوکر سب کا آرڈر لیا۔ ہم نے چکن کباب اور پانی منگایا گرم نان مفت تھے اس سہولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ وہاں ہر طرف ترکی میں لکھا تھا صرف ایک جملہ انگریزی کا تھا۔

''آپ کی پلیٹ کے لیے منفرد نام......'' یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سفر کے دوران جو بات سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے لیے ذہن پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے۔ سامنے پوسٹ آفس تھا۔ ہم عمرات میں داخل ہو رہے تھے تو ایک گھبرائی ہوئی خاتون سامنے آ گئیں اور پوچھا۔

''بینک کہاں ہے......'' پوسٹ آفس کے برابر اس کا بورڈ ہم دیکھ چکے تھے۔ ہم نے رہنمائی کی تو وہ بے حد ممنون ہوئیں یہ آئیڈیا تھیں۔

ہماری سفر کی ساتھی' ایک دن ریسٹورنٹ میں اپنے خاندان کی تصویریں دکھانے لگیں۔ اپنی بیٹی کی تصویر دکھائی پھر اس کی خاصی بڑی بیٹی کی سالگرہ کی تصویر دکھا کر خوش ہونے لگیں۔ اسی طرح بیٹے اور اس کے بیٹے کی تصویریں دکھانے لگیں یعنی موصوفہ پرنانی اور پردادی تھیں۔ اپنے منہ سے عمر ستر سے اوپر بتا رہی تھیں ہم نے انہیں غور سے دیکھا۔

بڑی بی کو اس عمر میں سیاحت کا شوق ہوا ہے۔ وہ کہنے لگیں سال میں دو بار سیر کو نکلتی ہوں۔ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتی ہیں۔ ٹکٹ وکٹ کا انتظام کر کے سفر کرتی ہیں۔ ہم ان کی ہمت کی داد دینے لگے اور اپنے سفر کے بارے میں ہم بھی ان سے لمبی لمبی گپ لڑانے لگے۔ وہ حیران ہو کر

جب تک آئیڈیا نے ڈالر کیش کرائے۔ ہم نے پوسٹ آفس سے فون کارڈ خریدا۔ باہر نکلے تو ایک دکان والے نے دبوچ لیا اور اصرار کرنے لگا کہ کچھ خرید لیں۔

ہم نے استنبول کی کتاب خریدی تو اس نے ملا نصیر الدین کا گدھے پر اُلٹا بیٹھا ایک مجسمہ بھی دے دیا اور قیمت بھی بہت کم کر دی۔ ترکی میں قیام کے دوران ہمیں لیرا کبھی سمجھ میں نہیں آئے۔ اس لیے امریکی ڈالر میں قیمت پوچھتے تب جا کر ادائیگی کرتے۔

جہاں سگلام ہوٹل تھا اس کے سامنے ایک چوراہا اور ایک پرانی مسجد تھی وہاں ظہر کی اذان ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں آدمی سربسجود ہو گئے۔ اس بات کی خوشی ہوئی کہ مسجدیں آباد ہیں۔

پرگامہ کی ایک گرم دوپہر کے بعد کوچ میں بیٹھے تو شیخ صالح ہمارے سامنے ایک پیکٹ لے کر آیا اور کہا۔

''اس میں سے کچھ لے لیں۔'' یہ سوکھی ہوئی خوبانیاں تھیں جو ہمیں پسند نہیں۔ لیکن صالح نے ضد کی' یہ رمضان ہے۔' اور ہم نے رمضان کے احترام میں خشک خوبانی اٹھا لی۔ اس نے بس میں ہر ایک کو دیں اور سب نے رمضان کی وجہ سے کھائیں۔ صالح کے خیال میں وہ ثواب کا کام کر رہا تھا۔ مراد نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور کوچ میں سوار ہو گیا۔ ہماری منزل ازمیر تھی۔ جو ترکی کا تیسرا بڑا اور اہم تجارتی شہر ہے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے اس کی آبادی 62 ملین تھی۔ ہم جا رہے تھے تو ازمیر کی آبادی کا بڑھنا ضروری تھا۔

اپنے آپ کو ایک عظیم الشان شہر میں دیکھا۔ ہر طرف روشنی‘ چوڑی سڑکیں اور جگمگاتے بازار‘ بائیں طرف دور تک پھیلا سمندر‘ ہم سمندر کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔

سمندر کے کنارے سیمنٹ کا راستہ اور بڑی فٹ پاتھ ہے جس پر جگہ جگہ بنچیں بنی ہیں۔

مراد نے کوچ ایک طرف روک دی اور بتایا۔

’’سامنے بینک ہے اس طرف واش روم ہیں۔‘‘ آدھے گھنٹے بعد یہاں سے روانہ ہوں گے۔ آپ لوگ ساحل سمندر دیکھ لیں۔‘‘ اس کا مطلب تھا ازمیر میں ہمارا طعام وقیام نہ تھا۔

اس سرزمین پر چہل قدمی کے لیے ہم کوچ سے اتر گئے اور ایک گروپ کے ساتھ ایک طرف چل دیے یہ لوگ باتھ روم کی تلاش میں تھے وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک طرف خواتین دوسری طرف حضرات اور جب ہم اندر داخل ہوئے۔ 2 لاکھ لیرا کا سوال ہوا۔ ہم نے جیب ٹٹولی صرف ایک لاکھ مل سکے باقی ایک کروڑ کے نوٹ تھے۔ ہمارے ساتھ برطانیہ کی خاتون ایمی اور ان کے شوہر تھے۔

انہوں نے جو ہمیں جیبیں ٹٹولتے دیکھا فوراً اپنے شوہر سے لے کر ایک لاکھ کا سکہ دے دیا۔ ہم نے شکر ادا کیا اور باتھ روم میں گئے۔ جو دنیا کا سب سے گندا اور بدبودار ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہمارے ساتھیوں کا قافلہ سڑک پار کر کے بینک جانا چاہتا تھا۔ اس کے بھی مرحلے تھے۔ ٹریفک لائٹس بند ہونے پر سینکڑوں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سڑک پاک کرتے تھے۔

کی طرف روانہ ہوئے اس شام ہم نے
صاف ستھرے چہرے والی لڑکیاں ا
دیکھے جو نیلے کوٹ پتلون پہنے تھے۔ لڑکیا
پر اسکارف باندھے ہوئے تھیں۔

ترکی میں کوئی عورت سر پر اسکارف
سرکاری عمارت میں داخل نہیں ہو سکتی
ملازم لڑکی ایسا کرتی ہے تو اسے نوک
برخاست کر دیا جاتا ہے کیونکہ ترکی ایک
ہے۔ مصر کے صالح شیخ نے ایک دن
کوچ میں کہا تھا۔

’’ترکی کسی بھی سیکولر ملک سے ز
ہے۔‘‘ مراد نے برا مانا ہوگا لیکن بولا نہیں
میں تمام خواتین سر پر اسکارف باندھ
سرکاری عمارت میں جاتے ہوئے اتار د
گی۔ یہ ہم نے دیکھا نہیں۔

سمندر کے کنارے چھابڑی وا
عجیب وغریب چیزیں فروخت کر رہے
میں کوئی ایسا پھل تھا جو آگ پر جلا کر دیا
کئی قسم کے لاٹری ٹکٹ بکتے دیکھے۔

چائے والا بھی آواز لگا رہا تھا ت
چائے کو چائے ہی کہا جاتا ہے۔ ہزاروں
سے لوٹ رہے تھے۔ نیلا لباس کالج
ہے۔ ان سب کے چہروں پر معصومیت
بھولا پن لڑکیاں غیر معمولی دبلی تھیں۔
کے لوگ غریب اور پریشان نظر آتے
حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان میں سے کو
سوال نہیں پھیلا رہا تھا۔ ایک غیرت مند ق
ہوتی تھی۔ چاروں طرف پانی بکھرا ہوا
تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی‘ سمندر
دھواں تھا۔

کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ جہاں کوچ کھڑی تھی وہ جگہ تو
اب خالی ہے خیال آیا شاید یہاں کوچ کھڑی
کرنے کی اجازت نہ ہو ہم نے غلط سنا ہو......
مراد کسی اور طرف چلا گیا ہو ہم ازمیر میں اکیلے نہ
رہ جائیں اب کیا ہوگا؟ ہم خدا کا نام لے کر چلتے
رہے اور ڈرتے رہے یہاں تک کہ کوچ
نظر آگئی...... اور ایک بینچ پر مراد آسٹریلیا کی لی
اورزے سے گپ شپ کرتا نظر آیا۔ اس کی پشت
پر ایک بڑا سنگ مرمر کے فرش والا چبوترہ تھا۔ جس
پر کمال اتاترک کھڑے تھے۔ دو لکیریں بنی
تھیں۔ اس میں کمال اتاترک سپاہیوں کی کمان
کررہے ہیں اور وہ ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ ہم سمجھے یہ
باہر سے آنے والے کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں کہ
اس قسم کا ایک مجسمہ نیویارک میں اسٹیچو آف لبرٹی
کے نام سے مشہور ہے جو باہر سے آنے والوں کو
روشنی دکھاتا ہے۔ کمال اتاترک نئی ترکی کے بانی
ہیں۔ ان کا نام انور تھا۔ استاد نے خوش ہوکر لقب
دیا۔ کمال اور اتاترک کا مطلب' ترکوں کا باپ یہ
آخری عثمانی بادشاہ سلطان عبدالمجید ثانی کے
جرنیل تھے۔ اس سے ناراض ہوکر چلے گئے اپنی
ایک جماعت بنائی اور ترکی سے بادشاہت ختم
کرکے جمہوریت نافذ کردی۔ بادشاہ کو جلا وطن
کردیا۔ 1923ء میں ترکی نے چولا بدلا اور ابھی
تک پہنے ہوئے ہے۔ ہم متاثر ہوئے یا مراد کے
سامنے اس طرح اظہار کیا۔ ازمیر ایک صنعتی ملک
ہے۔ جہاں آلودگی بہت ہے۔ صفائی کی طرف
توجہ نہیں' جب تک ازمیر کے علاقے میں رہے ہر
طرف کوڑا کرکٹ دکھائی دیتا رہا۔ ایشیاء کے
بڑے شہر کی ساری خصوصیات اس میں پائی جاتی
ہیں۔ ازمیر چاروں طرف پھیلا ہے۔ بارش کی

شہر میں دو گھوڑوں کی بگھی چلتی ہے حصار مسجد مشہور
ہے 16 ویں صدی میں تعمیر ہوئی 19 ویں صدی
میں دوبارہ بہتر بنایا گیا اس کے علاوہ بھی سینکڑوں
مسجدیں ہیں۔ شام ہوتے ہی جس ہوٹل میں پہنچے
اس کا بڑا چرچا تھا۔ کسادا سی کے علاقے میں
سمندر کے کنارے واقع تھا۔ ازمیر ہوائی اڈے
سے 80 کلومیٹر دور ہے۔ 305 کمرے' ایک
کنگ سائز غالباً بادشاہ کے لیے' 5 سویٹ' 40
فیملی روم' ڈانس اور بیلے رقص' ڈسکو' فٹنس سینٹر
ساحل پر فٹ بال کھیلنے کا بندوبست ہوٹل کے اندر
سوئمنگ پول اور باہر سمندر میں چھلانگ لگائی
جاسکتی تھی۔ بڑا ہوٹل تھا' کاؤنٹر پر میلہ لگا رہتا
اِدھر اُدھر دکانیں تھیں اندر اور باہر تمام کھیلوں کی
سہولت تھی۔ ہوٹل کے بروشر میں ہوش اڑانے
اور نیند بھگانے والی تصویریں چھپی تھیں۔ بعض
نظر پڑی تو دیر تک نہ ہٹی اصل کیا ہوگی۔ اس کا
تصور کیا اور امریکی ڈالر کی کفایت شعاری ذہن
میں رکھی۔ ایک تصویر میں تو خواتین و حضرات
انتہائی مختصر مختصر لباس میں یا شاید بے لباس ڈریس
کی مشق فرمارہے تھے۔ ہم دوران سفر اس قسم کی
نازیبا حرکتوں کو پسند نہیں کرتے اس لیے تصویر
دیکھ کر برا مانتے رہے۔ یہ سب معصوم مسافروں کو
بھڑکانے ورغلانے اور غلط راہ پر چلانے کا منصوبہ
ہے۔ خیر ہم کیونکہ مسافر تھے اس لیے کاؤنٹر پر گئے
تاکہ کم ازکم بیلی رقص کا ٹکٹ پوچھ کر ان کی ہمت
افزائی کریں استقبالیے پر جو صاحبزادی کھڑی تھی
جب وہ گاہکوں سے فارغ ہوئیں تو فرمایا۔
''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں۔''
نے ان کی خدمات کے بارے میں سوچا
پوچھا۔

"کیا......" وہ حیران رہ گئیں۔ وہ یوں حیران ہوئیں جیسے ہم ان کا ڈانس دیکھنا چاہتے تھے اس میں کیا حرج تھا۔ لیکن اظہار کیسے کرتے بس اتنا کہا۔

"اوہ بیلی......" وہ مسکرائیں۔

"یہ رات کو ہوتا ہے۔" ان کا خیال تھا ہم دن میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

"اس کا ٹکٹ کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"چھ کروڑ ساٹھ لاکھ لیرا......"

اتنا مہنگا ڈانس تو مصر کے شاہ فاروق نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ہم شکریہ ادا کر کے واپس آ گئے اور شیشے کی بنی رنگین لفٹ میں بیٹھ کر اپنے کمرے میں آئے ہماری گیلری سے دور تک سمندر پھیلا نظر آتا تھا۔ ایسا کہ اگر پانی میں چھلانگ لگانے کے ماہر ہوتے۔ کود جاتے' لیکن کبھی زندگی میں کوئی ڈھنگ کا کام نہ سیکھا کودے بھی تو حسن اور جمال پر' چھلانگ ماری تو مالی کے ڈر سے درخت سے اور والد سے ڈر کر دیوار سے......

باتھ روم میں ایک ہدایت لکھی تھی براہ کرم 'قدرت کو محفوظ کرنے کے لیے ہم سے تعاون کریں۔ پانی کم استعمال کریں اور ڈٹرجنٹ استعمال نہ کریں نیچے ایک کاکروچ اور مکھی منہ پھاڑے ہنس رہے تھے۔ ہم نے ان کی درخواست پر عمل کیا۔ منہ دھونے کا ارادہ ملتوی کیا اور صرف ہاتھ دھوئے اور صابن سے پرہیز کیا۔ باہر نکلے تو دیکھا۔

ای ڈی بستر پر دراز تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور بولا۔

"نیچے لابی میں چلتے ہیں۔" ہمیں کیا اعتراض ہوتا۔

نیچے اترنے لگا۔ جب ہم نیچے پہنچے تو یہ تھا اور اس بات پر خوش تھا۔ وہ سیدھا اتر ہماری لفٹ دیر میں آئی۔ پھر ہر فلو بھی...... ایک سہولت ہے اس سے فائد اٹھائیں...... اگر ای ڈی زینہ اتر کر خو ہے تو اس کا نصیب......

لاؤنج میں بل مل گئے۔ یہ صاحب اور سفید بالوں والے تھے آواز ذرا بھا ہم نے بھولے سے کہہ دیا تھا۔

"آپ کی آواز ریڈیو کے لی مناسب ہے۔" اس دن سے وہ ہم پ تھے۔ بل کا خیال تھا عورتیں اُن پر فد ہیں۔ اس لیے ساتھی خواتین کے نزدیک پائے جاتے تھے۔ اِدھر اُدھر کے قصے آواز میں سناتے جب کوئی ان سے کرتا پوچھتے۔

"کیا کہا......' اونچا سننے کا بہان سامنے والا ان کی سنتا رہتا' جب سے مراد تھا کہ ترک روس کے علاقے سے آئے روسی بن گئے تھے۔ نیویارک کے علاقے اسمتھ میں رہتے اور اس جگہ کی تعریفیں کر تھکتے ان کے خیال میں پورٹ کا علاقہ س مہنگا ہے۔ اکثر اپنے مکان کی تصویر دکھاتے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ امر جس گھر کی تصویر اتارو اچھا لگتا ہے۔

ای ڈی اور ہمیں دیکھا تو دبوچ لیا۔ ا کسی کا شکار تو ہونا تھا۔ بل کے ہاتھ آ جائی برا ہے۔ گفتگو کا سلسلہ نکلا...... جس میں رہے تھے اور ہم سن رہے تھے اچانک ای ڈ 'معاف کیجیے' کہا اور ایک طرف چلا گیا۔

یکھا ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ ابھی تک اور فے کی دوستی چل رہی تھی۔ ہم اکیلے بل کا چارہ رہ گئے اچانک قدرت کو رحم آ گیا۔ اس طرف آئیڈیا ولتی آ گئیں۔ ہم نے آواز دے کر بلا لیا وہ شاید تھک گئی تھیں بیٹھنا چاہتی تھی اس لیے صوفے پر پھیل گئیں۔ اچانک ہم نے کلے کو لفٹ کی طرف آتے دیکھا اور ''معاف کیجیے'' کہہ کر آئیڈیا پر بل کو چھوڑ کر سرک لیے۔

☆......☆......☆

تین ہزار سال پرانا شہر

ترکی والے ایک چیز میں مہارت رکھتے ہیں۔ جگہ جگہ پرانے شہر کھود کر نکال لیتے ہیں پھر اس کی تاریخ اور جغرافیہ بناتے ہیں بعض میں تو یونیسکو والے درمے سخنے مدد کرتا ہے اور سیاحوں کو معلوم ہوتا ہے تو وہ استنبول بھاگے چلے آتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ترکی میں صرف ترکی بولی جاتی ہے...... ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں اس کے باوجود بھی کوئی انگریزی سے واقف نہیں بڑے سے بڑا ہوٹل انگریزی سے دور ہے بعض علاقوں میں تو بات اشاروں سے کی جاتی ہے ترکی کے دکانداروں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جو گاہکوں سے انگریزی بول سکتا ہے سب اسی کی دکان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ لیکن قومی کردار بھی کوئی چیز ہے۔ چاہے لاکھ نقصان ہو مگر ترکی پھر ترکی ہے...... جب سے کمال اتاترک انقلاب لائے ہیں اپنے رسم الخط کو عربی سے بدل کر لاطینی کر لیا ہے۔ ترقی پسند نوجوان جو انقرہ استنبول اور ازمیر میں رہتے ہیں اپنے سارے رشتے یونانی، رومن اور عیسائیوں سے جوڑنے میں فخر سمجھتے ہیں۔

آج جس قدیم شہر کو دیکھنے جانا تھا۔ یہ ایپھاسس ہے ایک پتلی سڑک کے دونوں طرف

چھوٹی چھوٹی دکانیں ... ان کے پاس تصویریں کتابیں اور ایک نیلے رنگ کے گول پتھر میں آنکھ بنی ہوتی ہے۔ اسے 'شیطانی آنکھ' کہتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اسے گھر کے اندر لٹکا لیں تو کسی کی بری نظر نہیں لگتی جادو نہیں ہوتا۔ مراد کی کوچ کے دروازے پر اندر کی طرف ایک چھوٹی نیلی آنکھ لگی تھی۔ اس کے باوجود ہمارے ساتھ کچھ سیاح خواتین آنکھوں بالوں اور ہونٹوں سے جادو جگانے کی کوشش کرتی تھیں اور دکانیں پر لگی اشیا پر بری نظر ڈالتی تھیں۔ ترکی میں یہی موویز کی صورت میں مہیا ہوتی ہے۔

کوچ جس جگہ رُکی یہ ایک بڑا گیٹ تھا۔ مراد نے ہدایت کی اپنے کوٹ پہن لیں۔ کیمرہ ساتھ لے لیں باقی سامان کوچ میں چھوڑ دیں۔ جب تک سیاح کوچ سے اترتے مراد اس علاقے کا ٹکٹ خرید لایا اور ہدایت کی۔

''سامنے بورڈ کے پاس انتظار کریں۔''

سب لوگ بورڈ کے پاس جمع ہو گئے تو وہ کوٹ کا کالر اُٹھا کر آیا اور بورڈ کے ذریعے سمجھانے لگا ہماری پشت پر پتھر کے ستون سیڑھیاں دیواریں اور ٹوٹے ہوئے راستے تھے۔ یہ ایک قدیم شہر کے کھنڈرات تھے۔

یہ شہر 20 ہزار قبل مسیح میں بسایا گیا تھا۔ دونوں طرف دو بڑے پہاڑ ہیں۔ یہ شہر دریا کے کنارے تھا۔ یونانی بادشاہ اس جگہ لوگوں کو بسانا چاہتا تھا۔ لوگ زیادہ تر ماہی گیری کرتے تھے اس لیے دریا کے پاس رہنا چاہتے تھے۔ دوسری جگہ آنے پر آمادہ نہ ہوئے تو بادشاہ نے ان کے گھروں میں دریا کا پانی بھر دیا۔ لہٰذا وہ مجبور ہو کر یہاں رہے' ایک اور وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک بڑا قبرستان تھا۔ لوگ یہاں نہیں رہنا چاہتے تھے لیکن

حاکم حاکم ترک مناجات...... ہر دور میں عوام عوام ہی رہتی ہے۔

پتھروں کے راستے سے ہوتے ایک میدان میں پہنچے جہاں ٹوٹے ستون پڑے تھے۔ مراد نے بتایا یہاں شہر کی مارکیٹ تھی۔ روزمرہ کی اشیا کے علاوہ نوادرات اور فنون لطیفہ کی چیزیں بھی فروخت کی جاتی تھیں۔ سوداگر دور دور سے آتے تھے۔ ان دکانوں میں اشیا کی قیمتیں مقرر تھیں جنہیں چیک کرنے کے لیے حاکم مقرر تھے۔ زیادہ قیمت' کم تولنے اور ملاوٹ پر سزا تھی۔ ایسا محسوس ہوا ہم اس دور کے زندہ انسانوں کا کوئی شاپنگ سینٹر دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے کہ انسان چاہے قبل مسیح کا ہو یا اکیسویں صدی سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کا ذہن اور مزاج تبدیل نہیں ہوا۔

مارکیٹ کے بعد چند سیڑھیاں چڑھ کر شہر میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹا اسٹیڈیم تھا۔ جس میں شہر کے مشاورتی کونسل کے ارکان صلاح و مشورے کرتے تھے اسٹیڈیم کے بیچ میں جگہ تھی جہاں موسیقار دھن بجاتے رہتے تھے۔ ان ممبران کی تعداد 450 تھی اور شہر کی آبادی 25 ہزار' اسٹیڈیم میں مشاورت کے دوران میوزک کے بندوبست سے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ حکمران ہر دور میں بانسری بجاتا ہے اور عوام کے مکانوں میں آگ لگتی ہے۔ اسٹیڈیم کی سیٹوں پر اس وقت جاپانی اور کورین لڑکیاں اور مرد بیٹھے تھے۔ امریکہ کو معلوم ہوا کہ یہ قومیں ماضی کی مشاورتی سیٹوں پر بیٹھنے کے قابل ہوگئی ہیں تو فکر مند ہوجائے۔ یہ اچھا شگون نہیں اور نیو آرڈر کے قطعاً خلاف......

مشاورتی کونسل کے اسٹیڈیم کے پاس چرچ تھا۔ پادریوں کی حکومت تھی۔ وہ مشہور سنتے اور

وہی کرتے ہوں گے جو ان کا دل چا
یہاں سنگ مرمر کے آدھے پورے ا
گرے ہوئے مجسمے ہیں۔ مشاورتی کو
سامنے سے ایک سنگ مرمر کی راہ داری
چلی جاتی ہے اس پر چرچ ہے۔ ایک ق
ہے۔ بعض مجسموں میں سینگوں والے
دکھائے گئے ہیں جنہیں دیوتا پکڑے
ہیں۔ بعض میں قربانی کی جارہی ہے۔
مینڈھے اور دنبے اپنا خون بہا کر دیوتا
مسیح سے خوش کررہے ہیں اور اچھے شگ
خوشخبری دے رہے ہیں۔ غم ہو یا خو
معصوموں کی گردن پر چھری پھیری جاتی
شہر میں پہلے یونانی آئے اور خوب میلہ
رومن دندناتے آئے اور یونانیوں کو مٹا
کے بعد عیسائی آئے اور وقت گزرتا گیا
ہم آئے تھے لیکن چند گھنٹوں کے لیے......

مراد ایک ایسے راستے پر لے آیا تھا
دور جارہا تھا۔ خاصہ چوڑا تھا اور سنگ مرم
تھا۔ حالانکہ پتھر ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن انہیں
سے جوڑا گیا تھا اونچے نیچے اس لیے رکھے
وہ اصلی نظر آئیں۔ لیکن ہمارا خیال
سیاحوں کو ٹھوکریں کھانے کی نیت سے زیاد
گئے ہیں۔ مراد ہر جملے کے بعد کہتا تھا۔

''اپنے قدموں کا خیال رکھیں۔'' ا
نیچے دیکھیں تو آس پاس کا منظر نظروں سے
ہوجاتا ہے۔ یہاں سنگ مرمر کی وجہ سے
پھیل رہی تھی مراد ہم لوگوں کو انتہائی خوش
سمجھ رہا تھا کہ آج آسمان صاف ہے اور
نکلی ہے۔ ورنہ سیاح سکڑتے اور ان کے
بجتے جاتے ہیں ہم اس قسم کی تفریح چاہے
ہی تعلیمی اور معلوماتی ہو پسند نہیں کرتے جس

ہ ہو۔ جان ہے تو جہان ہے...... زندہ ہے...... سردی سے بچ نکلے تو پھر آ جائیں گے۔ یا یہ ضروری ہے کہ ایک ٹوٹے پھوٹے پرانے کو دیکھنے کے لیے سردی سے ٹھٹھر کر جان دے یں۔

چند سیڑھیاں اتر کر چوڑا سنگ مرمر کا راستہ ا۔ اس کے دونوں طرف مجسمے لگے تھے۔ لیکن یا صرف نشان تھا۔ دائیں ہاتھ پر ایک مجسمہ کھڑا ا جسے سیمنٹ سے جوڑا گیا تھا۔ اس کا سر نہیں ا۔ یہ ایک خاتون ڈاکٹر تھیں جو ملیریا کا علاج کرتی تھیں۔ ایک دن خود ملیریا میں مر گئیں۔ ان کے ایک رشتے دار نے یہ مجسمہ بنوایا ویسے روایت تھی کہ یہاں زندہ لوگوں کے مجسمے ہوتے تھے جن لوگوں نے کوئی نمایاں کام کیا ہو خدمت انجام دی ہو تو ان کی زندگی میں ستائش کی جاتی تھی۔ تاکہ جب وہ اس راستے سے نکلیں خوشی محسوس کریں۔ بعد میں یہ سلسلہ ختم ہوا اور اچھا ہوا ورنہ اس دور کے حکمران ہر طرف اپنے مجسمے لگوا لیتے کیونکہ اپنے خیال میں وہ ملک اور قوم کی اتنی خدمت کرتے ہیں کہ صدیوں تک یاد رکھے جائیں۔ یہ الگ بات کہ اقتدار سے محروم ہونے کے دوسرے دن سے ان کا احتساب شروع ہو جاتا ہے۔ بات تھانے کی کچہری سے جیل تک جاتی ہے...... وغیرہ وغیرہ......

اسی راستے پر ایک بڑا حوض بنا تھا۔ جہاں پانی جمع کیا جاتا تھا عوام کے لیے...... یہ پہاڑوں کے چشموں سے آتا تھا اور خاصہ صحت مند تھا۔ اس کے بعد حمام آئے۔ انہیں دیکھنے کے لیے چند سیڑھیاں پھر دیواروں کے درمیان میں جگہ اور غسل خانے جس میں یونانیوں کے زمانے میں خواتین و حضرات ایک ساتھ نہاتے تھے رومن نے خواتین کو الگ کر دیا۔ ہیومن رائٹس والی انجمنوں نے غالباً احتجاج کیا ہوگا۔ عورتوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا رہا تھا۔

یونانی پانی گرم کر کے حمام میں لاتے اور غسل کرتے' رومن نے اس میں جدت پیدا کی وہ فرش کے نیچے آگ جلاتے یہ اینٹوں کا بنا ہوتا اس پر سنگ مرمر لگاتے۔ تو پانی اس کی حدت سے گرم ہو جاتا اور بہتا ہوا مطلوبہ جگہ پہنچ جاتا۔ یہ حمام رئیس لوگوں کے ہوتے اور سب ایک ساتھ نہاتے' اس دن سے یہ محاورہ مشہور ہے......

''ایک حمام میں سب ننگے......''

غریبوں کے نہانے کا کوئی نظام نظر نہیں آیا۔ شاید انہیں اس قسم کی حاجت نہ ہو ویسے بھی اس طرح نہانا ایک عیاشی محسوس ہوتی ہے...... اور عوام کو ان سے دور رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنی اوقات میں رہیں اور رئیسوں کی برابری نہ کرنے پائیں۔ حمام کے بعد واش روم دکھانے کا اعلان کیا گیا۔ بھلا اس میں کیا دیکھنے کی چیز؟ لیکن مراد کا اصرار تھا اس لیے اندر چلے گئے۔ اس میں لائن سے کموڈ بنے تھے۔ اس کے آگے ایک گہری نالی تھی۔ جس میں پانی تیز رفتار سے بہتا رہتا تھا جو ضرورت کے وقت استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کموڈ کے نیچے بھی پانی مسلسل جاری رہتا تھا۔ کموڈ کے سامنے ایک جگہ تھی جہاں میوزک بجانے والے کھڑے موسیقی کی تانیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ رئیس لوگ ایک ساتھ بیٹھتے اور سیاسی اور معاشی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ یہ ان کی سوشل بیٹھک ہوتی تھی۔ یہاں بھی غریبوں کا کوئی انتظام نظر نہیں آتا۔ یعنی وہ جائیں بھاڑ میں' حکومت نے ہر چیز کا ٹھیکہ تو نہیں لیا۔ کچھ خود بھی کریں۔ باتھ روم اور واش روم سے باہر نکل کر پھر سنگ مرمر

نے راستے پر آ گئے۔ ایک جلہ ایک خاتون مختصر لباس پہنے ہاتھ میں پھول لیے ہوا میں اڑ رہی تھیں مراد نے تعارف کرایا یہ فتح کی دیوی 'نائکے' تھیں جس کی ہر بادشاہ کو ضرورت ہوتی ہے۔

عوام بھی یہی چاہتے ہیں ورنہ جنگ میں شکست کے بعد تو زن بچہ کولہو نہی کا پلوایا جاتا ہے۔ مراد کا کہنا تھا اسپورٹس کے جوتے نائک اسی کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ اس میں کیا برا ہے۔ دیوی کے نام پر رکھا جانا تو خوش قسمتی کی دلیل ہے۔ان کی ایک ہمشیرہ بھی ہیں۔

'نائکے' ان کا مجسمہ بھی ایک ٹوٹی ہوئی محراب میں لگا تھا' سر زیادہ نمایاں تھا یہ خوش قسمتی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے سر پر گھنگھر والے بال تھے مراد نے بتایا یہ دراصل سانپ ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورو تو انسان پتھر کا ہو جاتا ہے۔ ہم نے سب کی آنکھ بچا کر خوب گھورا کچھ بھی نہ ہوا۔ آدمی کے آدمی ہی رہے۔ حالانکہ ہمارا خیال تھا اگر پتھر کے بن جائیں وہیں رہ جائیں گے لوگ سمجھیں گے یونانی یا رومن تھے۔ کوئی بڑا کام کیا ہوگا۔ خدمت کے صلے میں مجسمہ بنا دیا ہے۔ ایک دنیا آ کر دیکھتی تو اپھسس میں ٹوٹے پتھر گرتے مینار اور ستون تک یوں دیکھے جاتے ہیں جیسے کوئی چاند چہرہ ستارہ آنکھیں دیکھے۔ سرو قد رخوش ادا کو گھورے۔

مراد نے بتایا نائکے جوا کھیلنے والوں کے درمیان بے حد مشہور ہے۔ ضرور ہوگی...... اسے امریکہ بھجوا دیں۔ وہاں سب جوا کھیلتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے لاٹری کا ٹکٹ لیا تو نائکے کو یاد کریں گے۔ اچھا نائکے چلتے ہیں تم اپنے سر پر سانپ بٹھائے رکھو اور یہ افواہ اڑائے رکھو کہ کوئی تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ گھورے

ڈرتا رہے۔ ہم آگے بڑھے راستہ
مڑ گیا۔ سامنے ایک عالی شان
عمارت تھی جس کی ایک منزل باقی
کے ستون کھڑے تھے۔ یونانی اور
زمانے میں یہاں علم و ادب کی
سے شہر کے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے
رہے تھے عمارت عظیم تھی۔ دس
اجازت دی گئی۔ عمارت کو ہاتھ لگا
کسی پرانی عمارت' مقبرے یا
ضرورت ہاتھ نہیں لگاتے' ایسا

چاہیے۔

مراد نے تجویز پیش کی سب اس
کھڑے ہو جائیں گروپ فوٹو بن
اجنبی شخص کو فوراً کیمرہ لے کر آگے
'ادا کولے' کا آدمی تھا اور بہت دیر
تصویریں بنا رہا تھا۔ ایک گروپ کھینچ
کے بعد مراد نے اشارے میں بتایا
سامنے ناچنے گانے والیوں کا بازار تھا
داخلے کے دروازے پر ایک پتھر پر
ہے...... اس کا مطلب ہے غلط کام
جا رہے ہو۔ اس بازار اور لائبریری
ایک سرنگ تھی تاکہ رئیس کسی کی نظروں
بغیر اس طرف چپکے سے آسکیں۔ اچھا
اکیسویں صدی میں اس پر عمل ہو سکتا
رئیسوں کو عزت بچانی ضروری ہے۔
شروع میں حمام تھا۔ جس میں نہانا
گانے ناچنے والیوں کے بازار میں
ہو کر جانا لازم تھا۔ وہاں سے واپسی کی
نہیں تھی۔

مراد نے کہا میری والدہ نے ایسی
کو منع کیا ہے۔ اس لیے آپ لوگ

ں باہر بیٹھا ہوں۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر سگریٹ لے دھوئیں سے مرغولے بنانے لگا اسے چھوڑ کر نہ ئے وہاں ایک گلی تھی جس میں دونوں طرف مرے تھے اور ہر شخص کو افسوس تھا وہ خالی تھے۔ پانک ایک کمرے کی چوکھٹ پر آسٹریلیا کی لی ھڑی ہوگئی شیخ نے ہم سے تصویر کھنچنے کی خواست کی اور جب ہم نے کیمرے کا بٹن دبایا شیخ نے کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے جیسے چنے والی کو رقم دے رہا ہے۔ آس پاس کھڑے گوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ ہم نے شیخ کے ذوق پر افسوس کیا۔ گانے ناچنے والی بھی منتخب لیں تو خاصی گئی گزری۔

اس جگہ سے نکلے تو پھر سنگ مرمر کے راستے ر چل پڑے۔ مراد نے دائیں طرف ایک پتھر کی رف سب کی توجہ دلائی۔ اس پر بھدا سا ایک دل س کے برابر عورت کی تصویر بایاں پاؤں اور یک سوراخ بنا تھا۔ مراد بتانے لگا۔ سورخ کا طلب ہے اس میں سکہ ڈالو تو دل یعنی محبت اُلٹے اؤں کا کھیل ہے۔ اس کے خیال میں یونانیوں کے زمانے میں بھی اشتہاری صنعت موجود تھی اور یہ اس کا ایک نمونہ تھا۔ ہر دور میں دل جیتنے کے لیے سونے چاندی کی ضرورت رہی ہے۔ یہ صول قبل مسیح سے بعد از مسیح اور جارج واشنگٹن سے جارج بش تک رائج ہے۔ سیاح متاثر ہورہے تھے۔ سفر پھر شروع ہوا اور اچھا خاصا راستہ چھوڑ کر مراد بائیں طرف سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور اوپر لگی ریلنگ کے پاس پہنچ گیا وہاں کچھ دکھانا تھا۔ لوگ اوپر چڑھنے لگے پہلے تو خیال آیا ہم نے بہت دیکھ لیا ہے اوپر نہ جائیں لیکن سب ہی جانے لگے تو موسم سیاحت نبھانے کے لیے ہم نے بھی سیڑھیاں چڑھ کر ریلنگ کا قرب حاصل کیا۔ مراد ایک بہتر بڑا اسٹیڈیم دکھا رہا تھا۔ دور سے سب چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ اچانک وہ بائیں طرف گیا اور نیچے جاتی ہوئی شکستہ سیڑھی' اکھڑی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کے پیچھے سیاح' یہ سیڑھیاں مشکل سے 12 یا 14 ہوں گی۔ لیکن دونوں طرف سے کھلی بائیں طرف ایک گہرا اسٹیڈیم اور دائیں طرف نیچے ٹوٹے ہوئے ستون اور پتھر پڑے تھے۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو محسوس ہوا وہ ہل رہی ہے اور فوراً دوسری سیڑھی پر قدم نہیں رکھا تو ہم یونانی تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ گھبرا کر دوسری پر قدم رکھا تو وہ لرز رہی تھی۔ تیسری کا ایک ننھا پتھر ہمارے پاؤں کی دھاک سے بائیں طرف گرا۔ اس کے بعد عالم بے ہوشی میں سیڑھیاں اتریں تو زمین نزدیک آنے لگی اور پھر جب قدم گھاس اُگی زمین پر پڑا تو یوں محسوس ہوا ہم اس کے لیے صدیوں سے بے چین تھے۔

وہ اتنی اچھی لگی جی چاہا ایک سجدہ شکر بجالائیں۔

''رب تو نے زمین بنا کر کتنا اچھا کیا۔''

لاتعداد اوپر سے نیچے آتی سیڑھیوں کے سامنے مراد کھڑا تھا۔ یہ عظیم الشان اسٹیڈیم تھا جس میں ایک وقت میں 24 ہزار افراد بیٹھ سکتے تھے۔ جہاں ہم کھڑے تھے اس جگہ کے دائیں بائیں دو تاریک راستے تھے۔ ماضی میں یہاں سے خونخوار شیر اور چیتے اندر لائے جاتے تھے۔ جن سے انسانوں کو لڑایا جاتا تھا۔ سامنے جو اسٹیڈیم کی سیڑھیاں تھیں وہ اونچی بنائی گئی تھیں تاکہ جانور تماشینوں پر حملہ نہ کرسکیں۔ ہمیں دائیں طرف اپنی پشت پر وہ شکستہ لرزتا سیڑھیوں سے بھرا زینہ نظر آرہا تھا جس سے واپسی تھی۔ مراد جو کچھ بتا رہا تھا اس کی آواز تو آرہی تھی۔

(جاری ہے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے
جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں
ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ
اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے
جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد
میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے
اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی
تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست
ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں
سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی
ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور
مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر
سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر
ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے
دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300
روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ
کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط
میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی
=/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن
خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک
ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام
سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابانِ جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

سلسلے وار ناول

ایک نہایت ہی منفرد دلچسپ پُراسرار سلسلہ جسے آپ عرصہ دراز تک یاد رکھیں گے

املتاس

علامہ سید اجتبیٰ حسین رضوی کا خیال

اس دل کا تحیر تھا آئینہ' اس سر کا تصور تھا مو قلم
تمثال پہ نقطے لگا کیے' تصویر بدلتی چلی گئی

(پانچویں قسط)

شازلی سعید مغل

ہواؤں کے تیور تھے کہ مستقل بگڑتے جا رہے تھے اور اب یہ گرد آلود ہو رہی تھیں' املتاس کے
تیزی سے ٹوٹ کر صحن میں گر رہے تھے اور ہوا کے تیز تھپیڑوں کے زور پر صحن میں اِدھر اُدھر چکرائے
رہے تھے ان سے پیدا ہونے والا شور گویا ایک صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔

نام نہاد عامل بابا نے جیسے ہی گلی کے باہر قدم رکھا ہوا کے بنتے بگڑتے ابھرتے ایک سیاہی مائل
نے اسے ڈھانپ لیا۔

انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ہوا تیز ہوئی بادل گرجنے لگے اور ہوائیں تیزی کے ساتھ درختوں کو آ
میں اس طرح ٹکرانے لگیں کہ سارا جنگل ایک خوفناک آواز سے گونجنے لگا اچانک گہرے ہو جانے وا
بادل دھواں دھار برس پڑے چند منٹ میں آسمان سے زمین تک پانی کی چادر سی تن گئی تھی ہر پتے اور شا
سے پانی جیسے کہ جھرنے کی طرح برس رہا تھا طوفان اچانک ہی یوں تھم گیا جیسے یکدم شروع ہوا تھا۔

اس کے ساتھ ہی زمین سے بھاپ اٹھنے لگی دور دور تک گھنے درخت سورج کی روشنی کو نیچے آنے
روکے ہوئے تھے جس سے چاروں طرف نیم تاریکی کا سماں تھا ان گھنے درختوں کی وجہ سے ہوا بھی
ہوئی سی تھی جنگل کی فضا حبس زدہ ہو رہی تھی سارے جنگل میں ایک سنگین سناٹا سا چھا گیا تھا۔

ہر شاخ ہر پتے اور ہر شگوفے پر رُکا ہوا بارش کا پانی اب قطرہ قطرہ گرنے لگا تھا۔ ٹپ ٹپ کی آواز
نے یکدم چھا جانے والے سناٹے کو توڑنا شروع کر دیا تھا۔ ہوا نے بھی جیسے دھیما سا سانس لیا اور
شروع کر دیا تھا۔ ہوا کے چلنے سے جنگلی پھولوں کی پتیاں چاروں طرف فضا میں اڑتی پھرتی تھیں فضا
ان جنگلی پھولوں کی خوشبو کے ڈیرے تھے......

جنگل میں سید صاحب کے گھر سے کچھ فاصلے پر یہ پھول دار گھنے درخت آپس میں ایک دوسرے
پیوست تھے اور اُن کے گھر تک ان پھولوں کی پتیوں کا ایک فرش سا بچھا ہوا تھا ان ہی درختوں کے جھنڈ



ایک ہلکی سی سسکی ابھری اور پھر وہ متواتر سسکیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اوران کے ساتھ سفر کرتی بے بس دکھی سسکیوں کا رخ سید صاحب کے مکان کی سمت تھا چند ثانیے میں بھینی بھینی جنگلی پھولوں کی خوشبوؤں کے جلو میں وہ سسکیاں سید صاحب کے دروازے سے جا ٹکرائی...... جیسے دروازے کے دوسری جانب کوئی ان کا منتظر تھا۔

مطلع صاف ہو چکا تھا چند منٹ کی غیر متوقع دھواں دھار بارش ہل چل مچا گئی تھی املتاس مستقل روئے جارہی تھی۔ صولت جہاں نے ہزار رہا جتن کر لیے تھے صبح کے سارے کام چھوڑ کر سارے گھر والے باری باری املتاس کو بہلانے چپ کرانے میں لگے ہوئے تھے کئی بار جمن دادا بھی کام چھوڑ کر آتے رہے کہ شاید املتاس ان سے ہی چپ ہو جائے......

مگر بے سود ہی رہا مگر جیسے جیسے طوفان تھما مطلع صاف ہوا...... املتاس کے رونے میں ازخود بتدریج کمی آتے آتے اس کا رونا بند ہو گیا تھا بلکہ وہ اپنی ماں کی گود میں سو گئی تھی۔

''پتہ نہیں کیا ہوا تھا ایسا اِس کو......'' فائزہ پریشان تھی۔

''اچانک اتنا رونا دھونا اور اب دیکھیے کس طرح سو رہی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔'' فائزہ نے ساس سے کہا۔ صولت جہاں اس وقت متضاد سوچوں کا شکار تھیں اور کچھ خوفزدہ بھی نظر آ رہی تھیں۔ مختصر سا جواب ہی دے پائیں فائزہ کو۔

''کچھ نہیں ایسا کرتے ہیں بچے شاید موسم کی تبدیلی ہوئی تھی ڈر گئی ہو گی۔'' ایسا کہتے کہتے خود انہیں اپنی آواز گویا اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ فائزہ املتاس کو لے کر اندر چلی گئی تھی۔ آج کی صبح ایسی افراتفری کی نظر ہوئی تھی کہ سب روٹین متاثر ہوا تھا پھر املتاس کا رونا......

صولت جہاں کو ابھی جو محاذ درپیش ہونا تھا اس کی فکر انہیں کھائے جا رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد وہ محاذ کھل گیا تھا......

''کیا آپ بتانا پسند کریں گے یہ سب کیا تھا......'' وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو حسن صاحب نے اخبار ایک جانب تقریباً اچھالتے ہوئے کہا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا وہ اپنا غصہ حتی الامکان دبا رہے ہیں۔

''کیا سب؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ رہی......''

صولت جہاں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اچھا آپ مطلب نہیں سمجھ رہیں؟''

حسن شیرازی نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنی اونچی ہوتی آواز کو بڑی مشکل سے دھیما کیا وہ نہیں چاہتے تھے اس وقت اُن کے بہو یا بیٹے کو اس بات کی بھنک تک پڑے کہ صولت جہاں سے کیا سرزد ہو رہا ہے...... اور کیوں ہو چکا ہے......

''دیکھو صولت میرے پاس ابھی وقت نہیں ہے کہ میں تم سے وہی باتیں تفصیل سے کروں جو ہم اس رات کر چکے تھے جب تم نے وہ رام کہانی مجھے سنائی تھی مجھے جمن نے سب کچھ بتا دیا ہے اس لیے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے...... جمن کو بلایا ہے وہ آتے ہی ہوں گے......''

حسن شیرازی کا جملہ پورا ہی ہوا تھا جمن دادا سر جھکائے کمرے میں داخل ہوئے صولت جہاں کو پ

ہی یہ سن کر ایک دھچکہ لگا تھا کہ جمن دادا نے اُن سے وعدہ خلافی کی سب بتا دیا وہ جمن دادا کو یک ٹک
رہی تھیں جمن دادا نے بھی نظریں اٹھائیں چہرے پر شرمندگی کا جو شائبہ صولت جہاں ڈھونڈ رہی
ندارد تھا...... حسن شیرازی نے اب جو نگاہ ان دونوں کے چہروں پر ڈالی تو ان کے درمیان آنکھ
آنکھوں میں بھیجے ہوئے خفیہ پیغامات کو جا لیا......

''یہ آپ دونوں کیا ایک دوسرے سے پیغام رسانی میں لگے ہوئے ہیں۔''

''جب آپ کو سب پتہ ہی چل چکا ہے تو پھر......''

صولت جہاں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بے دم وافسردہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ جمن
سامنے رکھی کرسی پر بیٹھے تھے۔

''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔'' صولت جہاں آنکھوں کی خفیہ پیغام رسانی کو الفاظ کا جام
جمن دادا سے بولیں لہجہ گلوگیر تھکا ہوا تھا۔

''بی بی معذرت مگر مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں۔''

جمن دادا نے ایک مستحکم لہجے میں کہا۔

''گیا بھی آپ کے ساتھ اہل بٹیا کی بھلائی کے لیے تھا اور اب آج جو ہوا مجھے میری غلطی کا ا
اور خوفناک احساس دلا گیا حسن میاں نے پوچھا میں نے بتا دیا اور میرے بتائے بغیر ہی وہ سب سمجھ
اور میں نے جو بتایا وہ بھی اہل بٹیا کی اور اس گھر کی بھلائی کے لیے ہے اس لیے مجھے کوئی شرمندگی نہیں
جمن دادا کہتے کہتے ہتھے سے اکھڑنے لگے۔

''ارے ہم خود کو کوسے جا رہے ہیں اس وقت سے جب ہم آپ کی بات مان کر بس چل پڑے
میں اور اس عمر میں بھی ایک غلطی ہوئی ہے ہم سے اب ساری زندگی جو بچی کچھی ہے آپ کی وجہ
کوستے پیٹتے ہی گزرے گی۔''

صولت جہاں جو ان سے بھرپور ناراض ہو رہی تھیں اُن کو اس طرح ہتھے سے اکھڑتے دیکھ
ناراضگی بھول بھال گئیں۔

''اچھا بس آپ رہنے دیں یہ خود کو کوسنا پیٹنا......''

صولت بیگم نے کہا۔

''آپ بھی کہہ لیں مجھے برا بھلا اب......'' صولت جہاں نے اپنا رخ شوہر کی جانب موڑتے
کہا۔

''مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ مجھے دکھ اور افسوس ہے کہ آپ نے میرا انتظار نہیں
میرے جاتے ہی اتنی بڑی غلطی کر بیٹھی ہیں۔ اگر مجھے شہر سے باہر جانا نہ پڑتا تو میں آپ کو دوسرے
بتا دیتا کہ میں آپ کی باتوں کو لے کر سوچنے لگا ہوں...... اور آپ کا ساتھ دینا چاہتا ہوں...... مگر آ
قدر جلد بازی کا ثبوت دیں گی مجھے بہت افسوس ہے۔''

''میں بے حد شرمندہ ہوں......''

صولت جہاں سرتاپا شرمندہ تھیں۔

''ٹھیک ہے بس اس بات کو یہیں ختم کریں...... مجھے امید ہے آئندہ آپ ایسی غلطی دوبارہ کرنے کا سوچیں گی بھی نہیں......''

صولت جہاں اس درجہ شرمندہ تھیں کہ گردن ہلا کر رہ گئیں...... انہیں واقعی اپنی غلطی کی سنگینی کا احساس ہوگیا تھا۔ اُن کا بیٹا محسن انہیں خدا حافظ کہہ کر جا چکا تھا۔ حسن شیرازی آج گھر میں ہی تھے سارا دن صولت جہاں میں اوران میں بات چیت بھی بہت کم ہوئی وہ سارا دن کتاب پڑھتے رہے یا اِدھر اُدھر فون کیے یا کھانا کھا کر سو گئے املتاس نے بھی جو صبح رونا دھونا کیا تھا اس کے بعد سے لے کر رات تک وہ زیادہ تر سو رہی جمن دادا بھی خاموشی سے اِدھر اُدھر کے کام نبٹائے جا رہے تھے۔ مجموعی طور پر آج کا دن ان سب کے لیے صبح کی افراتفری کے بعد نہایت خاموشی لیے گزر رہا تھا۔ ساعتیں نہایت سہج سہج کر آگے قدم بڑھا رہی تھیں جیسے......

جنگل میں اب شام اتر آئی تھی۔ شام کے ملگجے رنگوں نے سارے جنگل پر جیسے ایک ملگجا سا جادو کر دیا تھا...... سحر اور پُراسراریت ہر طرف بکھری معلوم دے رہی تھی۔ ایک ٹنڈ منڈ درخت کی شاخوں پر عجیب سے ست رنگی پھولوں کا مسکن تھا۔

اچانک ایک بڑا پرندہ اپنے آشیانے کی جانب پرواز کی جلدی میں اس درخت کے اوپر سے جو ہو کر گزرا تو وہ ست رنگی پھول حیرت انگیز طور پر بکھر کر فضا میں پھیل سے گئے۔ کائنات کے اس حسین نظارے کو اس وقت اگر کوئی آنکھ دیکھ رہی ہوتی تو وہ یقیناً اپنی جگہ اس سحر میں گرفتار ہو کر مسحور و مبہوت رہ جاتی......

ٹنڈ منڈ درخت پر ست رنگی پھولوں کے گچھے نہیں سجے تھے بلکہ وہ سبز' سفید' پیلی اور قوس وقزاح کے سارے رنگوں کو اپنے نازک پروں میں سمیٹے ہوئے تتلیاں تھیں...... دور ایک چھوٹا غزال درختوں کی جھنڈ سے اس نظارے کو دیکھنے کی جستجو میں جھانک رہا تھا۔

شام کا فسوں تیزی سے پھیل رہا تھا اس فسوں میں بندروں کے لڑنے کی آوازیں درختوں پر اودھم مچانے کا شور سنائی دینے لگا اس کے ساتھ پرندوں کی آوازیں حشرات الارض کی سیٹیاں' مینڈکوں کے ٹرانے اور قریب ہی کہیں بہنے والی جھیل کے پانیوں کی مدھم مدھم سی صدا شامل تھی۔ یہ سب مل کر رات کا پُرتپاک استقبال کر رہے تھے......

درختوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا مہتاب یہ تماشہ دیکھ رہا تھا آسمان کا رنگ کاسنی ہو چلا تھا جس پر کبھی کبھی بجلی کی لہر یا بنتی تھی تو درختوں کی اونچی شاخیں روشن ہو جاتی تھیں۔ اب ہوا بھیگ چلی تھی جنگل میں دور کچھ زعفرانی شعلوں کے جلتے بجھتے الاؤ روشن ہو چلے تھے۔ اس گردوپیش میں نیلے اودے جنگلی پھولوں سے ڈھکی کھڑکیوں والا' شاہ بلوط کے درختوں کے حصار والا مکان کسی ماہر عکس بند کی عکسبندی معلوم دے رہا تھا۔

شاہ بلوط کے ان درختوں کے نیچے آگ کا ایک چھوٹا الاؤ روشن تھا اس الاؤ سے یکے بعد دیگرے چنگاریاں پھوٹتی اور فضا میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے تحلیل ہو جاتیں' زعفرانی رنگ شعلوں کا عکس اور چنگاریوں کا رقص عجیب فسوں پیدا کر رہا تھا اس مدھم نارنجی روشنی میں شب تاب کا پورا وجود سنہری ہو رہا

قریب ہی رات کے کسی پرندے نے دلفریب راگنی چھیڑی ہوئی تھی۔

اس جنگل میں ایک پوری دنیا آباد تھی انوکھی اور فسوں کار...... اُن کے اپنے قوانین اپنی روایتیں اپنے موسم تھے مگر وہ اپنے ان قوانین' روایات اور اپنے موسموں سے ہٹ کر اس کے بالکل قطع نظر میں بس جانے والے 'سید صاحب' کی بات مانتے تھے اُن کی عزت و تکریم بھی اب اس انوکھی دنیا کا قانون اور ایک روایت بن چکا تھا اور اسی قانون کو دھائی دیتی وہ اندر پڑی سسک رہی تھی آج اس ا دنیا کے سارے ہی باسی اس کے حق میں اپنا احتجاج سید صاحب کے پاس درج کرانے کھڑے تھے رات گئے تک ان کے گھر میں ایک نادیدہ چہل پہل جاری تو رہتی تھی مگر آج یہ ایک اضطراری رنگ ہوئے تھی اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں وہ سسک رہی تھی سب نے آگے بڑھ کر اس کا دکھ بانٹنا چ کسی کو بھی اس نے یہ اجازت نہ دی بس ایک شب تاب تھا جسے اجازت تھی وہ وقفے وقفے سے اس کا جاننے کے لیے اس کے گرد ایک چکر لگاتا اور واپس چلا جاتا...... اَن گنت اسرار اپنے دامن میں سمیٹے گزر رہی تھی۔

حسن شیرازی اکثر و بیشتر صبح کی سیر کرنے نکل جاتے تھے گرمیوں میں اُلٹا یہ روٹین معمول تھا مگر جیسے سردیاں جوبن پر آ رہی تھیں اُن کا یہ روٹین اکثر و بیشتر میں شمار ہو رہا تھا آج بھی دل میں نہ جا سائی نماز سے فارغ ہو کر کوٹ پہنا کانوں کے گرد مفلر کو اچھی طرح لپیٹا مگر سردی محسوس ہو رہی تھی گرم شال تک اوڑھ لی صولت جہاں بھی نماز سے فارغ ہوئیں تھیں اور خاموشی سے حسن صاحب کی تیا دیکھ رہی تیں۔

''آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے کیا ضرورت ہے سیر کو جانے کی کل بارش جو ہو گئی تھی۔''

''ٹھیک ہے بس گرم چادر بھی لے لی ہے اب سردی سے بچت ہے۔ میرا آج بہت دل کر رہا۔ انہوں نے خشک سے لہجے میں کہا اور تیزی سے اپنے گھر سے باہر نکل آئے مبادا صولت جہاں کی کسی ب جواب سوال پھر سے شروع نہ ہو جائے۔

باہر گہرا کہر چھایا ہوا تھا اسٹریٹ لائٹس بھی ابھی تک جل رہی تھیں وہ گلی سے گزر کے اس سڑ آ گئے جو آگے جا کر دریا کے کنارے سے گزرتی تھی سڑک تقریباً سنسان تھی اس وقت اَکا دُکا گاڑیاں گزر جاتی اور پھر ایک سناٹا چھا جاتا۔

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی دھن میں مگن چلے جا رہے تھے کہ انہوں نے محسوس کیا ک اُن کے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ بھاری قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں یہ آوازیں تیزی سے حسن صاحب نزدیک تر ہوتی جا رہی تھیں۔ بلکہ صبح کے اس سناٹے میں قدموں کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ انہوں بے ساختہ پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

ایک بار نہیں دو تین بار مگر انہیں اس گہری دھند میں صاف نظر نہیں آ رہا تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ تیسر دیکھنے اور غور کرنے پر انہیں اس دھند میں بس ایک ہیولا سا نظر آ رہا تھا اس کا پورا وجود کسی گہرے رنگ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اب وہ ان کے بالکل نزدیک آ گیا تھا۔

حسن شیرازی نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی لیکن وہ نظر نہ آ سکا کیونکہ اس نے چادر کو اس طرح چ

پرلیا ہوا تھا جس سے چہرے پر ایک گھونگھٹ جیسا تاثر ابھر رہا تھا اب وہ اُن کے بالکل برابر چل رہا تھا
صاحب نے اپنی رفتار دھیمی کر لی تا کہ وہ آگے نکل جائے لیکن وہ آگے نہ نکلا بلکہ اس نے بھی اپنی رفتار
کر لی۔

پہلے تو وہ خاموشی سے اُن کے ساتھ چلتا رہا اس مڑکر حسن صاحب کی طرف اس طرح دیکھا جیسے
اُن کو مخاطب کرنا چاہتا ہو۔ پہلی بار تو حسن صاحب نے اس پر دھیان نہ دیا مگر اس کی بے چینی بڑھتی گئی
وہ چلتے ہوئے کئی باراُن کی طرف دیکھے گیا۔

''آپ محسن شیرازی کے والد ہیں اور مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' اس عجیب انداز تخاطب پر
صاحب نے اس اجنبی کی طرف گہری کڑی نظریں اٹھائیں وہ بالکل ساتھ چل رہا تھا دو چار قدم کا فاصلہ
ختم ہو چکا تھا۔ اس اجنبی کا آدھا چہرہ چادر کی اوٹ سے جھانکا حسن صاحب نے اس کہرے میں دیکھا
وہ ایک دمکتا ہوا سا چہرہ تھا۔ بڑا سا سر' لمبی گردن' لمبا قد وہ ایک یونانی وضع قطع کا قدرے درمیانی عمر کا
شخص تھا...... اس کے عجیب انداز تخاطب پر حسن شیرازی ٹھٹھک گئے وہ رُک گئے تھے۔

''چلتے رہیے......''

انہیں رُکا دیکھ کر وہ قدم آگے بھانے لگا۔

''آپ محسن کو کیسے جانتے ہیں اور یوں میرے پیچھے آنا...... کیا مطلب ہے؟'' اجنبی نے ایک
دوبارہ حسن صاحب کی طرف دیکھا وہ شاید مسکرا رہا تھا۔

''آپ محسن کے دوست تو نہیں ہو سکتے...... میں جانتا ہوں سب کو۔ جاننے والے؟ یا کاروبار کے
میں میرا خیال ہے مجھ سے بات کرنا مقصود ہے آپ کو حضرت......''

حسن صاحب کے لہجے میں اُس کی خاموشی سے ایک چبھن سی اتر آئی تھی یا شاید صبح کی سیر
ہو جانے کی کوفت تھی۔ وہ مسکرایا۔

''آپ کو میرا طرزِ تخاطب عجیب لگا...... مگر یہ سچ ہے میں جانتا ہوں آپ محسن شیرازی کے
ہیں...... میں کیوں اور کیسے جانتا ہوں اس سے کہیں وہ بات ہے جو میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔
میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

''مگر میرا تو وقت کر ہی دیا ضائع......'' حسن شیرازی کے دل میں آیا کہہ دیں مگر کچھ سوچ کر خا
ہو گئے۔

اس اجنبی گھونگھٹ بردار شخص کی بات سن کر اگلے لمحے وہ اس بار بری طرح چونک گئے اس نے
جاری رکھے ہوئے تھی۔

''وقت میں ضائع نہیں کر رہا آپ کا جناب...... وقت آپ خود ضائع کر رہے ہیں میں صرف یہ بتا
آیا ہوں آپ جتنی جلد ممکن ہو' سید صاحب' سے جا کر مل لیں......''

یہ کہہ کر وہ چادر پوش گھونگھٹ بردار اجنبی لمبے لمبے ڈگ بھرتا کہرے میں کہیں گم ہو گیا۔ حسن شیر
اپنی جگہ ایسے ٹھہر گئے تھے اس کی یہ بات سن کر کہ نہ ہی انہوں نے اس کے پیچھے جانے کی زحمت کی اور
اسے آواز لگائی۔ انہوں نے بے خیالی سے اِدھر اُدھر دیکھا وہ دریا کے کنارے کھڑے تھے وہ ا

حواسوں کو سنبھالتے' دریا کے کنارے پڑے ایک پتھر پر ٹک گئے اچھی خاصی سردی ہونے کے باوجو احساس سے اس وقت عاری تھے سوائے اس کے کہ یہ کون اجنبی تھا اور ان کے گھر کی باتیں یا اُن کو ا تک کیسے جانتا تھا۔

ابھی وہ کچھ اور اُلجھتے کہ غم و غصے کی ایک لہر اُن کے پورے وجود کا احاطہ کرگئی۔ وہ تیزی سے ا بہت عجلت بھرے انداز میں گھر کی طرف روانہ ہوئے ...... راستے بھر وہ صولت جہاں اور جمن دادا سے نو باز پرس کے کڑے طریقے ڈھونڈتے رہے...... دکھ اور افسوس کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ وہ گھ داخل ہوئے ...... اُن کے جانے اور آنے میں بیس منٹ صرف ہوئے تھے......

گھڑی دیکھ کر انہیں ایک اور حیرت کا سامنا تھا ان کے اندازے کے مطابق تو انہیں آدھے گھ اوپر کا وقت ہو چلا تھا...... صدر دروازے کی چابی ساتھ لے کر نکلے تھے چنانچہ دروازہ کھول کر وہ صح کرنے لگے ابھی وہ املتاس کے درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ املتاس کے پھولوں کا ایک با بندھا ہوا گل دستہ اُن کے شانے سے لگتا ہوا پیروں میں آ پڑا۔ وہ رک گئے املتاس کے درخت کی کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

کچھ دیر تذبذب کا شکار رہے اور پھر جھک کر پھولوں کا گلدستہ اٹھالیا۔ املتاس کے پھولوں کو خوبصورتی سے ایک ڈوری کے ساتھ باندھ کر گل دستے کی صورت دی گئی تھی۔ سوچوں میں گم حسن شی گل دستہ لیے کھڑے تھے کہ گل دستہ اُن کے ہاتھ سے ایسے پھسلا جیسے کسی نے مداخلت کی ہو...... نے دیکھا گل دستے کی ڈوری کھل چکی تھی اور املتاس کے پھول ڈوری کے بندھن سے آزاد صح بکھرے پڑے تھے یہ سب یکے بعد دیگرے ناقابل فہم طریقے سے اتنا اچانک سرزد ہوا کہ وہ ایسا س پر مجبور ہو چلے تھے۔

جو وہ ہرگز سوچنا نہیں چاہتے تھے جس کی جانب کئی مرتبہ صولت جہاں اشارہ دے رہی تھیں...... شیرازی مزید نہیں رُکے اور سیدھے اپنے کمرے میں آ گئے۔

''کیا ہوا اتنی جلدی آ گئے......'' صولت جہاں کمرے سے کچن کی جانب جانے کا ارادہ ہی کر رہ شوہر کو دیکھ کر رک گئیں۔

''کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نا......'' حسن صاحب نے صولت جہاں کو جواب میں کمرے میں آ اشارہ کیا۔ جس پریشانی عجلت سے وہ کمرے میں گئے صولت جہاں دھک سے رہ گئیں۔ پہلے ہی پے ہونے والے واقعات اور پھر کل ہونے والے عجیب واقعے نے انہیں اعصابی طور پر ایک ہیجا مبتلا کر رکھا تھا اب جو شوہر کی ایسی حالت دیکھی تو ہاتھ پیروں کی جان سی نکلتی معلوم ہوئی۔ تیزی سے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''صولت شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ ہمیں سید صاحب سے مل لینا چاہیے۔'' صولت جہاں نے ہزارویں حصے میں سمجھ گئیں تھیں کہ کچھ ہوا ہے کل سے اب تک حسن شیرازی ان سے ٹھیک سے بات بھ کر رہے تھے اور آج صبح تک اُن کا موڈ خراب تھا اور اب...... وہ صولت جہاں کو جس انداز سے اپنی سنانا چاہ رہے تھے وہ سمجھ رہی تھیں بات کس سے تعلق رکھتی ہے......

''صولت تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید...... نہیں یقیناً......'' پھر اضطراری کیفیت میں حسن شیرازی نے ا
گھونگھٹ بردار کے ملنے اور املتاس کے پھولں کے گل دستے کے کھلے اور بکھرنے تک کی روداد صو
جہاں کے گوش گزار کی۔ سب سن کر صولت جہاں چند ثانیے تک گم صم رہیں۔
''کیا سوچ رہی ہو تمہیں تو مطمئن ہونا چاہیے' بالآخر تمہاری بات ثابت ہوئی۔'' حسن صاحب
خالی لہجے سے بولے۔
''مطمئن ہونے کی بات کہاں ہے یہ؟ آپ کو واضح بتایا گیا ہے مجھے تو ایک اشارہ جیسے ملتا تھا آ
کے پاس باقاعدہ اس شخص کو بھیجا گیا ہے...... اللہ جانے یا سید صاحب کہ وہ کون تھا؟ مگر ثابت ہوتا ہے
املتاس سے جڑا ہے یہ سب جو نا سمجھ آنے والا ہے۔''
''ہاں ناقابل فہم......'' حسن صاحب نے تائید کی۔
''مگر ہے بہت اہم اور نہ جانے کیا ہے ایسا کہ ہمیں سید صاحب کے پاس جانے کی ایسے تاکید کر
گئی ہے مجھے یقین ہے اب اس پر سید صاحب بھی جانتے ہیں ہمارے مسئلے کے بارے میں......'' صو
جہاں بولیں۔
''ہاں ایسا ہی ہے......'' حسن شیرازی نے کہا۔
''تو پھر آج ہی ملنے چلتے ہیں ان سے کیا' میں محسن کو سب بتاؤں فائزہ کے علم میں آنا چاہیے
صولت جہاں نے شوہر کی تائید چاہی۔
''نہیں ابھی نہیں ہم اب پہلے سید صاحب سے تو مل لیں وہ کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں پھر ان دونو
بتایا جائے گا ابھی بتایا تو ہوسکتا ہے اور دیر ہو جائے ہمیں؟''
''دیر ہو جائے؟'' صولت جہاں شوہر کی بات سن کر حیرت زدہ ہوئیں......
''ہاں دیکھا نہیں ہے تم نے میں مان رہا تھا تمہاری بات اور اب بھی نہیں مانتا اگر یہ آج تج
واقعات نہیں ہوتے......'' حسن صاحب نے کہا۔
''ٹھیک کہتے ہیں آپ......'' صولت جہاں گہرا سانس لیتے ہوئے گویا ہوئیں۔
''بس تو پھر فون کریں سید صاحب کو......''
''نہیں میرا خیال ہے رہنے دیا جائے...... وہ ہمارے منتظر ہیں مجھے پورا یقین ہو چلا ہے اب تو
سب نارمل رکھنا ہم محسن کے آفس جانے کے بعد نکل جائیں گے...... باہر اچھی خاصی ٹھنڈ پڑ رہی تھی
کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے...... جسم میں ہلکی سی کپکپی تھی انہوں نے اپنے گرد اچھی طرح لپ
لپیٹ لیا اور اس شخص کی باتوں پر غور کرنے لگے...... کبھی وہ اس شخص کی باتوں پر غور کرتے کبھی صولت ج
کی اب تک کی باتوں پر توجہ مرکوز کرنے لگتے صولت جہاں سے سچ کہہ رہی تھیں مگر کتنی حیرت انگیز ب
تھیں ایسی انہیں تھا کہ وہ حیران کن' عقل سے ماورا ساتھ ساتھ چلتی آس پاس بستی ان دنیاؤں پر یقین
رکھتے تھے جن کا ایک عام انسان کو ادراک نہیں رکھتا...... وہ یہ بھی شعور رکھتے تھے کہ دنیا ایک عجائب خانہ
اور پھر اُن کے خاندان میں 'سید صاحب' کی موجودگی اور اُن کی بزرگانہ حیثیت اُن کے بارے میں مخفی
مخفی باتیں ان سب پر یقین تھا انہیں مگر وہ وہمی شخص نہیں تھے کہ پتہ بھی کھڑکے تو وہ اس کو کسی کی کار

قرار دے دیں۔ اور بات بات کو تعویذ' دھاگہ' جادو ٹونہ سے معمول کریں۔ وہ جانتے تھے کہ شاذ و نا
ایسے واقعات جنم لیتے ہیں پوری کائنات ایسے اَن گنت رازوں سے بھری پڑی ہے جو عقل و شعور کی حد
پرے وقت کی قید سے آزاد ہیں مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اُن کو ایسے حالات کا
کرنا پڑے گا اور اب نا چاہتے ہوئے بھی وہ ایسی ہی کسی نادیدہ دنیا کا تعارف حاصل کرنے جا رہے
سوچتے سوچتے حسن شیرازی کی آنکھ لگی ہی ہوگی غنودگی کی سی کیفیت تھی جب اُن کے کمرے میں رکھے
لائن فون کی بیل گنگنا اٹھی۔ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھالیا۔ دوسری طرف کی آواز سن کر جیسے اُن
سارے حواس جاگ اٹھے لحاف پھینک کر تیزی سے بیٹھ گئے پھر یکدم کھڑے ہوگئے۔ منہ سے صرف
آواز نکلی۔

''جی بڑے ابا ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں۔'' دوسری جانب سید صاحب تھے خاندان کے چھوٹے
سب بڑے ابا ہی پکارا کرتے تھے۔ اس غیر متوقع بلاوے کے فون نے ان کے شک کی کسی بھی قسم کی گ
اب بالکل مٹا ڈالی تھی اب تو یہ بات طے تھی کہ جو بھی ہے بہت اہم ہے...... ان کے پاس وقت بہت
انہیں روانہ ہونا تھا ناشتے سے فارغ ہو کر انہوں نے محسن شیرازی کو بتا دیا تھا کہ وہ سید صاحب سے
جا رہے ہیں اس اچانک بننے والے پروگرام سے محسن اور فائزہ دونوں حیران ضرور ہوئے مگر صولت
کے پاس معقول وجہ تھی وہ جب سے اس گھر میں شفٹ ہوئے سید صاحب کو بلانا چاہ رہے تھے مگر وہ شہ
باہر ہوتے تھے زیادہ تر دونوں میاں بیوی نے بہو اور بیٹے سے کہا کہ وہ خود دعوت دیں گے جا کر خا
کے بزرگ ہیں فون پر بلاوا پسند نہیں کیا۔ وجہ انتہائی معقول تھی۔ چنانچہ محسن شیرازی نے ماں باپ کے
گاری اور ڈرائیور کا انتظار کر دیا۔ تین گھنٹے کی مسافت کے بعد جنگل کی حدود شروع ہوئی اب یہاں
انہیں پیدل چل کر سید صاحب کی رہائش گاہ تک جانا تھا۔ ڈرائیور کچھ دور تو ان کے ساتھ آیا......
چلنے کے بعد وہ جنگل میں داخل ہو گئے ڈرائیور کو واپس بھیج دیا آگے جا کر سید صاحب نے کسی کو بھیجا
اُن کی راہ نمائی کے لیے......

اکثر لوگ اس جنگل میں راستہ بھٹک جاتے تھے سید صاحب اپنے ملنے والوں کے لیے جنگل کی
شروع ہوتے ہی ایک راہ نما روانہ کر دیتے تاکہ ان سے ملنے والے کو تکلیف نہ ہو...... صولت جہاں
حسن شیرازی آگے کچھ دور آئے تو روشنی یکدم مدھم ہوگئی جس کی وجہ گھنے درخت تھے جو سورج کی کر
روکے ہوئے تھے ان درختوں کی شاخیں ایک دوسرے سے بری طرح اُلجھی ہوئی تھیں اور ان کے تن
بیلیں چڑھی ہوئی تھیں راستے میں بھی جا بجا جنگلی بیلیں اُن کا راستہ روکتی تھیں جنہیں وہ ہاتھ سے ہ
آگے بڑھ رہے تھے۔ ہوا میں تازگی اور جنگل کی مخصوص مہک تھی پودوں اور درختوں کا سبز رنگ لگتا تھ
ہوا سے چھلک رہا ہے جنگل کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا ایک جگہ رُک کر صولت جہاں نے گہری
سانسیں اپنے اندر اتاریں۔

''کتنا سناٹا اور سکون محسوس ہو رہا ہے یہاں......'' وہ بولیں۔ حسن شیرازی ابھی جواب میں کچھ ک
والے تھے کہ وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا......

اس منفرد اچھوتے اسرار ناول کی دوسری قسط کے لیے آئندہ ماہ کا انتظار کیجیے

ذرا سی لاپرواہی...

ابراہیم کی ذرا سی لاپرواہی نے نصیبن کی گود اجاڑ دی...... سبق آموز کہانی' کیونکہ ہمارے آس پاس بے شمار ابراہیم بستے ہیں......

ریحانہ نسرین

سورج نے اپنی کرنیں زمین پر پھیلانے شروع کیں تو زمین پر آہستہ آہستہ زندگی جاگنے لگی۔ بادشاہوں کے محل سے لے کر غریبوں کے جھونپڑے تک......

دوسرے لوگوں کی طرح نصیبن بھی اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کے کمرے میں اپنے نصیب کی طرح سو رہی تھی اُس کے ماں باپ نے اس کا نام یہ سوچ کر رکھا تھا کہ شاید اُن کی بیٹی کے نصیب جاگ جائیں مگر اس کے نام کا اُس کے نصیب پر یہ اثر پڑا کہ وہ جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی۔ اور اُس کے نصیب ہی سو گئے۔ وہ بھی سو رہی تھی۔ سورج کی کرنیں اِس بدنصیب گھر کی طرف بڑھتے ہوئے جھجک رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا کہ سورج نے کوئی چوری کی ہو اور اس طرف دیکھنے سے کترا رہا ہو نا جانے کیا بات تھی کہ سورج چاہ رہا تھا کہ اس بستی میں آج اپنا اجالا نہ پھیلائے۔ یہاں رات ہی رہے اور یہاں کے باسی آج سوتے ہی رہیں۔ آج نہ اٹھیں۔ مگر وہ قانونِ قدرت کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا تھا۔ ناچار اپنا نور چار طرف پھیلا دیا اور کچھوے کی رفتار سے بدنصیب گھر کی طرف روشنی بڑھنے لگی۔

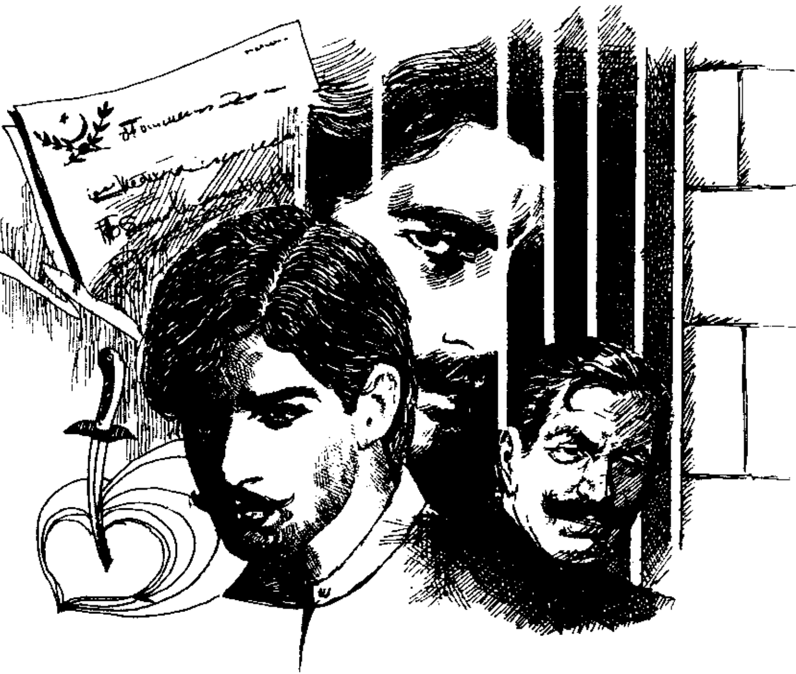
نصیبن اپنے پانچ سالہ بیٹے ارشد جسے وہ کہتی تھی اُس کے ساتھ بے خبر سو رہی تھی۔ شید میں اُس کی جان تھی اُس کی شادی اکبر سے تھی جو کہ ان کی برادری کا اور دور کا رشتے دار تھا۔ وہ گلیوں میں غبارے بیچتا تھا۔ دونوں م بیوی کا گزارہ ہوجاتا تھا۔ مگر جب شید خوشخبری سنائی دی تو اکبر نے دوسرا کام بھی شر کردیا۔ دن میں غبارے بیچتا اور شام کو سڑک گاڑیاں صاف کرتا۔ اضافی آمدنی ہونے وا بچے کے لیے الگ جمع کی جارہی تھی۔ نصیبن خ تھی کہ اُس کے شوہر کو ابھی سے آنے وا خرچ کی اور ذمے داریوں کی فکر تھی۔ پھر ہوگیا تو دونوں میاں بیوی بے حد خوش تھے بچے کے مستقبل کے خواب دیکھنے لگے کہ ہم ا بچے کو پڑھائیں گے۔ پھر ایک منحوس دن ا

چورنگی پر سگنل بند ہونے پر گاڑی صاف کررہا تھا کہ ایک تیز رفتار ڈمپر سگنل توڑتا ہوا بے قابو سانڈ کی طرح اکبر کو روندتا ہوا گزر گیا۔ سب کچھ دو منٹ میں ہوگیا اور اکبر بیٹے کے مستقبل کے خواب آنکھوں میں بسائے دوسری دنیا میں جا بسا۔ نصیبن اپنے بچے کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ اُس کے سسرال میں تو کوئی تھا ہی نہیں۔ اُس کے اپنے ماں باپ بھی فوت ہوچکے تھے۔ اُس نے اپنے مرحوم شوہر کے نام پر زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب وہ تھی اور شیدا تھا' وہ کوئی پڑھی لکھی عورت تو تھی نہیں' اس لیے اپنا اور بچے کا پیٹ پالنے کے لیے اس نے پوش علاقے میں جھاڑو برتن صاف کرنے کا کام شروع کردیا۔

اکبر نے ایک کام اچھا کیا تھا کہ یہ دو کمروں کا ٹوٹا پھوٹا گھر اُس کی ملکیت تھا۔ لہٰذا اُس کی بیوی اور بچے کو اس کچی آبادی میں سر چھپانے کا ٹھ ملا ہوا تھا۔ وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتی' ورنہ مہنگائی کے دور میں گھر کا کرایہ کہاں سے د اب وہ سکون سے سوتو جاتی تھی۔

جب وہ کام پر چلی جاتی تو اُس کا بیٹا سار گلی میں کھیلتا رہتا۔ اس محلے میں کوئی پڑھ خاندان تو تھا نہیں کہ نصیبن اپنے شیدے کو پڑھنے بٹھاتی اس لیے وہ کھیلتا رہتا۔ صبح وہ اس کو پکا کر کھلاتی اور دن میں کوئی محلے دار اُس بچے پر کر روکھی سوکھی دے دیتا۔ شام کو جب ماں آتی تو سب کے گھروں کا بچا کچا کھانا لاتی اور د ماں بیٹے رنگ برنگے کھانوں سے اپنا بھر لیتے۔ خدا اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ امیر گھروں بچے جتنا اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ اتنے ہی د



پیلے سے ہوتے ہیں اور غریبوں کے بچے اتنے ہی خوبصورت اور تندرست ہوتے ہیں۔ مٹی میں کھیل کود کر اپنی عمر سے بڑے لگتے ہیں۔ نا کوئی اُن کے ناز نخرے اٹھاتا ہے نہ کوئی متوازن غذا ملتی ہے۔ یہ ہی حال شیدے کا تھا۔ بچے ہوئے کھانے کھا کر وہ گول مٹول خوبصورت سا بچہ نظر آتا تھا۔ ماں تو اٹھتے بیٹھتے اُس کی نظر اتارتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اُس نے اپنے بیٹے کی پڑھائی لکھائی کے جو خواب دیکھے تھے کیا وہ کبھی پورے نہیں ہوں گے۔ اب وہ سوچتی تھی کہ شیدا جلد بڑا ہو جائے اور کچھ کمانے لگے تا کہ اُس کو بھی ذرا سہارا مل جائے۔

شیدا سارا دن گھر کی دہلیز پر کھیلتا رہتا۔ دروازہ کھلا رہتا اِن کے گھر میں تھا کیا جو کوئی چور آتا۔ سب کے گھر ایک جیسے ہی تھے اور ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ اس لیے ماں بے فکر رہتی محلّہ اچھا تھا۔ ایک غریب دوسرے غریب کا خیال کرتا تھا۔

شیدا اب بڑا ہو رہا تھا' جب سب بچے کھیل رہے ہوتے اور کسی بچے کا باپ کام پر سے' دکان سے یا اپنا ٹھیلا لے کر واپس آتا تو اُس کے بچے باپ کو آتا دیکھ کر خوش ہوتے اور کھیل کود چھوڑ کر گھر چلے جاتے اور باپ کے ساتھ خوش ہوتے۔ شیدا سوچتا کہ اُس کا باپ کیوں نہیں ہے؟ سب کی مائیں گھروں میں اپنے بچے کے لیے کھانا پکاتی ہیں۔ میری ماں دوسروں کے گھروں سے کھانا کیوں لاتی ہے' وہ کیوں کام پر جاتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ......

ایک دن محلے میں ہل چل مچ گئی۔ سارے محلے والے قاسم کے گھر جمع ہو رہے تھے۔ کیونکہ اُن کے گھر ٹی وی آیا تھا۔ اس گلی میں یہ پہلا ٹی وی تھا ایک رش لگا ہوا تھا۔

قاسم کی پرچون کی اپنی ذاتی دکان تھی۔ وہ پیسے جمع کر کے آج اپنے بچوں کے لیے ٹی وی تھا۔ اس رش میں شیدا بھی تھا۔ ویسے تو شید نے کئی بار ٹی وی دیکھا تھا۔ جب وہ کبھی بیمار ہ ماں اُسے اپنے ساتھ کام پر لے جاتی اور بڑے گھروں میں بڑے بڑے ٹی وی تھے۔ گ دور سے ہی دیکھ پاتا' مگر آج اتنی قریب سے بار دیکھ رہا تھا اور بے حد خوش تھا۔ وہ انتظار ک تھا کہ کب قاسم چاچا ٹی وی چالو کریں گے۔ کی بیوی رشیدن سر پر پھٹا ہوا دوپٹہ اوڑھے کی عورتوں سے مبارکباد وصول کر رہی تھی اور کے پان والے لال لال دانت پورے پورے باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ اِس وقت محلے کی سیٹھانی بنی ہوئی تھی۔ اس وقت اُس کو ا پھٹے پرانے کپڑے' کچا پکا گھر' کچھ نظر نہیں آر ۔ نظر آ رہا تھا تو صرف ٹی وی جو کہ اُس کا شوہر کے آدمیوں کے ساتھ سیٹ کر رہا تھا اور ٹی چالو نہیں ہو رہا تھا۔ سارے بچے اچھل کود کر شور مچا رہے تھے۔

غریبوں کی بستی میں ایک بات بہت ا ہوتی ہے کہ وہ غم اور خوشی میں ایک ہو جاتے ہ اس وقت بھی سارا محلّہ ایسے خوش ہو رہا تھا ک وی اُن کے اپنے گھر آیا ہو۔ سب سے ز اودھم بچوں نے مچایا ہوا تھا۔ آخر اللہ اللہ کر ایک گھنٹے بعد ٹی وی آن ہو گیا۔ سب بچے چیخ "چالو ہو گیا' چالو ہو گیا۔" قاسم سب سے مین سینہ تانے ایسے کھڑا تھا کہ جیسے چاند پر قدم اُسی نے رکھا ہو۔ رشیدن نظروں ہی نظر میں اپنے میاں پر صدقے واری ہو رہی تھی ریموٹ قاسم کے ہاتھ میں تھا۔ وہ رشیدن کو دکھا کر سمجھا رہا تھا کہ کیسے چالو کرنا ہے کیسے بند ہے چینل کیسے بدلنا ہے؟ اتنے سارے بٹن د

رشیدہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' مگر وہ بہت خوش تھی شیدا بھی بہت خوش تھا کہ اب سارا دن دھوپ میں بیٹھنے سے بچ جاؤں گا۔ بس صبح ماں کام پر جایا کرے گی تو میں یہاں آ جایا کروں گا۔

ٹی وی کو آئے تقریباً ایک مہینے ہونے والا تھا۔ شروع شروع میں لوگ بڑے شوق سے جاتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ رش کم ہونے لگا۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ یکسانیت سے بہت جلدی اُکتا جاتا ہے۔ یہ ہی حال شیدے کا تھا۔ وہ جو پروگرام دیکھنا چاہتا رشیدن اور اُس کے بچے کچھ اور دیکھنے لگتے۔ شیدا بور ہونے لگا۔ اب وہ اور دوسرے بچے پھر سے گلی میں کھیلنے لگے۔ رشیدن کو فلموں اور گانوں کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اُس کو ٹی وی کی بری لگ لگ گئی تھی۔

شیدے نے ٹی وی پر بہت سارے پروگرام دیکھے تھے اور اسے گیند بلے والا کھیل بہت پسند آیا تھا۔ جب سے اُس نے گیند دیکھی تھی تب سے وہ اپنی ماں کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ اُسے بھی ویسی ہی گیند لا کر دے' وہ بھی کھیلے گا۔ نصیبن اسے سمجھاتی رہی' بہلاتی رہی' مگر اُس نے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی تھی کہ مجھے گیند چاہیے۔ مجھے لا کر دے ماں' ایک دن نصیبن کو غصہ آ گیا۔ اُس نے شیدے کے دو تھپڑ لگائے اور قاسم کے گھر جا کر اُس کی بیوی بچوں کو منع کر دیا کہ وہ شیدے کو ٹی وی دیکھنے نہ آنے دیں۔ وہ نئی نئی چیزیں دیکھ کر مانگنے لگتا ہے۔ میں کہاں سے لا کر دوں۔ شیدے کی فرمائش کا غبار اُس نے رشیدن پر اُتار دیا۔

اب قاسم کے دروازے شیدے پر بند ہو گئے۔ اب پھر وہ سارا دن گلی میں کھیلتا رہتا۔ نصیبن نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اپنے بچے کی اُداسی دیکھ کر اُس کا دل کٹنے لگتا۔ پھر اگلے دن اُس نے شیدے کو خوب پیار کیا اور اُس سے وعدہ کیا ک
پیسے جمع کر رہی ہے۔ جب بہت سارے پیسے
ہو جائیں گے تو وہ بہت اچھی والی گیند اپنے
لا کر دے گی۔ کیونکہ وہ گیند بہت سارے پیس
کی آئے گی۔ وہ بچہ ہی تو تھا بہل گیا اور خوشی
اپنی آنے والی گیند کا انتظار کرنے لگا۔ وہ
اپنے دوستوں کو بتایا کہ میری ماں وہی ٹی وی
گیند میرے لیے لائے گی۔ بہت سارے پیس
کی آئے گی۔ پھر میں بھی ٹی وی والوں کی ط
کھیلوں گا۔ اور محلے کے بچے اس کو یوں دیکھ
جیسے وہ کرکٹ ٹیم کا کپتان ہو۔ وقت گزرتا
شیدا روز ماں سے پوچھتا کہ اب کتنے پیسے
ہو گئے اور ہر بار ماں یہ ہی کہتی کہ بیٹا ابھی
ہونے دے۔ تب ہی تو اچھی والی گیند آئے
اب شیدا اکیلا ہی اپنی دہلیز پر بیٹھا رہتا۔
اُسے صرف اُس دن کا انتظار تھا کہ جب اُس
ماں اُس کے لیے گیند لائے گی۔ وہ بیٹھے
خواب دیکھتا رہتا۔

نصیبن کے گھر کے بعد دو تین گھر چھو
ابراہیم کا گھر تھا۔ اُس کے گھر میں بھی کمانے
وہ اکیلا تھا اور کھانے والے 7 لوگ تھے۔
چھوٹے تھے' اُس نے ایک کمرہ اوپر بنوا کر کرا
پر دینے کا پروگرام بنایا کہ کچھ تو اُس کا ہاتھ
گا۔ آج اُس کا گھر دیکھنے کچھ آدمی آئے
بات چیت ہو رہی تھی۔ پھر ایک دن پتہ چلا ک
کمرہ کرائے پر دے دیا گیا ہے۔ دو آدمی ہیں
عورت بچہ کوئی نہیں ہے۔ دونوں چھڑے چھا
ہیں۔ کمانے والے ہیں' زیادہ بک بک
جھک نہیں ہو گی۔

کرایہ وقت پر ملے گا۔ پانی بجلی کم
ہو گی۔ ہر طرح سے فائدہ ہے۔ اُس نے یہ

سوچا کہ یہ لوگ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں کیا
کام کرتے ہیں؟ صبح جاتے ہیں اُن کے اصلی نام
کیا ہیں ہمراے ہاں کے لوگوں کی عادت ہوتی
ہے کہ ہر ایک پر فوراً یقین اور بھروسا کر لیتے ہیں۔
جیسے خود ہوتے ہیں سیدھے سادھے ویسا ہی سب
کو سمجھتے ہیں۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے دنیاوی
ہوشیاری اور حالات کو سمجھنے سے قاصر ہوتے
ہیں۔ کوئی اپنا مسئلہ بیان کر دے یہ لوگ فوراً مدد
کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ابراہیم نے بھی کسی قسم
کی چھان بین کو ضروری نہیں سمجھا۔ بس وہ خوش تھا
کہ گھر بیٹھے چار پیسے مل جائیں گے۔ ان لوگوں
کے آنے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔

آج کے دور میں سب اتنے مصروف رہتے
ہیں کہ محلے میں آنے جانے والوں کے بارے
میں کوئی جاننا بھی نہیں چاہتا۔ ان دونوں کے نام
گلو اور بلو تھے۔ یہ کیسے نام تھے۔ کسی نے نہیں
پوچھا یہ دونوں بھی مزے سے رہنے لگے۔ ان
لوگوں نے محلے والوں کی سادگی اور جہالت کا
بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دنیا دکھاوے کے لیے
شرافت کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ دونوں نے اپنے
آپ کو بھائی بتایا ہوا تھا کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔
دونوں مسجد میں نماز پڑھتے' گلی سے سر جھکا کر
گزرتے۔ بلاضرورت بات نہ کرتے' غرض کہ
محلے والوں پر اپنی شرافت کا سکہ جما دیا تھا' سب
ان سے بہت متاثر تھے آتے جاتے بچوں
کو ٹافیاں دیتے' بچے بوڑھے سب اُن سے خوش
تھے۔

ایک دن گلو شاید بیمار تھا کیونکہ آج وہ گھر پر
ہی تھا کام پر نہیں گیا تھا' دوپہر میں جب گلی میں
سناٹا تھا' وہ گھر سے باہر آیا اُس نے دیکھا کہ ایک
5 سال کا خوب صورت گول مٹول سا بچہ اُداس سا

اپنے گھر کی ڈھیر پر بیٹھا ہے۔ اُس کو یہ بچہ
پسند آیا وہ محتاط انداز میں چلتا ہوا اِس کے
آیا۔ شیدا اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا۔ اُ
نظریں نیچے تھیں تب ہی دو بڑے بڑے
جوتے اُس کے پاس آ کر رُک گئے۔ وہ ڈر ک
ہو گیا تو دیکھا کہ ایک لمبا چوڑا آدمی اُس
سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ شیدا تو گھر میں اکیلا
تھا' وہ ڈر گیا' گلی بھی سنسان تھی گھر بھی خالی
وہ ڈر کر اُسے دیکھنے لگا۔ گلو نے مسکرا کر پیار
اُسے دیکھا اور بولا۔

''بیٹا ڈرو مت' اپنا نام تو بتاؤ۔'' شیدے
ڈرتے ڈرتے اپنا نام بتایا۔ گلو بولا۔

''تم اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟'' شیدا بولا۔

''ماں کام پر گئی ہے۔ جب وہ آئے گی
اندر جاؤں گا۔'' گلو بولا۔

''تمہارے ابا کام پر نہیں جاتے؟'' شید
نے اُسے بتایا کہ اس کے ابا نہیں ہیں۔ گلو ک
افسوس ہوا۔ اُس نے شیدے سے پوچھا۔

''بیٹا تم نے کھانا کھایا ہے؟'' شیدے
انکار میں سر ہلا دیا۔ گلو کو اور بھی دکھ ہوا۔ اُ
اِس بچے پر بہت ترس آیا۔ اُسے شیدا بہت پسن
تھا۔ وہ تھا ہی اتنا پیارا کہ سب کو اچھا لگتا تھا
نے اُس کا سر تھپتھپایا اور بولا۔

''بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو
ہوں۔'' پھر وہ اپنے گھر گیا اور کچھ پھل
شیدے کو دیے۔ کھانا تو وہ لوگ ہوٹل میں
کھاتے تھے۔ اس لیے کھانا تو تھا نہیں وہ پھل
کر لے آیا۔ شیدے کو دے کر کہا۔

''بیٹا یہ کھا لو' جب تمہاری ماں آئے گی
تک کیا بھوکے رہو گے۔'' شیدے نے جل
لے کر کھا لیے۔ اُس کو یہ نہیں پتہ تھا کہ اجنب

سے لے کر کچھ نہیں کھانا چاہیے۔ وہ تو محلے والوں کا دیا ہی کھاتا تھا۔ اس لیے گلو سے بھی لے کر کھالیا۔

اب گلو کا معمول بن گیا۔ وہ شیدے کو روز کوئی نہ کوئی چیز کھانے کو دیتا۔ اُس نے بچے کو بہلا پھسلا کر اپنی باتوں کے جال میں جکڑ لیا تھا۔ روز اُس سے باتیں کرتا' پورے محلے کی ساری معلومات اُس نے شیدے سے حاصل کرلی تھیں۔ کس گھر میں کتنے افراد ہیں' کون کس وقت کام پر جاتا ہے۔ کب واپس آتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ' دونوں کی بہت پکی دوستی ہوگئی تھی۔

شیدا روز رات کو نصیبن کو بتاتا کہ گلو چاچا مجھے روز کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں۔ کبھی بسکٹ' کبھی ٹافی' کبھی کیلے' کبھی کینو' ماں دن بھر کی تھکی ہاری ہوتی تھی۔ کبھی سنتی کبھی اَن سنی کردیتی۔ کبھی منع کردیتی کہ مت لیا کرو۔ کبھی ہوں ہاں کردیتی۔

شیدے اور گلو کی دوستی دن بدن پکی ہوتی جارہی تھی۔ ایک دن موقع دیکھ کر گلو شیدے سے بولا۔

''تم اکیلے بیٹھے رہتے ہو' دوستوں کے ساتھ کھیلتے کیوں نہیں۔'' شیدے نے ٹی وی اور اپنی گیند کی دکھ بھری کہانی گلو کو سنادی۔

''ابھی ماں پیسے جمع کررہی ہے پھر میرے لیے گیند لائے گی۔''

گلو کو اس بچے کی معصومیت پر بہت پیار آیا اُس نے شیدے کے موٹے موٹے گالوں پر پیار کیا اور بولا۔

''ارے بیٹا گیند تو میں تم کو آج ہی لادوں گا۔ شام کو واپسی میں لے آؤں گا۔'' شیدا تو یہ سن کر خوشی سے پاگل ہوگیا۔ شام کو جب نصیبن کام پر سے واپس آئی تو اُس نے خوشی خوشی ماں کو بتایا

کہ کل گلو چاچا اُس کو گیند لاکر دیں گے۔ ماں بی حسرت سے اپنے بچے کے چہرے کو خوشی بھرپور دیکھا اور بولی۔

''بیٹا نہ تیرا کوئی چاچا ہے نہ ماما' میں لال کو گیند خود لاکر دوں گی۔'' مگر شیدے جیسے اُس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ تو بس اب بولے چاچا کے گن گارہا تھا۔ ماں بھی تھک ہا خاموش ہوگئی۔

نصیبن نے ابراہیم کے گھر جاکر ان د کرائے داروں کے بارے میں پوچھا۔ تو ا نے ان کی تعریف شروع کردی کہ دونوں بہت شریف ہیں۔ مسجد جاکر نماز پڑھتے ہیں میں کبھی اونچی آواز سے بات نہیں کرتے۔ گل سر جھکا کر آنا جانا کرتے ہیں۔ عورتوں کی کرتے ہیں۔ بچوں سے پیار کرتے ہیں اپ سے کام رکھتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات کرایہ وقت پر دیتے ہیں۔ ہماری قسمت اچ کہ اتنے اچھے کرائے دار مل گئے۔ ابراہیم خوش تھا۔ وہ تو کچھ دن گلو بیمار رہا تو شیدے اتنی دوستی بھی کرلی۔ ورنہ محلے میں کہیں بھی آنا جانا نہیں ہے۔ نصیبن مطمئن ہوگئی اور شی کو گیند لینے کی اجازت دے دی۔

اب شیدا اور بھی شدت سے اپنی گین آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اللہ اللہ کرکے ایک کو اُس کو گلو نے ایک خوبصورت سی گیند لاکر ہی دی۔ گیند کیا تھی شیدے کو نئی زندگی مل گئی وہ گیند تو ٹی وی والی گیند سے بھی اچھی تھی۔ زمین پر مارتے تو اس میں لال رنگ کی لائٹ تھی۔ شیدا تو حیرت سے گنگ رہ گیا۔ یہ تو نئی چیز تھی۔ نصیبن بھی حیران تھی اور بچے کی دیکھ کر خوش بھی' پورے محلے کے بچے شید

ھیرے کھڑے تھے۔ اور رشک بھری نظروں
سے گیند کو دیکھ رہے تھے۔ سب باری باری ہاتھ
میں لے کر زمین پر مار رہے تھے اور گیند کی لائٹ
جگمگا رہی تھی۔ شیدے کے تو پاؤں زمین پر نہیں
ٹک رہے تھے۔ غرض یہ کہ اب قاسم کے ٹی وی کو
بھول کر لوگ شیدے کی گیند کو دیکھ رہے تھے۔
شیدا بھی اکڑ کر کھڑا تھا کہ دیکھو تمہارے ٹی وی
سے اچھی میری گیند ہے۔

اب ہر بچہ گلو چاچا کا دیوانہ ہو گیا اور اُس سے
کہا کہ ہمیں بھی ایسی ہی انوکھی گیند لا کر دو' محلے
والے بھی ان دونوں بھائیوں کی اور عزت کرنے
لگے کہ انہوں نے ایک غریب یتیم بچے کی خوشی
کے لیے اتنے پیسے خرچ کیے۔

اب پورے محلے میں گلو اور بلو کا نام ہو گیا۔
نصیبن بھی خوش تھی کہ چلو ایسی گیند تو میں بھی نہیں
دلا سکتی تھی۔ اچھا ہوا کہ ان دونوں نے لے دی
اب وہ اور مطمئن ہو کر کام پر جانے لگی کہ اس کے
بچے کا خیال رکھنے والوں میں اور لوگوں کا اضافہ
ہو گیا ہے۔

جہالت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہی ہے کہ
لوگ انجانے لوگوں پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ دو
پیسے کی چیز لے کر اپنا گھر بار اُن کی حفاظت میں
دے دیتے ہیں۔ یہ ہی سب کچھ اس محلے میں
ہوا۔ گلو اور بلو کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے' کیا
تھے؟ کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس جو انہوں نے
کہا آنکھ بند کر کے اس پر یقین کر لیا اب سب
بچوں کو اپنی باری کا انتظار تھا کہ ان کی گیند کب
آئے گی۔ گلو نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اب جو
گیند لاؤں گا وہ سب بچوں کے لیے ہو گی اور
بہت شاندار اور لائٹوں والی ہو گی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔
پورے فرش پر عجیب قسم کا سامان بکھرا ہوا تھا۔
دونوں بھائی الیکٹرک کا کوئی کام کر رہے
اسکرو' تار' بال بیئرنگ' نٹ وغیرہ پھیلے ہو
تھے۔ دونوں کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹ
ہوئی تھی۔ جو اس زیرو لائٹ میں اور بھی خو
لگ رہی تھی۔ دونوں خوش تھے کہ انہوں نے ا
گھناؤنے کام کے لیے زمین ہموار کر لی تھ
لوگوں کا اعتماد جیت لیا تھا۔ اس محلے میں
عزت بنالی تھی۔ یہ ہی کام مشکل تھا۔ وہ جب
لینے آئے تھے کرائے پر تو ڈر رہے تھے کہ ا
ہماری اصلیت نہ جان جائیں۔ کوئی چھان بی
کرلیں۔ ہمارے اصلی چہرے بے نقاب
ہو جائیں مگر جب ابراہیم کو نوٹوں کی جھلک د
تو سارے کام خود بخود آسان ہوتے گئے۔
نے بھی کسی قسم کی کوئی انکوائری نہیں کی۔ اب
پوری تندہی سے ناپاک منصوبے کو پایہ تکمیل
پہنچانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مہینے کی ط
جدوجہد کے بعد آخر کار وہ کامیاب ہو ہی گ
اپنے مذموم مقصد کو پورا کرنے کے لیے ا
نے کل کا دن منتخب کیا تھا۔

آج وہ منحوس صبح تھی جب سورج اپنا
چھپانا چاہ رہا تھا دن نکلا تو نصیبن کی آنکھ کھل
وہ روزانہ اِسی وقت اٹھتی تھی۔ اپنے اور شید
کے لیے آٹا گوندھ کر روٹی پکاتی' چائے ب
دونوں ماں بیٹے ایک ساتھ ناشتہ کرتے' صبح
بس اتنی ہی دیر تک اُن کا ساتھ رہتا۔ ماں ا
بچے کا پیٹ بھروا کر گھر سے نکلتی تھی۔ جاتے جا
بھی اُسے دس تو بج ہی جاتے تھے۔ آج وہ
اٹھی تو لیٹے ہی لیٹے اُس نے شیدے کی ط
دیکھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ کا
گھنے بال گورے گورے ماتھے پر پڑے تھے

اپنی ماں کا شہزادہ تھا۔ ماں پیار بھری آنکھوں سے اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے شیدے کو سینے سے لپٹا لیا۔ وہ خالی الذہنی کی حالت میں اُس کو پیار کرنے لگی۔

یہ کیسا دن نکلا تھا۔ کیسی صبح تھی کہ اُس کا دل الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ خود بخود اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور ارشد کے گھنے بالوں کو بھگونے لگے۔ وہ اپنی ماں کی جذباتی حالت سے بے نیاز بے خبر گہری نیند میں تھا۔ آج نصیبن کا بالکل مو نہیں تھا کہ وہ کام پر جائے۔ بس وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے وجود میں چھپا لینا چاہتی تھی۔ اُس نے شیدے کو اور مضبوطی سے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ بچہ کسمسانے لگا۔ آج اس کو اکبر بھی یاد آنے لگا۔ نہ جانے اُسے صبح ہی صبح کیا ہو گیا تھا۔ اُس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے' اگر بے وجہ دل بھاری ہو تو تھوڑا رو لینے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا۔ جب دل ذرا ہلکا ہوا تو اُس نے اپنی اس حالت پر غور کیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس سے پہلے تو کبھی وہ صبح ہی صبح نہیں روئی تھی۔ مگر اس کو اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کا دل کیوں ڈوب رہا تھا۔ کیا آج پھر کوئی اندوہناک حادثہ ہونے والا ہے۔ اُس نے خوف سے ایک جھرجھری لی اور خود پر قابو پاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ ایک ماں کا دل تھا جو اُس کو آنے والے برے وقت سے آگاہ کر رہا تھا کہ آج اپنے بچے کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے' وہ اتھل پتھل ہوتے دل کے ساتھ روزہ مرہ کے کام میں لگ گئی۔ مگر آج اُس کا دل کہیں اور ہی تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ آج اُس کی دنیا ہی اجڑ جائے گی۔ اس لیے کہ دل نے اس کی بدنصیبی پر پہلے سے ہی رونا شروع کر دیا

تھا۔ اُس کی حالت جو بھی ہو اُس کو کام پر تو ج
تھا۔ وہ اٹھ گئی اور اپنے کام میں لگ گئی۔ اُس
چائے بنائی۔ روٹی پکائی اور شیدے کے لیے
پراٹھا بنایا' کیونکہ شیدا کو بہت پسند تھا۔ وہ اک
کر کے اپنے لیے بنواتا تھا۔ مگر آج تو اُس
کوئی فرمائش نہیں کی تھی پھر بھی ماں نے اج
دل کے ساتھ میٹھا پراٹھا بنایا تھا اپنے لال
لیے......

اُس نے شیدے کو بڑے پیار سے اٹھ
منہ ہاتھ دھلا کر اُسے ناشتا دیا۔ وہ اپنی پسند
دیکھ کر بہت خوش ہوا اور جلدی جلدی کھانے
پھر اچانک اُسے خیال آیا اور وہ ماں سے بول
''ماں آج تو میں نے تجھ سے یہ بنا
لیے ضد نہیں کی تھی۔ پھر تو نے خود سے کیوں
دیا۔'' ماں کے پاس اس کی کیوں کا کوئی ج
نہیں تھا۔ وہ پیار سے اُسے دیکھتی رہی اور بو
''میرا دل چاہ رہا تھا تو اس لیے میں
بنا دیا۔'' وہ خوشی خوشی کھانے لگا۔ ماں اُسے
دیکھتی رہی۔ اُس کا دل پھر ڈوبنے لگا۔ اُس
ہاتھ میں وہی گیند تھی جو گلو نے اُسے دی تھی۔
سے اُسے گیند ملی تھی۔ وہ دن رات اُس کے
میں رہتی۔ جب سو جاتا تب نصیبن اُس کے
سے لے کر رکھتی تھی۔ صبح پھر وہ اُس کے ہاتھ
ہوتی۔

آج تو شیدے کو دو خوشیاں مل رہی تھ
ایک تو بن مانگے میٹھا پراٹھا مل گیا اور دو
آج گلو چاچا سب بچوں کے لیے شیدے
اچھی اور بڑی والی گیند لانے والا تھا۔ ماں
بچے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے خوش
چمکتا چہرہ اُسے چودھویں کا چاند لگ رہا تھ
سارا منظر بار بار دھندلا رہا تھا۔ کیونکہ آنکھ

بار آنسو سے بھری جارہی تھیں وہ بھیگی آنکھوں سے اُسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ آج کام سے چھٹی کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر ایک گھر میں شادی تھی اور انہوں نے چھٹی کرنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ ورنہ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ گھر میں رہے۔ اور شیدے کے پسند کے سارے کھانے پکا کر اپنے ہاتھوں سے اُسے کھلائے۔ ورنہ روز تو وہ سارے گھروں کے بچے کچے کھانے کھاتا ہے۔ مگر وہ اپنی خواہش کو دل میں دبائے بھاری دل کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بچہ ماں کے دل کی کیفیت سے بے خبر خوشی خوشی ناشتہ کررہا تھا۔ جب وہ تیار ہوگئی تو شیدا ابھی ناشتہ ختم کرکے اپنی گیند سے کھیل رہا تھا۔ ماں نے اپنے بچے کو خوب پیار کیا۔ شیدا حیران تھا کہ آج ماں کو کیا ہوگیا بار بار رورہی ہے اور پیار کرے جارہی ہے۔

روز تو ایسا نہیں کرتی پھر آج کیوں کررہی ہے۔ اُس نے ماں کو پیار کیا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ماں کے آنسو پونچھے اور بولا۔

''ماں میں بڑا ہوجاؤں گا تو پھر تجھے کام پر نہیں جانے دوں گا اور تجھے پھر رونا بھی نہیں آئے گا'' ماں نے اُسے سینے سے لپٹا لیا۔ خوب پیار کیا اور بولی۔

''گھر میں رہنا۔'' وہ بولا۔

''ماں آج تو گلو چاچا نئی گیند لائے گا' میں تو دیکھوں گا کیسی ہے گیند' میری گیند سے اچھی تو ہوگی نہیں۔'' ماں نے اُسے پیار کیا اور کام پر چلی گئی۔

گلو اور بلو کو آج اپنا بھیانک منصوبہ پائیہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ کل رات کو ہی انہوں نے اپنا سارا سامان پیک کرلیا تھا۔ کمرے میں کوئی ایسی نانی نہیں چھوڑی تھی جس سے ان کی شناخ ہوجائے یا وہ گرفت میں آسکیں۔ انہوں رات میں اپنے واکی ٹاکی سے کسی سے بات کی جو شاید ان کا 'باس' تھا۔ آواز بہت دھیمی تھی تا کوئی سن نہ سکے۔ وہ خفیہ کوڈ میں گفتگو کرتے تھے انہوں نے اپنے باس کو یقین دلایا تھا۔

''زمین تیار ہے کل تین بجے فصل کٹے گی اُس وقت مطلع صاف ہوتا ہے کوئی بادل نہ ہوتا۔ بس آپ اپنا مال تیار رکھیں ہم فوراً ہی یہ سے نکل جائیں گے۔'' پھر 'باس' کا جواب سن دونوں کے چہروں پر خبیث مسکراہٹ پھیل تھی۔ انہوں نے فون سیٹ بند کرکے اپنے سا میں رکھ لیا تھا اور سونے کے لیے لیٹ گئے تھے آخر کل اُن کو بچوں کو 'اچھی والی گیند' جو دینی تھی۔

کل رات شیدے کو بھی نیند نہیں آرہی تھی وہ اپنی ماں سے مستقل باتیں کیے جارہا تھا۔ صبح چاچا اور بھی بڑی والی گیند لائے گا۔ وہ ماں بولا۔

''ماں میری گیند سب سے اچھی ہے نا

ماں نے پیار سے اُس کے بال سنوارے اور کہا

''ہاں بیٹا تیری گیند سے اچھی تو کسی کی گیند نہیں ہے۔ گلو چاچا نے بچوں کو بہلانے لیے بولا ہوگا۔ ورنہ تو سب سے اچھی تو تیری ہے۔''

شیدا خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''ماں کل تو چھٹی کرلے کام پر مت جا' تو دیکھ لینا اُن کی گیند۔'' ماں بولی۔

''میں شام کو آکر دیکھ لوں گی۔ تُو کھیلنا ا کے ساتھ۔'' شیدا مان گیا اور ماں سے لپٹ لیٹ گیا مگر دماغ اُس کا گیند میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ ماں بیٹے کی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی

آخری رات تھی۔ اگر ماں کو پہلے سے پتا چل جاتا کہ صبح کیا ہوگا تو وہ راتوں رات اپنے بچے کو لے کر کہیں دور نکل جاتی یوں موت کے منہ میں اُسے تنہا چھوڑ کر کام پر نا جاتی۔

صبح ہو چکی تھی۔ آج سب بچے بہت جوش میں تھے۔ ہر گھر میں خوشی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ آج سب بچوں کو شیدے سے بھی اچھی گیند ملنے والی تھی۔ پورے 20 دن کے بعد آج وہ منحوس دن آ ہی گیا۔ جب گلو کا مقصد پورا ہونے والا تھا۔ آج کے انتظار میں اُس نے 6 مہینے اَن تھک محنت کی تھی۔ شرافت کا لبادہ اوڑھا تھا' پورے محلے کا اعتماد حاصل کیا تھا۔ اب وہ جو چاہے کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنے مذموم مقصد کے لیے آج کا دن منتخب کیا تھا۔

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ تھی۔ سب مرد اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔ عورتیں صبح سے کام کر کے اب تھک کے آرام کر رہی تھیں۔ نصیبن اپنے کام پر گئی ہوئی تھی۔ شیدا اور باقی سارے بچے آج گلی میں بیٹھے گلو چاچا کا انتظار کر رہے تھے' سب بچوں کی نظریں گلی کے نکڑ پر تھیں۔ جہاں سے گلو آتا تھا۔ آخر کار ساڑھے تین بجے کے قریب گلو گلی میں داخل ہوا۔ سب بچوں کو ایک جگہ دیکھ کر اس کے مکروہ چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اپنے معصوم چہروں اور معصوم مسکراہٹ کے ساتھ بچے اس موت کے فرشتے کو اپنے قریب آتا دیکھتے رہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مردود شخص اُن کے لیے کوئی گیند نہیں بلکہ موت لے کر آ رہا ہے۔

جب وہ قریب آ گیا تو سب بچے دوڑ کے خوشی خوشی اُس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ ارشد بھی اپنی گیند ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔ اُس کو زیادہ بے چینی تھی ک... کی گیند سے اچھی کوئی گیند ہو بھی سکتی ... نہیں...... گلو نے سب بچوں کو ایک دائرے... کھڑا کیا۔ اور ایک عجیب و غریب قسم کی گیند... کر زمین پر رکھی اور بچوں سے بولا۔

"سب اور قریب آ جائیں۔" سب... قریب ہو گئے اور حیرت سے اس خراب اور... بے ڈھنگی سی گیند کو دیکھنے لگے۔ شیدے کو... بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ اُس نے اپنی گیند کو... کیا اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کہیں ایسا نا ہو... خراب گیند کو دیکھ کر کوئی میری گیند نہ مانگ... دوسرے بچے بھی گیند کو دیکھ کر کچھ بجھ سے... تھے۔ ابھی 2 منٹ پہلے والی خوشی اب ختم ... تھی۔ گلو نے سب بچوں کے چہروں کو غور... دیکھا اور بولا۔

"ارے بھئی اس میں سے تو شیدے کی... سے بھی زیادہ لائٹ نکلے گی' اسے چلنے تو... سب بیٹھ کر آنکھیں بند کرو۔" سب بچے بیٹھ... اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شیدا بھی خوشی... بیٹھ گیا۔ گلو بولا۔

"جب میں بولوں تب آنکھیں کھولنا ا... کوئی چوری چھپے دیکھے گا تو وہ اس کھیل سے... ہوگا۔ سب بچوں نے زور سے بھینچ کر آنکھیں... کر لیں۔ گلو نے سب بچوں کے درمیان د... رکھی اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا گلی... باہر نکلا۔ بلو اسکوٹر پر تیار کھڑا تھا۔ گلو کے بیٹھ... اُس نے گاڑی بھگا دی اور ہوا سے باتیں... لگا۔ پورے 1 منٹ کے بعد گلو نے اپنے ہاتھ... پکڑے ہوئے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ ایک... دار دھماکہ ہوا اور سارے بچوں کے جسم ہوا... گئے اور زمین تک واپس آتے آتے اُن ...

مختلف اعضاء میں تقسیم ہو چکے تھے۔ کچے پکے مکانوں کی بستی ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی۔ دھوئیں اور گرد و غبار کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھماکہ دور دور تک سنا گیا تھا۔ کئی مکانوں کی تو چھتیں اڑ گئی تھیں۔ ضعیف افراد بے ہوش ہو گئے تھے۔ کئی کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ جو ہوش میں تھے زندہ بچ گئے تھے۔ اُن کے دماغ ماؤف ہو گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ بس ایک قیامت کا منظر تھا۔

نصیبن بھی کہیں قریب کے علاقے میں تھی۔ وہاں بھی دھماکے کی آواز سنی گئی تھی۔ مگر اس کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ کس جگہ دھماکہ ہوا ہے اور یہ کہ اس کی دنیا اب مکمل طور پر برباد ہو گئی ہے۔ مانگ پہلے اجڑ گئی تھی اب گود بھی اجڑ گئی ہے۔ جب اس گھر میں ٹی وی کھولا گیا تو تب اُس بدنصیب کو پتا چلا کہ یہ تو اُس کی اپنی بستی میں قیامت آئی ہے۔ وہ تو فوراً روتی پیٹتی وہاں سے بھاگی۔ اُس کا شیدا اکیلا تھا' پتا نہیں کس گلی میں ہوا۔ شیدا کہاں ہوگا۔ یہ سوچتی روتی رہی اور گھر کی طرف بھاگتی رہی۔ اُس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ کیسے کیسے خیالات ذہن میں آنا جانا کر رہے تھے۔ وہ جلد از جلد اپنے بچے کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ گرتی پڑتی چلتی رہی۔ اُس گھر سے اِس کے گھر تک کا 10 من کا پیدل کا راستہ تھا۔ مگر آج لگ رہا تھا کہ اُس کا گھر دنیا کے دوسرے کنارے پر ہے اور فاصلہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہو رہا۔ اُس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے گھر قریب آ رہا تھا۔ اُس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا کہ جیسے کوئی اُس کے دل کو مٹھی میں جکڑ رہا ہو یا دل کے ٹکڑے کر رہا ہو۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ بم تو اس شہر میں صبح شام ہی پھٹ رہے تھے۔ وہ روز سنتی اور ٹی وی پر بھی دیکھتی تھی اور ان دہشت گردوں کو کوستی تھی۔ مگر آج بم کے پھٹنے کی خبر سن کر اس نے اپنی بیگم صاحبہ سے کوئی بات نہیں کی بس دل پکڑ کر گھر کی طرف چل دی۔

بم کے پھٹتے ہی پورا علاقہ گرد و غبار میں چھپ گیا تھا۔ سب لوگ حواس باختہ بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کسی کو نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ کسی بچے کے رونے چلانے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ صرف چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگوں نے اپنے اپنے بچوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ گھروں میں گلی میں ہر جگہ زخمیوں اور لاشوں کے ڈھیر تھے۔ دھماکے کی آواز سن کر سب لوگ اس طرف بھاگ کر آ رہے تھے۔ ایک ہجوم جمع ہو رہا تھا وہاں' افراتفری کا عالم تھا۔ گرد و غبار ذرا کم ہوا تو لوگوں کو ہر طرف خون اور انسانی اعضاء بکھرے نظر آئے۔ جو لوگ گھروں کے اندر تھے وہ گھر کی چھتوں اور اُن پر رکھے سامان کے گرنے سے زخمی ہوئے تھے۔ کسی کی حالت خراب تھی کسی کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں مگر جو بچے گلی میں تھے اُن میں نا تو کوئی زخمی تھا نہ کسی کی ہڈیاں ٹوٹی تھیں بلکہ وہ سب کے سب ختم ہو چکے تھے۔ صرف اُن کے اعضا پڑے تھے۔ کسی کا ہاتھ' کسی کی ٹانگ' کسی کا سر' کسی کا دھڑ' کوئی ایک بچہ بھی سلامت نہیں تھا۔ جو مائیں ہوش میں تھیں وہ اپنے اپنے لختِ جگر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آواز سن کر سارے مرد بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑے بھاگے آ رہے تھے۔ آدھے گھنٹے پہلے گلی میں کھیلنے والے بچے اب ٹکڑوں کی شکل میں پڑے تھے۔ مائیں غش کھا کھا کر گری جا رہی تھیں۔ کوئی اُن کو سنبھالنے والا نہ تھا۔ جس بچے کا باپ آ گیا تھا وہ زمین پر بکھرے بچوں کے ٹکڑوں کو حیرت

اورغم سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا بچہ کون سا ہے' کسی کو سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کس عضو کو اٹھائے' کس کو نہ اٹھائے۔ سب کی عقلیں حیران تھیں' آنکھوں میں آنسو لبوں پر آہیں' نہ کوئی منظر صاف نظر آرہا تھا نہ کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ پولیس اور ایمبولینس کے سائرن بج رہے تھے۔ انہوں نے اِدھر آنا شروع کر دیا تھا۔

نسیمن تیز تیز قدموں سے چلتی چلی آرہی تھی۔ اُس کا حلق خشک ہوتا جارہا تھا۔ اپنے شیدے کے خیال سے اُس کا دل اٹک اٹک کر چل رہا تھا۔ اُس کو تو ابھی اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ جب وہ اپنی گلی تک پہنچی تو صرف گرد و غبار اور دھوئیں نے اس کا استقبال کیا اور جیسے کہا ہو کہ لو تمہاری دنیا بھی اس دھوئیں میں غائب ہو چکی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی۔ اُسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ گلی میں کون کون موجود ہے۔ ہر طرف ایک چیخ و پکار ٹوٹے پھوٹے گھروں کا ملبہ' خون اور جسمانی اعضاء بکھرے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ' چھوٹے چھوٹے پاؤں' چھوٹے چھوٹے سر' اُس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

"ارے یہ میں کہاں آگئی۔ یہ میری گلی تو نہیں ہے۔ شاید میں غلط گلی میں گھس گئی۔ گرد و غبار اور دھوئیں کی وجہ سے شاید میں بھٹک گئی۔ یہاں تو میرا گھر کہیں نظر نہیں آرہا" وہ اپنا گھر ڈھونڈنے لگی۔ تب ہی اس کو دھوئیں میں سے ابراہیم اور قاسم آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ اس کے قریب آکر زور زور سے رونے لگے اور بولے۔

"بہن ہم سب لٹ گئے۔ ہمارے بچے چلے گئے۔ ہم لوگ تو دھماکے کی آواز سن کر ابھی آئے ہیں۔ ہائے ہمارے بچے......" وہ زور زور سے

رونے لگے۔ عورتیں الگ واویلا کر رہی
اُس کے گھر کی چار دیواری بھی ٹوٹ چکی تھ
اپنا گھر پہچان نہیں پا رہی تھی کہ یہ وہی گ
جہاں صبح وہ شیدے کو صحیح و سالم چھوڑ کر گئ
شیدے کا خیال آتے ہی اُس نے ہذیانی
میں شیدا شیدا چیخنا شروع کر دیا۔ لوگو
آوازیں اور سائرن کی آوازوں میں اُ
آواز کہیں دب کے رہ گئی۔ اُس کو نہ کوئی
آرہی تھی۔ نہ کچھ نظر آرہا تھا۔ بس و
شیدے کو دیکھنا اور اس کی آواز کو سننا چاہت
وہ پاگلوں کی طرح اپنے گھر کی طرف بھا
شیدے کو آوازیں دینے لگی۔ مگر شیدا اُس ک
کا نہ کوئی جواب دے رہا تھا نہ اُس کے پا
تھا۔ نا جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ محلے ک
اُس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روک
تھے اُس کو بتا رہے تھے کہ شیدا اب اُس کی آ
سن سکتا ہے نہ اُس کے بلانے پر آ سکتا ۔
ماں کو صرف سب کے ہونٹ ہلتے نظر آر
مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس ک
وہاں تھا مگر دماغ کہیں اور تھا۔ اُس کی
صرف اپنے شیدے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

وہ گرتی پڑتی آگے بڑھتی رہی۔ پولی
ایمبولینسیں بھی آچکی تھیں۔ رضا کار ٹیم ک
نے لاشوں کو ڈھونڈنا اور ٹکڑوں کو اٹھانا
کر دیا تھا۔ نسیمن کا پاؤں اچانک کسی چیز
وہ لڑکھڑا گئی اور وہیں گر گئی۔ صبح کا ناشتہ کیا
وہ گھر آکر شیدے کے ساتھ کھانا کھاتی تھی
اس دھماکے کی وجہ سے وہ کھانا پینا بھول چک
اُس کو یاد تھا تو صرف اپنا لخت جگر' وہ کمزور
صدمے کی وجہ سے گری تھی۔ اُسے صرف ا
اپنے بچے کو دیکھنا تھا۔ وہ جب زمین پر گری

کے پاؤں کے نیچے جو چیز آئی تھی وہ دبنے کی وجہ سے جگمگ ہونے لگی۔ اُس نے بے خیالی میں گرے ہوئے ہی اُس چمکنے والی چیز کو اٹھایا تو وہ اور زیادہ چمکنے لگی۔ مگر اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہاتھ بھی تھا جس کی بند مٹھی میں وہ گیند تھی۔ نصیبن زمین پر پڑے پڑے اُس چیز کو دیکھنے لگی۔ ایک چھوٹا سا کٹا ہوا ہاتھ جو کہنی تک تھا اور اُس کی مٹھی میں وہ جگمگاتی گیند' اُس کو کچھ کچھ یاد آنے لگا کہ اُس نے یہ چیز پہلے بھی کہیں دیکھی ہے اور بہت قریب سے دیکھی ہے۔ وہ اُس کٹ ہاتھ کو لیے کر زمین پر ہی بیٹھ گئی' اب اُس کو یاد آنے لگا کہ یہ تو شیدے کی گیند ہے۔ جو وہ ہر وقت اپنے ہاتھ میں پکڑے رہتا تھا۔ اُس نے آنکھیں جھپکا کر اُس کو دیکھا اور پھر تو جیسے وہ پاگل ہوگئی۔ یہ تو اُس کے شیدے کی گیند تھی اور یہ ننھا سا ہاتھ یہ کس کا ہے' کہیں یہ؟ نہیں وہ زور سے چیخی اور پھر چیخوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ شیدے کا کٹا ہوا ہاتھ تھا۔ اور اس میں وہی گیند دبی ہوئی تھی جو گلو نے اسے لاکر دی تھی۔ وہ ہاتھ کو کلیجے سے لگائی لگائی بین کرنے لگی۔ اُس کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ پھر بھی اُس نے سوچا کہ شاید شیدے کا صرف ہاتھ کٹا ہو اور وہ زندہ ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح زمین پر پڑے ٹکڑوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ شیدا شیدا کرتی اُس کی آواز بیٹھ گئی۔ مگر اس کو شیدا نہ ملا۔ نا جانے کس نے اُس بدنصیب کو کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ بالکل ہونق ہو رہی تھی۔ رضا کار زمین سے ننھے ٹکڑے اٹھا کر ایمبولینس میں رکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اُس سے وہ ہاتھ لے لے۔ کیونکہ اب اُس کے پاس صرف وہی ہاتھ ہی تو رہ گیا تھا۔ شیدا تو نا جانے کہاں تھا۔ وہ پوری گلی میں اِدھر سے اُدھر شیدا شیدا کرتی بھاگ رہی تھی۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اُس کو روک کر بتائیں کہ مت بھاگو۔ تمہارا شیدا اس دنیا سے جاچکا ہے۔ ہر ماں اپنے بچے کے لیے رو رہی تھی۔ پھر اس ماں کو کون تسلی دیتا' کون اس کے آنسو پونچھتا۔

پولیس والوں نے پورے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور سب سے پوچھ گچھ شروع کردی تھی۔ تب ہی کسی نے نصیبن کے ہاتھ سے شیدے کا کٹا ہوا ہاتھ لینے کی کوشش کی۔ اُس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور ہذیانی انداز میں اُس رضا کار کو دوہتر مارنے لگی۔

''میرے بچے کو مجھ سے چھین رہا ہے؟ تو ہو کون ہے میرے شیدے کو لے جانے والا'' و آدمی چپ چاپ اُس کی مار کھاتا رہا وہ اُس ما کے جذبات کو سمجھ رہا تھا۔ اُس نے آہستگی سے شیدے کے ہاتھ سے گیند نکال لی اور نصیبن کو د
۔

''لو پکڑلو۔'' نصیبن اپنے ہوش میں کہاں تھی۔ گیند جھپٹ لی۔ رضا کار نے آہستگی سے شیدے کا بازو لیا اور چل پڑا۔ وہ اپنی ویران آنکھوں سے اُس آدمی کو جاتا دیکھتی رہی۔ وہ رضا کار اپنے آنسو پونچھتا ہوا اُس بدنصیب عورت کو بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے بچے کی گیند کو سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ اور میرے شیدے کی گیند میرے شیدے کی گیند کی رٹ لگائے ہوئے تھی اس گلی سے تو سب ہی کے لخت جگر جاچکے تھے سب بے حال ہو رہے تھے۔ ایسے میں نصیبن کے آنسو کون پونچھتا' وہ چیختی رہی' ہر ماہ پکارتی رہی ہر باپ روتا رہا اور رضا کار اپنا کام کرتے رہے

نصیبن غم کے مارے بے حال ہوئی جارہی تھی اور آخر کار بے ہوش ہوکر گرگئی۔ نصیبن

دن میں کچھ کھایا تھا کہ نہیں۔ یا وہ بھوکا ہی اپنے اللہ کے پاس چلا گیا تھا۔ اب تو وہ ان سب باتون سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ نصیبن بالکل اُس جگہ پڑی تھی جہاں اُس کے شیدے کے خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے ہاتھ اور کپڑوں پر جو مٹی والا خون لگا ہوا ہے وہ اُس کا اپنا ہے۔ محلے والے اپنی دہائی دے رہے تھے۔ اُس کو کون دیکھتا۔ پولیس والوں نے اُسے گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا کیونکہ وہ اُن کے آنے جانے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔

یہ تو اس شہر میں روز کا کام بن گیا تھا۔ آج اس گلی میں بم پھٹا تھا کل کہیں اور پھٹا تھا۔ اگلے دن کسی اور جگہ پھٹے گا۔ اب پولیس اور رضا کار کس کس کے آنسو پونچھتے۔ کس کس کے غم میں شریک ہوں، کس کس سے ہمدردی کریں جیسے اور لوگ ویسے ہی یہ محلہ تھا۔

کب دھواں غائب ہوا۔ کب سورج غروب ہوا، کب لاشوں کے ٹکڑے اٹھا کر گلی صاف کی گئی۔ نصیبن کو کچھ خبر نہ تھی۔ پولیس نے سب کے بیان ریکارڈ کیے۔ کون کون کہاں کب سے رہتا ہے۔ کوئی نیا کرائے دار آیا تھا۔ کس نے نیا مکان خریدا ہے۔ کیسے لوگ تھے کب آئے اب کہاں ہیں؟ پولیس کی پوچھ گچھ سے سب کو گلو اور بلو کا خیال آیا کہ پورا محلہ جمع ہے۔ بس وہ دونوں غائب ہیں اور اب تو اُن کے آنے کا ٹائم بھی ہو چکا ہے پھر اتنا بڑا دھماکہ ہوا ہے۔ سب لوگ آ گئے پورے شہر کو خبر ہو گئی وہ دونوں کیوں نہیں آئے، سب نے ان دونوں کے بارے میں بتایا ابراہیم کو پولیس نے پکڑا اور کہا۔

''تم نے کن لوگوں کو اپنا مکان کرائے پر دیا

ہے؟ تم اُن کو کیسے اور کب سے جا
ابراہیم سیدھا سادھا غریب اور جاہل آ
اتنا سب کچھ تو اُس کو بھی پتا نہیں تھا۔ و
جا رہا تھا پولیس نے اس کو حراست میں لیا
پہلے ہی اتنے دھماکے ہو رہے تھے شہر میں
مجرم ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اب کم از کم اس
واردات کا کوئی سراغ تو ہاتھ آیا وہ ا
پکڑے ہوئے تھا۔ انہوں نے ابراہیم کا
وہ کمرہ دیکھا جو ان بھائیوں کو کرائے پ
تھا۔ وہاں تالا پڑا تھا۔ اس دھماکے میں ا
گھر بھی متاثر ہوا تھا۔ ابراہیم گھبرا گھبرا ک
جی صاب جی کرے جا رہا تھا۔ اُس کمر
توڑا گیا پولیس اندر گئی پورا محلہ پیچھے پیچھے
جا کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ دونوں بھا
اپنی شناخت کی تو ہر نشانی مٹا دی تھی۔ مگر
پوری طرح ظاہر کر کے گئے تھے کہ ہم نے
ہے۔ پورے کمرے میں بم بنانے کا ساما
ہوا تھا۔ کمرے میں دو پلنگ پڑے تھے اور
نیچے ڈبوں میں پورا سامان بھرا ہوا تھا۔ ا
تو بری حالت ہو رہی تھی۔ اپنے بچے کی مو
بھول گیا اب اُسے اپنی موت سامنے نظ
تھی۔ اب پولیس کو پکا یقین ہو گیا کہ وہ
کے ساتھی تھے۔ ابراہیم کی بیوی کا رو رو کر
ہو رہا تھا۔ وہ اپنی ممتا کو روئے کہ اپنے س
روئے۔ اس کا بھی ایک 8 سال کا بچہ اس
میں ہلاک ہوا تھا۔ اس پر تو دہرا صدمہ پڑ
پورا محلہ ایک دم سے ابراہیم کے خلاف ہو
برسوں کا ساتھ ایک دم سے ختم ہو گیا۔ کی
سب کے گھروں کے چراغ اس کے
داروں کی وجہ سے بجھ گئے تھے۔ اپنی او

لوگوں کی مدد کرنے والوں کو بھلا کون معاف کرسکتا ہے۔

سب اُس کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ اُس نے بغیر چھان بین کے ان دہشت گردوں کو اپنا گھر کیوں دیا۔ ابراہیم بہت بری طرح پھنس گیا تھا۔ پولیس کے بڑے افسران بھی آ گئے۔ انہوں نے ان دونوں کمروں میں موجود ہر چیز کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ پورے محلے کے لوگوں کے بیانات ریکارڈ کیے گئے۔ ان سے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پوچھی گئی۔ لوگوں کی مدد سے دونوں کے خاکے بنوائے گئے۔ رات گئے تک وہاں رش لگا رہا۔ ابراہیم کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ پورے محلے میں صفِ ماتم بچھی رہی۔

نصیبن کو قاسم کی بیوی اپنے گھر لے گئی تھی۔ پانی کے چھینٹے مار مار کر بڑی مشکل سے اُسے ہوش میں لایا گیا تھا۔ اس کا گھر اس کی گود سب اجڑ چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں تو کھل گئی تھیں۔ مگر دماغ ابھی تک سن تھا۔ وہ ویران اور خالی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آس پاس کھڑے لوگوں میں اپنے شیدے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ساری عورتیں بلک بلک کر اپنے بچوں کے لیے رو رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی تھوڑا سا رو لے تاکہ اُس کا دل بھی ہلکا ہو جائے۔ جو سانحہ ہونا تھا۔ وہ تو ہو چکا تھا جانے والوں کو اب کون لاسکتا تھا۔ اب ساری زندگی ان کی یاد کے سہارے جینا تھا۔ اور گھروں کا تو ایک ایک چراغ بجھا تھا باقی سلامت تھے۔ اُن کو ذرا ڈھارس تھی۔ مگر نصیبن کا تو تھا ہی ایک اور وہ بھی چلا گیا۔ شوہر تو پہلے ہی نہیں تھا اب یہ جینے کا سہارا بھی چلا گیا۔ نصیبن نے چاروں طرف دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے ہاتھ میں کچھ ہے۔ اُس نے بے

[illegible] گیند تھی جو اُس آدمی نے شیدے کے پنجے سے نکال کر اُس کو پکڑا دی تھی۔ جب اُس نے غور کیا تو اسے وہ سارے مناظر یاد آ گئے اور شیدے کا وہ کٹا ہوا بازو بھی' وہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔

کسی نے اُسے چپ نہیں کرایا۔ تا کہ وہ ذرا رو لے اور دل ہلکا ہو جائے۔ اُس کا دل اور دماغ اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ اس کے کلیجے کا ٹکڑا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ گیند کو دیوانہ وار چومتی رہی اور سینے سے لگاتی رہی جیسے وہ شیدا ہو۔ اب اُس کو یاد آ رہا تھا وہ سب کچھ جو صبح اُس کے ساتھ ہوا تھا۔ کیوں اُس کو رونا آ رہا تھا۔ کیوں دل بھرا جا رہا تھا۔ کیوں اُس نے شیدے کو میٹھا پراٹھا بنا کر دیا تھا۔ کیونکہ آج اُس کا یہ آخری ناشتا تھا۔ پتا نہیں اُس ناشتے کے بعد اُس نے کچھ کھایا بھی تھا کہ نہیں...... وہ اور رونے لگی۔ اب اُس کو شیدے کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

''ماں آج تو کام پر مت جا۔'' وہ بلکنے لگی کہ کاش وہ اپنے بچے کے کہنے پر آج گھر پر ہی رک جاتی اور اگر یہ حادثہ ہوتا تو وہ بھی اُس کے ساتھ ہی اپنے شوہر کے پاس چلی جاتی۔ اب تو وہ اکیلا ہی اپنے باپ کے پاس چلا گیا تھا۔ مگر اُس کو یہاں پر کس کے سہارے چھوڑ کر گیا تھا وہ روتی رہی پھر گیند کو دیکھنے لگی۔ اُسے شیدے کی آواز آئی۔

''ماں میری گیند سب سے اچھی ہے نا؟'' وہ دیوانہ وار اُسے چومتی رہی اور ہاں ہاں کرتی رہی۔ محلے کی عورتیں بھیگی آنکھوں کے ساتھ اُس بدنصیب کو دیکھتی رہیں۔

☆☆......☆☆

حنا اصغر

دُھند کے اس پار چلو
(پہلی قسط)

نفرت اور محبت میں اُلجھے نوجوان
کا قصہ جو آپ کو اپنی گرفت میں لے لے گا......

دسمبر کی ٹھٹھرا دینے والی رات تھی۔ اندرون بازار میں لوگوں کی گہما گہمی مفقود تھی اس کو ایسا لگنے لگا اس کے جسم سے جان نکل جائے گی۔ سردی اس کی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اس کے جسم کے ساتھ چپکا ایک اور وجود سردی کے تھپیڑوں سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اس کی جیکٹ میں منہ لپیٹنے پر مجبور تھا۔ وہ دونوں کب سے یہاں کھڑے ہو کر اپنے گروپ کا انتظار کر رہے تھے اندرون بازار کی گلیوں سے ناگ کی طرح بل کھاتے دو شرابی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اٹھلاتے گنگناتے ہوئے ان کے نزدیک سے گزرے ان دونوں کی سانسیں خوف سے بند ہونے لگیں اور دل پسلیوں کے پنجرے کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے۔ یہاں...... یہاں کوئی ہے...... کوئی کھڑا ہے یہاں۔ دیکھو ذرا ایک شرابی نے ان کے قریب اشارہ کیا۔ ان دونوں نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پچھلے دنوں دو نشئی ان کے

گروپ کے ایک لڑکے کو پکڑ کر لے گئے
روز بعد ایک گٹر میں اس کی لاش ملی تھی
گروپ کے لڑکوں میں خوف و ہراس پھیل گ

ن ن...... نہیں۔ کوئی نہیں ہے تمہارا وا
اس نے کہا۔

تت...... تم ہوش میں نہیں ہو۔

یار میں ہوش میں ہوں۔ پہلا نشئی
دوسرے نے اس کے جواب میں نفی میں سر

ہوش میں ہوں چاہو تو ثبوت لے
نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کے سامنے آ کھڑ

ہوش میں ہو تو سامنے والی دیوار پر ہا
جلدی کرو۔ پہلے والے کے کہنے پر وہ دو ق
بڑھا اور لڑکھڑا کر گر گیا پھر بولا مجھے سنبھالو
ہوش میں نہیں ہوں۔

دونوں کے جانے کے بعد دم ساد
کی جان میں جان آئی۔ اور ساتھ ہی مختلف
آوازوں نے ان کو یہ یقین دہانی کرادی

روپ شہر کے مختلف حصوں سے ہوتا ہوا اپنے سوس ٹھکانے پر آ گیا ہے۔وہ دونوں سرعت سے ے دوسرے سے الگ ہوئے اور چلتے ہوئے اس روپ میں شامل ہو گئے۔

آج بہت دیر ہو گئی لیکن افسوس ہمیں زیادہ ے نہیں ملے اور مجھے لگتا ہے آج کا کا ہمیں نہیں وڑے گا۔ ایک بچے نے اپنا سکوں سے بھرا شکول دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ کے آج کی اجرت کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ں دونوں کے قدم سست پڑنے لگے وہ دونوں شام ت بجے کے قریب ہی یہاں آ کر کھڑے ہوئے ے وجہ ان کے جسم پر وہ واحد سوٹ اور پیوندزدہ جیکٹ یں جو دسمبر کی اس سردی سے ان کو محفوظ رکھنے میں کافی تھیں۔اب کیا ہوگا پاشا؟ سلمان کی منمناتی واز پاشا کے کانوں سے ٹکرائی۔ابھی کل ہی تو کا کا نے سلمان کو مارا تھا جس کی وجہ سے اس کو بخار ہو گیا تھا تم فکر نہ کرو میں دعا کروں گا آج کا کا کچھ نہ کہے اور ہمیں روٹی بھی دے دے۔اس نے اپنے بازو کا گھیرا سلمان کے گرد تنگ کیا۔ ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی پاشا کو سلمان اپنے چھوٹے بھائی کی طرح لگتا اور وہ اس کی حفاظت ایک بڑے بھائی کی طرح کرنے لگا۔ اس کی لاکھ تسلی و تشفی کے باوجود بھی سلمان کا دل انجانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔وہ جانتا تھا کہ اگر کا کا نشے میں دھت ہوا تو وہ زیادہ جارحانہ برتاؤ کرے گا اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو نشہ نہ کرے۔ سب لڑکے کہتے تھے کہ نشے کے بعد اس کے اندر کا حیوان جاگ جاتا ہے پچھلے ہفتے عزیز کو اپنی بیلٹ سے مار مار کر اس کی کھال تک چھیل دی تھی۔عزیز کی حالت دیکھ کر گروہ کے بچے پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئے تھے خوف و ہراس



اورمحتاط انداز میں بچوں کو لوگوں کے قدموں میں گرنے اور ان سے ریزگاری نکلوانے میں معاون ثابت ہوتا اور وہ دونوں بھی لوگوں کے پیر پکڑ لیتے اور بھیک لینے میں کامیاب بھی رہتے لیکن سردی کی اچانک آمد نے ان کو ہلنے جلنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا اوپر سے صبح کے دو پاپے اور پتلی چائے سارا دن ان کو سڑکوں پر نہیں دوڑا سکی وہ لوگ مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئے۔ سب آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چلنے لگے جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مرے مرے قدموں سے اس قطار کے آخری دو نفوس تھے جن کے قدموں میں جان نہیں رہی تھی۔ سیڑھیاں نیچے کی جانب جاتی تھیں اور ان کا اختتام تہہ خانے پر ہوتا تھا تہہ خانے میں تین بڑے ہال تھے جن میں رات گئے بسکٹ پیک کیے جاتے تھے چھوٹے چھوٹے اسٹور بنائے گئے تھے جہاں لڑکیوں کے لیے بسکٹ پیک کرنا اور صابن بنانا جیسے کام مخصوص کر دیے گئے تھے اس ٹائم لڑکیوں کی چھٹی ہو جایا کرتی تھی لڑکیوں کی دوسرے ہال میں خواتین کے ساتھ رہائش رکھی گئی تھی جب کہ ان دو ہالز میں لڑکے بھی رہتے تھے۔ وہ سب قطار بنا چکے تھے کاکا اور اس کا پارٹنر آغا آ چکے تھے آغا کرسی پر بیٹھا اپنے موبائل سے کھیل رہا تھا جبکہ کاکا ہاتھ میں رجسٹر لیے ایک ایک لڑکے کو بلاتا۔ مختلف لڑکوں کو بلانے اور ان کو بے رحمانہ طریقے سے مارنے کے بعد باری سلمان کی آئی۔ سلمان مرے مرے قدموں سے کاکا کے سامنے کھڑا ہوا۔ اس کی پشت کو بغور دیکھتے ہوئے پاشا کا دل بہت بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ پیسے ڈالو۔ کاکا نے ہارڈ بورڈ کی ٹرے کے سامنے اشارہ کیا جو اس کے سامنے پڑی تھی۔ سلمان نے ہاتھ میں دبے ہوئے سکے کپکپاتے ہاتھوں سے

ٹرے میں ڈال دیے۔ ان کو دیکھ کر کاکا ا
اچھل ہی پڑا۔ آج پھر اتنے سے پیسے ل
اتنے ہی تھے۔ کیا تیرا کام میں دل نہیں لگ
بالوں سے گھسیٹ کر اپنے سامنے کرتے
معاف...... معاف کرو...... کاکا...... سلم
معاف کر دو کے بچے۔ مجھے بے وقوف ب
باقی پیسے کہاں ہیں۔ ضرور تو پیسے کھا جاتا
...... کاکا نے اس کے دائیں گال پر تھ
اوندھے منہ جا گرا۔ اب کاکا لاتوں سے
رحمانہ طریقے سے مارنے لگا اور وہیں
جواب دے گیا۔ وہ بھاگ کر سلمان ا
درمیان آ کھڑا ہوا۔ کاکا۔ اس کو جانے د
بخار ہے...... کافی دنوں سے...... معاف ک
چلاتے ہوئے بولا۔ کاکا کی مسلسل چلتی
لمحہ کو رکیں۔ اس نے انتہائی اچنبھے
جانب دیکھا جس کی آنکھوں میں واضح طو
نظر آ رہی تھی۔ کاکا کا خون اس کی آنکھو
بغاوت کی تحریر کو دیکھ کر کھولنے لگا۔ اس
سے پکڑ کر سلمان کو دور کیا اور ایک بار پھ
پیٹنے لگا۔ پاشا نے ادھر ادھر دیکھا۔ فاصلے
ڈنڈا اٹھاتے ہوئے وہ خوف کی ہر حد پار ک
اس نے وہ ڈنڈا اٹھایا اور پوری قوت سے ک
مارا جو کہ عین اس کے سر پر لگا۔ اس کے سر
فوارہ بہہ نکلا "تم...... تم......" وہ جنونی اند
کی جانب بڑھا۔ دور بیٹھے آغا نے کاکا کو
کر روکا۔ کاکا نے انتہائی تحیر آمیز نگاہوں
دیکھا جس نے کمال اطمینان سے میز پ
اٹھ کر وہ سلمان کے قریب آیا۔ سلمان خ
کانپنے لگا اس کا زخموں سے رنگا ہوا چہرہ اور
سانسیں وہاں موجود بچوں کے چہروں کو م
تھے۔ ہر بچہ اپنے کشکول میں پڑے سکے

کچھ تو ایسے تھے جو جیبوں میں اڑسے گئے سکے کشکول میں منتقل کرنے کی تگ ودو میں لگ چکے تھے آغا سر دائیں بائیں ہلاتا سلمان کو گھسیٹ کر سامنے والے ہال میں لے جانے لگا۔ سامنے والا ہال انتہائی باغی بچوں کو سبق سکھانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ہال کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ پاشا بھاگتا ہوا ہال کے دروازے تک پہنچا۔ آغا ...... آغا ...... یہ بیمار ہے ...... وہ پوری قوت سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اندر سے آتی سلمان کی آواز نے اسے متوحش کر دیا آغا...... آغا...... دروازہ کھولو...... وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹتے ہوئے بولا ...... کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل چکا تھا۔ سامنے خون میں لت پت تڑپتا ہوا سلمان پاشا کی نگاہوں میں آ گیا۔ بچے ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ سلمان کی موجودہ حالت نے سب کے اوسان خطا کر دیئے۔ پاشا سے سلمان کی تکلیف۔ تڑپ اس کا خون میں لت پت جسم دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ آغا کے مقابل آ کھڑا ہوا اور پوری قوت سے اس کو دھکا دے کر بولا یہ کیا کیا ہے تم نے وہ مرجائے گا۔ اس کے دھکے میں بھی اتنی جان تھی کہ آغا اپنی جگہ سے سرکا تھا۔ البتہ حیران ضرور ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے پستول نکالی اور سلمان کی جانب تان لی۔ آج کا پڑھایا ہوا سبق اس ہال میں صدیوں تک یاد کیا جاتا رہے گا آغا کی گھمبیر بھاری آواز نے ہال میں سکتہ طاری کر دیا تھا۔ گولی کی آواز آئی اور اس کے بعد بچوں کی آوازوں نے سب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلا دیا۔ یہ اندھیرا سلمان اور پاشا کی زندگی میں چھا سا گیا تھا۔

☆......☆

اس کی آنکھ کسی مخملی گود میں کھلی۔ اس کو ایسا لگا جیسے نرم گرم وجود کی حدت نے اس کے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہو۔ کافی دیر تک وہ یونہی لیٹا رہا...... تو گویا مرنے کے بعد وہ جنت میں پہنچا دیا گیا ہے ...... سفید مخملی چادروں پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔ ہوائیں اس کے جسم کو یوں چھو رہی تھیں جیسے وہ سمندر کی لہروں کے دوش پر ہو۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اس کو لگا وہ اٹھ نہیں پائے گا۔ لیکن حیران کن بات کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سفید سفید مخملی پر براق کے نہیں بلکہ وہ انتہائی عالی شان بستر پر تھا۔ وہ بستر سے اترا اس کی ٹانگ سے خون نکل رہا تھا۔ اس نے اپنی دائیں ٹانگ پر غور کیا جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی اور دونوں ٹانگوں پر جگہ جگہ جلائے جانے اور مار پیٹ کے نشانات بدرجہ اتم موجود تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں موجود بہت بڑی پینٹنگ کے سامنے آ رکا کچھ دیر اس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد اس کو احساس ہوا کہ اس پینٹنگ میں خود سے لپٹائے بچے کی ماں کے پاؤں نیلے نیلے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اس نے بہت باریک بینی سے اس پانی کو دیکھا تو احساس ہوا اس پانی ہلکی ہلکی کالے رنگ کی بیڑیاں سی نظر آنے لگی ہیں جس نے اس ماں کے پاؤں جکڑے ہوئے تھے اس نے دوبارہ اس ماں کے چہرے پر غور کیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اب کی بار اس نے اسی باریک بینی سے اس بچے کی جانب دیکھا تو احساس ہوا ماں بچے کو اٹھائے ہوئے تو تھی لیکن اس ماں کا ایک ہاتھ اس بچے کے پیٹ میں گھپے چاقو کو نکال رہا تھا۔ وہ جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا تنفس درہم برہم ہو گیا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بیڈ کے دائیں جانب فریج رکھا ہوا تھا اور اس فریج کے بالکل قریب باہر کی جانب کھلنے والا راستہ تھا۔ جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر کو لپکا اور حیران رہ گیا سامنے کا نظارہ بلاشبہ خوش کن اور حیران کن تھا وہ بہت بلندی پر

تھا اتنی بلندی پر کہ اس بلند و بالا عمارت پر کھڑے ہو کر پورے شہر کو باآسانی دیکھا جا سکتا تھا شاید یہ کوئی اور جگہ ہے اس نے لوہے کی گرل کو چھوتے ہوئے قیاس کیا۔ کیا مرنے کے بعد جنت بڑے شہروں جیسی ہے۔ اس نے ایک بار پھر ان عمارتوں کی جانب دیکھا وہ چلتا ہوا واپس کمرے میں آ گیا اور بیڈ پر جا بیٹھا۔ میں کہاں ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے؟ یقیناً یہ جنت نہیں ہے میں زندہ ہوں جہاں جنت جیسا کچھ نہیں ہے اور اگر میں زندہ ہوں تو سلمان کا کیا ہوا اور میں کس جگہ پر ہوں اور مجھے یہاں کون لایا ہے۔ لاتعداد اندیشے تھے جنہوں نے اس کی کچھ دیر پہلے والی خوشی کو نگل لیا۔ اب پریشانی تشویش اور اضطراب اس کی انگلیاں تھام چکی تھیں۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا۔ لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا آدمی اس کے قریب آیا۔ ویلکم سلطان پاشا نئی زندگی مبارک ہو۔ دوسری آواز نے پاشا کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ تت...... تم...... تم کون ہو اور میں ...... میں کہاں ہوں؟ پاشا بغیر ڈرے اور مرعوب ہوئے بولا تم جنت میں ہو سلطان پاشا ہر ظلم، ہر زیادتی سے دور جنت میں جہاں خوشیاں ہی تمہاری منتظر ہیں بس بانہیں پھیلاؤ اور ان کو خوش آمدید کہو۔ وہ اس کے سامنے آ کر بولا "مم...... مجھے ...... واپس جانے دو۔ مجھے سلمان کے پاس جانا ہے۔ مجھے جانے دو۔ پاشا کو یاد آنے لگا کہ اس رات ایک پستول بالکل اس کے قریب پڑی تھی۔ اس کے خون میں لتھڑے پاؤں کے قریب۔ پاشا کے پاس وقت کم تھا اور اس کا ذہن متحرک تھا اس نے قلابازی لگانے کے انداز میں اس پستول کو اٹھایا اور اندھا دھند کئی فائر آغا پر کر دیے۔ آغا وہیں ڈھیر ہو گیا اور خود پاشا بھی بے ہوش ہو گیا۔ یقیناً آغا مر چکا تھا لیکن سلیمان...... سلمان کا کیا ہوا شاید وہ زندہ ہو۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کھلے دروازے سے باہر نکل گیا لیکن دروازے کے باہر کھ
نے اس کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اندر
جبکہ وہ آدمی بیٹھا اطمینان سے چائے پی ر
کے قریب ملازم لوازمات کی ٹرالی لیے کھڑا
واپس اندر لایا جا چکا تھا اس نے حیرت
میں رکھے لوازمات کو دیکھا دن میں دو بار
کو پتلی دال کے ساتھ تنور کی ایک روٹی
سب چیزیں اس کے لیے نئی تھیں۔ ان کی
کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں ا
کر رہ گئیں۔

"کک...... کیا میں یہ کھا سکتا ہوں
نے زبان لبوں پر پھیری تو احساس ہوا کہ و
دنوں سے بھوکا ہے۔ ہاں کھاؤ۔ اس آدمی
اس کے آگے کھسکائی اور پاشا کھانے ٹو
قالین پر بیٹھ کر اس نے ایک بڑی فلیٹ پلی
اور اس میں دھڑا دھڑ چیزیں ڈالنے لگا۔
ایک خوف اور ڈر بھی تھا کہ یہ امیر آدمی اس
سب کچھ چھین نہ لے۔ وہ ان نعمتوں سے م
جائے۔ چائے' چاول' دال مختلف قسم کی
گوشت کی ڈش وہ مکس کر کے ہاتھوں سے ک
تو صوفے پر بیٹھا آدمی اس کو نہیں دیکھ رہا تھ
قریب کھڑے آدمی کو ہدایات دے رہا تھا لی
کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کن اکھیوں سے اس
رہا ہے اور ابھی وہ اس سے سب کچھ چھین
اندھا دھند کھانے کی وجہ سے اس کے پیٹ
پڑ گئے۔ باتیں کرنے کے درمیان وہ ایک
جوس دو پاشا کو۔ اس نے ہدایت دی۔ آ
سرعت سے جگ میں سے جوس گلاس میں بھ
وہ گلاس اس کے قریب لانے ہی والا تھا
جھپٹنے کے انداز میں اپنے کھانے میں لتھڑے
ہاتھوں سے گلاس تھاما اور غٹا غٹ پی گیا۔ اور

ہوں کیا؟اس نے بھرے جگ کو لالچی نگاہوں سے دیکھا۔آدمی کے ہاں کہنے پر اس نے جگ اٹھایا اور اس کو منہ سے لگالیا لیکن ٹھنڈا اور میٹھا ہونے کی وجہ سے اس کا پیٹ جلدی بھر گیا اس لیے جگ واپس رکھ دیا اور پلیٹ بھی ٹرالی میں رکھ دی اس نے اپنی شرٹ سے اپنا منہ پونچھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔اتنا زیادہ کھانے کی وجہ سے اس کو نیند کے جھونکے آنے لگے تھے۔ اس آدمی کے کہنے پر وہ سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ نوکر ٹرالی گھسیٹ کر جا چکا تھا۔

اب کمرے میں وہ آدمی اور پاشا موجود تھے ......میں واپس جانا چاہتا ہوں وہ اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا......تم واپس نہیں جا سکتے پاشا تم نے اپنے باس کو اپنے مالک کو قتل کیا ہے یہاں سے بچ کر جاؤ گے تو کاکا تمہیں جیل میں ڈلوا دے گا اگر تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن یاد رکھو یہاں سے نکلنے کے بعد تمہاری اگلی منزل جیل ہوگی۔

نہیں......اس کو مارنے میں میرا ہاتھ نہیں تھا اس نے سلمان کو گولی مارنا چاہی سلمان کے بالکل قریب پستول تھا جو میں نے اٹھایا اور یونہی بے سوچے سمجھے چلا دیا میں نہیں جانتا تھا کہ اس میں گولیاں ہیں یہ صرف ایک حادثہ تھا اس کی بات کے اختتام پر وہ زور سے ہنسا۔سلمان یہ تمہاری غلطی نہیں تھی اصل غلطی تمہارے باپ کی ہے جس نے تمہیں ایک بیکار چیز کی طرح زمانے کی ٹھوکروں میں پھینک دیا جہاں سلطان تمہارا باپ فہد انڈسٹریز کا چیئرمین......وہی ہے تمہارا باپ۔جس نے اپنی سیکریٹری اور تمہاری ماں فہمیدہ سے شادی کے وعدے کیے اور جب تم پیدا ہوئے تو تم دونوں کو پھینک دیا۔تمہاری ماں اس کے خلاف کارروائی کرنا چاہتی تھی اس کو لگا کہ یہ عورت اس کے لیے خطرہ ثابت ہوگی اس نے اس کو مروا دیا اور تمہیں پانچ سالوں تک دنیا کی ٹھوکروں میں رکھا۔ سلطان وہ بہت ظالم اور بے حس شخص ہے۔فہد شاہ ہی تمہارا باپ ہے میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں چاہو تو واپس چلے جاؤ اپنی زندگی میں اور اگر چاہو تو میرا دوسرا بازو بن جاؤ۔تمہیں سب ملے گا جو تم چاہو گے میں تمہیں ایک شہزادے کی سی زندگی دوں گا۔ تمہیں ہر سہولت ملے گی میں تمہیں پتھر سمجھ کر کبھی نہیں پھینکوں گا۔بلکہ ہیرے کی طرح تمہاری تراش خراش کروں گا۔تمہیں ایک قابل انسان بناؤں گا۔ تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے تم تیار ہو کر نیچے آ جانا۔ یا پھر یہ جگہ چھوڑ کر چلے جانا تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔وہ کہہ کر چلا گیا جبکہ سلطان پاشا وال سے نظر آنے والے اپنے عکس کو دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆

سلطان پاشا کی زندگی کا نیا آغاز ہوا یا پھر کہنا چاہیے اس کا نیا جنم شروع ہوا پاشا سے سلطان پاشا۔ اس کا داخلہ شہر کے مہنگے ترین اسکول میں کرایا گیا۔ اس کو سب سہولتیں مہیا کی گئیں جو کہ ہر امیر آدمی کے بچے کو ملتی ہیں۔انگلینڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد اسے جہانگیر ڈار عرف جے ڈی فہد انڈسٹریز جوائن کی اس نے اپنی زندگی کے پانچ سال اس کمپنی کو دیے۔محنت' اپنی لگن اور ثابت قدمی سے وہ جنرل منیجر کی سیٹ سنبھال لی اور اس میں جے ڈی کی ہدایت کا بہت عمل دخل تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا اور وہ اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا کچھ فائل ورک دیکھ رہا تھا۔جے ڈی کا فون آیا مصروفیت کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں۔کچھ دیر بعد اس کی نظر موبائل پر پڑی۔جے ڈی کی مس کال آئی ہوئی تھی اس نے کال بیک کی۔کہیں بزی تھے سلطان جے ڈی کچھ فائل ورک دیکھ رہا تھا۔اس نے مختصر جواب دیا۔ڈی جے ہنکارا بھرا اور بولے سلطان این ٹی وی کھولو فہد کا انٹرویو آ رہا ہے۔سلطان۔

سینٹرل ٹیبل پر پڑا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کیا این ٹی وی اون کرنے کے ساتھ ہی وہ میز سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔

آپ اپنی کمپنی کے ساتھ ہی ریسٹورنٹ اوپن رہے ہیں اس میں کتنی صداقت ہے؟ اینکر کے سوال پر وہ بے اختیار مسکرائے۔ جی بالکل ریسٹورنٹ کا 99% کام مکمل ہو چکا ہے۔ انشاءاللہ اس منتھ کے آخر تک ہم اس کا افتتاح کریں گے۔ فہد انڈسٹریز کو کامیابی سے چلانے کے بعد ریسٹورنٹ کا آئیڈیا کارگر ثابت ہوگا۔ وہ مسکرا کر بولے ہمارا ریسٹورنٹ اس شہر کا سب سے بڑا او میگا ریسٹورنٹ ہے ہم اس میں کتنی کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ آپ لوگ کریں گے۔ تو کیا آپ کی بیٹی بھی اس کا حصہ بنے گی۔

انشاءاللہ میری موجودگی میں وہ مجھے جوائن کرے گی بہت جلد۔ اس نے غصے میں ٹی وی بند کر دیا۔ جھنجلاہٹ اندرونی کھولن سے سلطان کا برا حال تھ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ٹی وی ہی توڑ دے۔ توڑ بھی بھی دیتا اگر جے ڈی کا آدمی اس کے لیے فائل نہ لے کر آ تا۔ اس کا میں کیا کروں۔ اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ جے ڈی نے کہا ہے اس کو پڑھ لو۔

ٹھیک ہے اس نے بے دلی سے فائل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اس کے جاتے ہی سلطان پاشا نے دروازہ بند کیا۔ وہ اسی انداز میں کچن میں آیا کچھ دیر بے خیالی میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ فہد انڈسٹریز کے سامنے آفیسرز کالونی تھی جہاں ورکرز کو رہائش فراہم کی گئی تھی لیکن فہد شاہ اور جے ڈی دائیں جانب بنگلوز میں رہتے تھے اپنے اپارٹمنٹ کی ٹیرس پر کھڑے ہو کر سلطان پاشا فہد شاہ اور جے ڈی کے گھر کے لان تک با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ جے ڈی نے خاص طور پر اس کو یہ اپارٹمنٹ

دلوایا تھا تاکہ یہاں رہ کر وہ با آسانی سب
سکے۔ سامنے نظر آنے والے فہد شاہ کے
لائٹس آن تھیں یقیناً وہ اپنے پورشن میں مو
ماضی کے ایام فلم کی طرح اس کی نظروں
گھومنے لگے اس کو وہ کالی راتیں یاد آ
اس نے سڑکوں پر گزاری تھیں باپ
ہوئے بھی وہ یتیموں کی سی زندگی گزار
اور اس کی وجہ وہی انسان تھا جس سے سل
نے ساری زندگی جی بھر کر نفرت کی۔ اس
ہوتے ہوئے بھی سلطان پاشا کو کبھی اپ
شفقت اور محبت کی بو نہیں آئی تھی بچپن میں
مار پھٹکار نے اس کو وقت سے پہلے بڑا اور
دیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا صرف ایک ہی
اور وہ فہد گروپ سے فہد شاہ کو باہر کرنا ج
محنت اور چالبازی سے 50 فیصد شیئرز کا ح
لیکن باقی کے شیئرز حاصل کرنا ابھی باقی ت
موبائل بج رہا تھا جبکہ وہ کھولتے ہوئے
ٹوٹے بکھرے اعصاب کو مجتمع کرنے کی کوش
مصروف تھا بیل مسلسل بج رہی تھی وہ جھنجلا
اپنی ٹیبل کے قریب آیا اسکرین پر جے ڈی ک
رہا تھا۔ ''ہیلو...... کیسے ہو سلطان؟''

''میں ٹھیک ہوں جے ڈی نے
الامکان اپنی آواز کو نارمل کرنے کی سعی کی
پریشان لگ رہے ہو سلطان پاشا کیا با
نہیں کچھ خاص نہیں یونہی آپ کو لگ رہا ہے
ایسا کرو مجھ سے ملنے کمپنی کے پارک میں آ
بات ہوگی' وہ کہہ کر فون بند کر چکے تھے۔ سل
وقت کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن جے ڈی
کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اسے ناگوا
ایک نگاہ سیل پر ڈالی اپنے اپارٹمنٹ کی
اٹھائیں اور باہر نکلا اب سیل پر زرش کی کال

ں۔سلطان کو یوں لگا جیسے اس لوفت اور حبس بھرے ول میں تازگی کی لہر دوڑ گئی ہو سلطان نے سرعت ے سیل آن کی۔اس کے مخصوص سلام کے انداز پر نقریباً چلایا زرش آفتاب اوہ گارڈ تم ہی ہو ناں تنے عرصے بعد تمہیں میری یاد آئی۔اس کی بیتابی پر قہقہہ بار ہو کر بولی ویٹ ویٹ مسٹر سلطان پاشا یہ نہ ہو ں حیرانگی سے ہی اس دنیا سے کوچ کر جاؤں ے گروپ کا سب سے سڑیل اور بورنگ اور کچر بندہ میرے لیے اتنے پیارے پیارے الفاظ ل رہا ہے۔بلیومی یار مجھے یقین ہی نہیں آرہا کہ تم م سے کنٹیکٹ کرو گی ورنہ تو میں یہی سوچتا تھا کہ میں کہاں یاد رہا ہوں گا محترمہ زرش صاحبہ کو۔بس بس رہنے میں روز ہی یاد کرتی ہوں تمہیں بس کچھ مصروفیات ھ گئی ہیں اس لیے رابطہ نہیں کر سکی۔کہیں شادی دی تو نہیں کرلی محترمہ نے۔وہ چھیڑتے ہوئے لا۔

تمہارے انکار کے بعد ایسا دل ٹوٹا شادی کا ھر سوچا ہی نہیں۔اس کے الفاظ کے پیچھے جو واقعہ چھپا ہوا تھا اس کا تذکرہ دوبارہ زرش کے منہ سے سن کر سلطان پاشا چپ ہو گیا یہ حقیقت تھی کہ اس کو رش پسند تھی وہ ایک مکمل، زندگی سے بھرپور لڑکی تھی یکن سلطان پاشا کی منزل بہت آگے کی تھی وہ خود کو سی قسم کے ریلیشن میں باندھنا نہیں چاہتا تھا۔ ونیورسٹی کی فیورل پارٹی والے دن زرش پھولوں کا بکے لے کر اس کے پاس آئی اور اس کو پرپوز کر دیا سلطان حق دق اس کو دیکھے گیا پھر سر جھکا کر بولا۔ سوری زرش میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔اس کے صفاچٹ انکار پر زرش نے خفت زدہ چہرے سے یک لمحے کو اس کی جانب دیکھا اور بوکے وہیں پھینک کر اسٹوڈنٹس کا ہجوم چیرتی ہوئی غائب ہو گئی کتنے دن وہ غائب رہی۔سلطان پاشا اگرچہ اپنی حرکت پر پشیمان نہیں تھا لیکن جب جب زرش اس کے سامنے آتی اس کو نامحسوس سی شرمندگی گھیر لیتی۔ یہ زرش کی اعلیٰ ظرفی ہی تھی کہ اسے اس کے بعد دوبارہ نہ تو اس واقعے کا ذکر کیا تھا اور نہ ہی اپنے رویے سے باور کرایا بلکہ زرش کا اس کے ساتھ برتاؤ پہلے سے بھی اچھا اور احترام لیے ہوئے تھا۔

کیا ہوا کہاں کھو گئے؟ اس کی آواز ابھری۔ وہ چونک گیا۔بولا کیا ہم کل مل سکتے ہیں۔ارے واہ یہ بات تو میں کہنا چاہتی تھی بالکل جہاں تم کہو...... سلطان نے اس کو جگہ بتا کر فون بند کر دیا۔کافی دنوں کے بعد سلطان خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ایک خوشگواریت نے اس کے چاروں طرف حصار سا باندھ لیا تھا اس کے چہرے پر شگفتگی سی چھانے لگی وہ سرعت سے جے ڈی کے پاس پہنچا وہ پہلے سے ہی پارک میں موجود تھے۔وہ فون پر مصروف تھے اس کو آتا دیکھ کر انہوں نے فون بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوئے۔واک کرتے ہیں سلطان۔انہوں نے سامنے کی جانب اشارہ کیا اور اس کے ساتھ چلنے لگے۔جانتے ہو میرا بچپن سے ایک خواب تھا کہ بڑا آدمی بنوں......ایک دیہات سے بھاگا ہوا لڑکا جس کی آنکھوں میں خواب ہی خواب تھے ان خوابوں کی زد میں میری ٹانگیں بھی آگئیں لیکن میرے حوصلے اور ہمت فوت نہیں ہوئے۔میری نیندیں اڑ گئیں لیکن دماغ جاگ رہا تھا میں ایک بتانی کی نوکری سے شروعات کیں ڈھابے پر روٹیاں لگانے سے لے کر لوگوں کے جوتے تک پالش کیے کوئی سوچ سکتا تھا ایک دیہاتی بھگوڑا فہد گروپ انڈسٹریز کا آدھا مالک بن جائے گا۔بس سلطان اس تگ و دو میں۔میں نے اپنے رشتے کھو دیے میرا باپ چل بسا۔ماں کی موت نے مجھے نہیں توڑا جتنا درد مجھے میرے بڑے بھائی نے دیا۔اس نے مجھ سے تعلقات ختم کر لیے

وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے سلطان کئی فیکٹریوں کا
مالک ہے اس مقام پر پہنچنے کے لیے میں نے بہت
محنت کی ہے میں نہیں چاہتا اگلے کے مراحل میں
تمہاری ذرا سی بے احتیاطی اور جلد بازی مجھ سے یہ
قریب آتا خواب چھین لے وہ اس کے مقابل آ کر
بولے۔ سلطان تم میرا دایاں بازو ہو۔ تم پر آنکھیں
بند کر کے یقین ہے میں چاہتا ہوں تم انتہائی تحمل اور
بردباری سے تمام معاملات کو ہینڈل کرو۔ اس طرح
سے جذبات ہو جاؤ گے تو آگے مشکل ہو جائے گی
تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔ جو فائل میں
نے تمہیں بھجوائی ہے اس میں فہد گروپ کے مستقبل
میں کیے جانے والے سب کنٹریکٹ کی تفصیل موجود
ہے۔ فہد ریسٹورنٹ اپنی لے پالک بیٹی کے نام پر
بنا رہا ہے حیرت کی بات ہے ماں اس کی سگی اولاد اس
کی کمپنی میں ملازم ہے جبکہ اس کی بیوی کی بیٹی اس
کے کاروبار کی مالک بنے گی تمہیں نہیں لگتا کہ یہ غلط
ہے ناانصافی ہے تمہارے ساتھ جے ڈی کے کہنے پر
اس نے ایک لمحے کو ان کی جانب دیکھا اور پھر سے
اپنی نظریں غیر مرئی نقطے کی جانب مرکوز کر لیں۔
جے ڈی کو ہمیشہ سے اس بات کا شکوہ رہا تھا کہ
سلطان اپنا آپ عیاں نہیں کرتا تھا نہ اپنے احساسات
نہ ہی خیالات اسے ایسے ماہر خاموشی کی دبیز شیٹس
لگائی ہوئی تھیں جو کسی بھی قسم کے ردعمل کو ظاہر نہیں
کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ رات بہت ہو گئی ہے
اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ سلطان نے گھڑی کی
جانب نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔ اللہ حافظ۔ وہ کہہ
کر رکا نہیں جبکہ جے ڈی حیرت سے اس کو جاتا دیکھتا
رہ گیا تھا۔

☆......☆

تم نے شادی کیوں نہیں کی میں تو سمجھی تھی یونی
ختم ہونے کے ساتھ ہی تم شادی کر لو گے۔ زرش کی
آواز پر اس نے چونک کر اس کی جانب
بہت مشتاق نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھ
ہو میں شادی نہیں کر سکتا فی الحال تو مجھے
حاصل کرنا ہے اور رہی بات شادی کی تو
رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے اپنی تنہائی
سے پیار ہے مجھے شادی کی صورت میں
بدلنا ہوگا اور میں خود کو نہیں بدل سکتا۔ اس
کھاتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا اور اگ
ایسی لڑکی ٹکرا گئی۔ تم سے جس نے تمہیں
ٹھان لی پھر کیا کرو گے یونہی کنی کترا کر گز
اس کی خاطر خود کو بدل لو گے۔ زرش کے
بے اختیار مسکرا دیا میں وہی کروں گا زرش
بار کیا تھا۔ ہاہا گڈ جواب مجھے پتہ تھا تم یہ
زرش نے دلچسپی سے کھانا کھاتے ہوئے
کیا کر رہی ہو آج کل...... کچھ خاص نہیں
کے ساتھ منسلک ہوں اور بی بی جان کے
گزارتی ہوں۔ گزر جاتا ہے وقت۔ وہ ا
کر بولا اس کے شرارت بھرے انداز پر و
گھور کر رہ گئی پھر ہنس کر بولی۔ سچ بتاؤں
بہت مشکل ہوئی لیکن اس نے ساتھ رہتے
نے انسانوں کو پڑھنا پرکھنا اور ان کو انسان
مارجن دینا سیکھا ہے یہ انہی کی تربیت او
ہوئے سبق ہیں کہ میں اپنے باپ جیسے
صاف کر رہا ہے۔ ریلی تو کیا وہ اب ملتے
...... اکثر آتے ہیں...... دو تین بار میں او
جگہوں پر ساتھ جا چکے ہیں وہ میری ا
سپورٹ بھی کر رہے ہیں۔ یہ تو بہت اچھ
ہے تم نے۔ وہ بولا اور تبھی ان کی ٹیبل پر
دیکھ کر سلطان خاموش ہو گیا۔ السلام علیکم
ہے گائز۔ بہرام قریب آ کر بولا۔ سلطان
ہو لے سے جنبش دی جبکہ زرش خوش دلی

ل احوال دریافت کرنے لگی پھر اس کی جانب توجہ ہو کر بولی۔ بہرام میرے چچا کا بیٹا ہے جہانگیر ار۔ تمہیں پتہ ہے ناں سلطان۔ اس نے تصدیق اہی لیکن سلطان ہکا بکا کبھی بہرام اور کبھی زرش کو یکھ رہا تھا اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔ اصل ں میرے بابا کے چچا کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ں لیکن بہرام اور میں ایک اسائمنٹ کے سلسلے میں کراچی میں ملے تھے اور پھر چچا سے ملنے کے بعد ں میں کسی طور کدورت کم ہوئی ہے۔ آؤ یار بیٹھو......
سلطان نے اس کو پیش کش کی لیکن وہ جلدی میں تھا س لیے چلا گیا۔ میرا خیال ہے اب ہمیں بھی چلنا اہیے۔ سلطان نے ریسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے وئے کہا۔ زرش محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔

☆......☆

فہد گروپ نے اپنی محنت سے ایک ایرانی ٹینڈر حاصل کر لیا فہد شاہ اس کامیابی پر پھولے نہیں سمارہے تھے ورکرز ایسوسی ایشن سے خطاب کے بعد وہ جنرل منیجر اور دیگر سیکریٹریز سے ملاقات کرنے کے بعد اب ہوٹل کا وزٹ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے جبکہ سلطان پاشا ان کے کیبن میں کھڑا چند فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا اسی لمحے سلطان کو ایسا لگا گلاس وال کے ایک جانب ایک سایہ ابھر کر معدوم ہوا ہو اس نے جھٹ پٹ فائل واپس رکھی اور باہر نکل آیا سامنے مسز طاہر کو کھڑا دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ مجھے فہد صاحب نے اپنے کیبن کی صفائی کروانے کا کہا تھا میری غیر موجودگی میں سوئیپر صفائی ٹھیک طریقے سے نہیں کرتے پچھلے دنوں انہوں نے صفائی کرتے ہوئے چند فائلیں ادھر ادھر کر دی تھیں وہ جانچتی ٹٹولتی نگاہیں سلطان پاشا پر مرکوز کرتے ہوئے بولیں سلطان پاشا نے بغیر کسی ردعمل کے ان کی بات سنی اور آگے بڑھنے لو ہی تھا کہ وہ عقب سے ایک بار پھر بولیں......
اب کی بار اگر موجودہ ٹینڈرز کی فائلز ادھر ادھر ہوتی ہیں تو اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر آئے گی جنرل منیجر صاحب ان کی دانت پیس کر کہے گئے الفاظ نے سلطان کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دیں وہ ایڑیوں کے بل گھوما۔ اب کی بار ایسا کچھ نہیں ہوگا جو پچھلی بار ہوا تھا مسز طاہر ڈونٹ وری اینڈ کیری آن یور ورک وہ کہہ کر رکا نہیں اور مسز طاہر محض کندھے اچکا کر رہ گئیں۔ کیبن سے نکل کر راہداری کو عبور کرنے کے بعد جونہی سلطان انٹرنیس ڈور تک پہنچا ریسپشنسٹ نے اس کو روک کر فائل دی۔ سر فہد آج صبح آپ کو دینے کے لیے کہا تھا اس ہفتے ریسٹورنٹ کی سیرمنی ہے نا اس لیے۔ اسے محض اثبات میں سر ہلا کر فائل لے لی اور زیر لب دو تین گالیوں سے نوازا۔ فائل لے کر وہ فیکٹری ایریا میں آ گیا وہاں کچھ کام نمٹانے کے بعد وہ سائیٹ پر گیا اور اس کے بعد رات گئے اپنے اپارٹمنٹ میں آیا تو تھکن سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔
ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہوتے اس کو اپنا ہی عکس اجنبی اور انجان لگ رہا تھا۔ نہ تو وہ بچپن جیسے خدوخال اور نہ ہی آنکھوں میں خوابوں کا ایک جہاں نہ خوشنما سپنوں کے سمندر میں غوطہ زن ارمان اور نہ ہی محسوسات اس کو کبھی کبھار اپنا آپ گلیشیر جیسا لگتا اس کی بے تاب انگلیاں اپنے چہرے کے اردگرد گردش کر رہی تھیں چہرے کے نیچے گردن اور گردن سے ذرا نیچے وہ واحد تعویذ جو آخری بار اس کی ماں نے اس کو پہنایا تھا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ تعویذ اس کے منسلک وہ پیتل کا چھوٹا سا لاکٹ وہ چاہ کر بھی خود سے جدا نہیں کر پایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود کو اپنے ماضی سے جدا کرے اگر وہ اپنے آپ کو اپنے ماضی سے جدا کرتا تو وہ اپنے

عزائم ماضی کے دھندلکوں میں کھو دیتا وہ خود سے کیے گئے عہد نہیں بھولنا چاہتا تھا ہر رات بے تحاشہ سگریٹ پھونکتے ہوئے وہ ان راتوں کو یاد کرتا جس کی اذیتوں نے ایک چھوٹے سے بچے کو قاتل بنا دیا تھا۔ اب بھی اکثر راتوں میں آغا کا خون میں لت پت پڑا لاشہ اس کی نیند حرام کر دیتا تھا۔ سلمان کا نیم بسمل وجود اس کی اذیت دوچند کر دیتا اور ماں کا لمس تلاش کرنے کی تگ و دو اس کو حواس باختہ کر دیتا اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے چونک کر شیشے میں ابھرتے عکس کو دیکھا اور دوسری نگاہ موبائل پر ڈالی جے ڈی کا نمبر اسکرین پر جگمگا رہا تھا اس نے ایک گہری سانس لی ار ہاتھ سے پیشانی مسلنے لگا۔ کچھ دیر اس کیفیت میں کھڑے رہنے کے بعد وہ دھیرے سے چلتا ہوا اپنی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا کرسی کو آگے پیچھے گھمانے کے بعد وہ اس نہج پر پہنچا تھا کہ کبھی کبھار انسان کا دل چاہتا ہے کہ اپنے ماضی سے کنی کترا لی جائے یا پہلو تہی کر لی جائے ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے والی آنکھوں سے چشم پوشی اختیار کر لی جائے ماضی کے تمام گزرے ایام کو اختیار کر کے ترازو پر تولا جائے اور ناکامی کے بعد اونہہ کہہ کر بے فکری سے سر کو جھٹک دینا مشکل امر ہے لیکن کرنے میں کیا حرج ہے۔

اپنی ذات کے پوشیدہ خانوں میں سینت سینت کے رکھے خوابوں پر چادریں چڑھا کر سب سے چھپا دینا مشکل تو نہ تھا اس نے اپنے گلے میں لٹکے ہوئے تعویذ کو دیکھا جب وہ بچہ تھا بھیک مانگنا لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے اور ان کے پاؤں پکڑنے میں صرف ایک ہی دعا لب پر ہوتی کاش کچھ کھانے کو مل جائے نہ کپڑے لتے کی فکر نہ روزگار کی تمنا نہ تعیش و آسائشات کی پرواہ لیکن اب ...... اب سب کچھ تھا لیکن سکون اس ایک آدمی کے پیروں تلے ڈیرا ڈالے ہوئے تھا اس آدمی نے سلطان سے اس کا سب کچھ چھین لیا خواب اس کی ماں...... وہ ایک جھٹکے سے کھڑکی کے کرٹن سرکا کر کالونی کے دائیں جھانکنے لگا۔ چاروں طرف جگمگاتی روشنی کے اندر بھرے ہوئے انسان کو مزید مشتع
اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی بھاگا جائے انسان کا گریبان پکڑ کر پوچھے کہ بتاؤ فہد شا ہے میرا؟ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں سب کچھ چھین کر تم کس طرح کسی غیر کی او لگا سکتے ہو؟ اس نے سرخ آنکھوں سے سا اس کے اپارٹمنٹ کا دروازہ بجا...... تواتر دروازے نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذو اس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھ لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ دروازہ کھولا سامنے کھڑی مسز طاہر کو دیکھ سارا غصہ پل بھر میں ہوا ہو گیا ایک تو مسز طا ایمپلائی تھیں دوسرا سر فہد شاہ کمپنی منیجمنٹ اسٹاف کے مسائل سب وہی ہینڈل کرتی سب ان کی عزت کرتے تھے لیکن آنکھوں میں وہ کھٹکتی تھیں۔ کتنی ہی بار ان د درمیان جھڑپ ہو چکی تھی۔ السلام علیکم! آ آئیں۔ وہ ایک جانب ہو کر بولا۔ وہ اندر وعلیکم السلام کیسے ہیں جنرل منیجر صاحب صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولیں۔ ٹھیک ہوں آپ سنائیں۔ وہ اپنے لہجے کو حتی نارمل کرتے ہوئے بولا۔ سلطان کے اع چھائی پژمردگی اچانک سے غائب ہو گئی کچن میں آ گیا فریزر سے کولڈ ڈرنک نکالی نکالے اور جھٹ پٹ لے کر وہ ان کے سا اس سب کی کوئی ضرورت نہیں ہے ج

صاحب مجھے معلوم ہے لیکن آج صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ سوچا آپ کے ساتھ کھالوں گا۔ اسنیکس اٹھا کر کھاتے ہوئے اس نے کہا انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک اسنیکس اٹھالیا مجھے کمپنی میس کے لیے کچھ فنڈز چاہیے میں نے تین لڑکیوں کو ان کے کام میں نااہلی کی وجہ سے برخاست کردیا ہے اور مزید تین لڑکیوں کو ہائیر کیا ہے فوڈ کوالٹی چیکنگ کے لیے میں نے مزید دو خواتین کو اپائنٹ کیا ہے میں چاہتی ہوں اس ہفتے مجھے فنڈز ایشو کیا جائیں اور میں کل اور پرسوں لیو پر جانا چاہتی ہوں۔ خیریت تو ہے مسز طاہر؟ سلطان کے منہ سے بے اختیار نکلا کیونکہ مسز طاہر بہت پنکچویل تھیں ایسا شاذونادر ہی ہوتا کہ وہ لیو لیتیں۔ میں اپنے ہوم ٹاؤن جارہی ہوں ایبٹ آباد میرے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور سسرال کے کچھ مسائل ہیں۔

سلطان جانتا تھا کہ مسز طاہر بیوہ خاتون ہیں ان کے شوہر اس کمپنی میں ملازمت کے دوران فوت ہوئے تھے تب مسز طاہر اور ان کے شوہر دونوں کمپنی میں جاب کرتے تھے شوہر کی وفات کے بعد کمپنی کی جانب سے ملنے والے الاؤنس لے کر انہوں نے جاب نہیں چھوڑی ایبٹ آباد میں ان کا ایک بیٹا دادی کے پاس رہتا تھا اور دوسرا افتخار اسی کمپنی میں ملازم تھا ٹھیک ہے مسز طاہر میں فنڈ ڈپارٹمنٹ کو فون کردوں گا آپ پیسے لے لیجیے گا۔ اس نے کولڈ ڈرنک کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کولڈ ڈرنک ختم کرچکیں انہوں نے بہت گہری نگاہوں سے اس کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے دروازے تک آیا۔ جنرل منیجر صاحب ایک بات کہوں۔ مسز طاہر ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ ان کے چہرے سے چھلکتا تذبذب اس کے لیے بالکل نیا تھا ورنہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو بات منہ پر

بے دھڑک کہہ دینے کے عادی ہوتے ہیں وقت پر کھالیا کریں کام کرنا اچھا ہے لیکن اس کے لیے اپنی صحت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ خ توجہ دیا کریں ان کے منہ سے اس درجے اپنا لیے الفاظ اس کے لیے حیران کن تھے۔ سلطان ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا جس قماش کی خا تھیں ان سے اس درجے اپنائیت اور اخلاق و مر کی وہ توقع نہیں کررہا تھا۔ سلطان کے لبوں بیساختہ مسکان ابھر کر معدوم ہوگئی وہ سر کھجا کر اب آپ نے کہا ہے تو کوشش کروں گا۔ کوشش عمل کرنا ہے میں اب اکثر و بیشتر آپ سے پو رہا کروں گی۔ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں سامنے آتے جی ڈے نے روک کر انہیں کچھ کہا۔ جو میں انہوں نے سخت الفاظ استعمال کیے جس پر ڈی کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور ان کے ماتھے پر پھیلا گنت بلوں نے ان کا چہرہ مزید ہیبت ناک بناد کہہ رہی تھی وہ تم سے۔ وہ سلطان پاشا کے سامنے آکر بولے۔ کچھ فنڈز کا مسئلہ ہے اور میں دو تین لڑکیوں کو انہوں نے جاب سے نکال ہے اس کا بتانے آئی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ہوئے بولا۔ ہوں۔ جے ڈی نے ہنکارا بھرا پھر کر ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ سا تم میرا بازو ہو میں نے تم میں اور بہرام میں کوئی نہیں رکھا لیکن یہ مت بھولنا میری نگاہیں ہر وقت لگی ہوتی ہیں اب نگاہوں میں تمہاری نگرانی بلکہ تشویش اور محبت چھپی ہوئی ہے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ بدلے میں تم مجھے اتنی ہی محبت دو گے سلطان سر جھکائے ا باتیں سنتا رہا۔

☆......☆

یونان میں بھیجی جانے والی کنسائنمنٹ پر

دی گئی تھی وجہ اس میں کوالٹی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا عین ٹائم پر کنسائمنٹ شپنگ روکنے کا مطلب فہد ایسوسی ایٹ کو دوگنا نقصان تھا اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا کسی کو معلوم نہیں تھا جے ڈی اور دوسرے شیئرز ہولڈرز سخت متفکر تھے۔ ہال میں میٹنگ کے دوران اور بعد میں سب نے ہی فہد شاہ کا ٹوٹا بکھرا انداز ملاحظہ کیے ان کی پرتشویش پیشانی پر جا بجا بکھرے ان گنت بل چہرے پر پھیلی پژمردگی کسی چشم سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ وہ میٹنگ کے بعد سب سے الگ تھلگ چلتے ہوئے فیکٹری ایریا کے باہر ایک اونچے سنگی بنچ پر بیٹھے ورکرز ٹرکوں سے سامان کے بڑے بڑے کارٹن اتار کر فیکٹری ایریا کے اندر لے جارہے تھے اس فیکٹری کو بڑی محنت سے ان کے باپ نے شروع کیا اور اس کے بعد فہد شاہ نے اپنی پوری جوانی فہد ایسوسی ایٹ کو دے دی ورکرز کالونی تعمیر کرائی گئی تاکہ ورکرز کو رہائش بھی فراہم کی جائے اب بہت جلد ریسٹورنٹ کا افتتاح ہونا تھا لیکن وقت اور حالات اس طرح پلٹا کھا گئے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کا دل بہت گہرائی میں ڈوبتا جارہا تھا ان کا سانس اکھڑنے لگا جبکہ ان کی نگاہیں سامنے کھڑے ورکرز کے درمیان سلطان پاشا پر رک کر ساکت ہوگئیں وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا تو یقین اور بے یقینی کے درمیان سروں کو ان کے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتے دماغ نے ایک مقام پر شکست کھائی کون ہے یہ سلطان پاشا۔ سوال ایک سائکل کی طرح دماغ اور نگاہوں کے سامنے تھا۔

ان کی استعجابیہ نگاہیں سامنے کھڑے شان بے نیازی اور کچھ مغرورانہ انداز والے سلطان پاشا پر اٹھیں تو واپس پلٹنا بھول گئیں سلطان پاشا جے ڈی کا کیا لگتا ہے جے ڈی اس کو اپنا دایاں بازو کیوں کہتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور دل پر پڑا ان کا ہاتھ کپکپانے لگا افتخار احمد نگاہیں ان کے زرد پڑتے چہرے پر پڑیں تو اٹھنا بھول گئیں وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی وائل دوسر ورکرز کو تھماتا تیزی سے ان کی جانب آیا۔ سر...... کیا آپ ٹھیک ہیں؟ اس کی فکرمندی میں ڈوبی آ اس لمحے فہد شاہ کو کسی نعمت سے کم محسوس نہیں ہور تھی۔ میں ٹھیک ہوں۔ انہوں نے مسلسل بند ہو آنکھوں کو بامشکل کھولنے کی سعی کی لیکن بے سو کسی ٹوٹے بکھرے محل کے ملبے کی طرح زمین پر گئے۔ ورکرز ان کی جانب لپکے۔

ایک ہفتے اسپتال میں گزارنے کے بعد گھر آئے ان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی معمولی اٹیک تھا لیکن وہ چاہنے کے باوجود زرتاشہ کو اس کی اطلاع نہیں دے سکے اس کے ایگ ایگزام تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ سب کچھ چھ چھاڑ کر یہاں آجائے یہاں جو کچھ ہوا وہ سب ان نگاہوں سے پوشیدہ تو نہیں تھا آفس آکر انہوں جنرل منیجر کو اپنے کیبن میں بلایا۔ سلطان پاشا جب بلایا گیا تو ایک بے اختیار مسکراہٹ اس لبوں پر رینگ گئی تو مسٹر فہد شاہ احتساب کا وق آگیا ہے وہ زیرلب بولا اس کی آنکھوں سے نفر کی چنگاریاں پھوٹتی کہیں بڑھتے قدموں مضبوطی اور مقابل کو زیر کرنے کا جذبہ بدرجہ موجود تھا۔ آپ نے بلایا؟ وہ ان کے روم میں داخ ہوکر بولا۔ جس انداز میں سلطان پاشا ان سامنے کھڑا تھا وہ ان کے لیے سخت اچنبھے کا باعث وہ ابھی بھی بے یقین تھے ایک معمولی ورکر جس بے شک اپنی لگن اور محنت سے جنرل منیجر کی کر سنبھالی تھی تو کیا اب اس کی نظر چیئرمین کی کرسی تھی۔ چیونٹی کے پر نکل آئے تھے۔ یہ سب تم نے ہے۔ انہوں نے ایک فائل اٹھائی عین اس

سامنے چھینکی ان کا خیال تھا وہ چونکے گا اپنی جگہ سے اچھلے گا اور پھر سخت متعجب ہو کر کہے گا نہیں یہ سب میں نے نہیں کیا۔ سر میں نہیں جانتا لیکن ان کی توقعات کے اور خیالات کے برعکس وہ بولا۔

جی یہ سب میں نے کیا ہے۔ اسے فائل کو نظر انداز کیا اور میز پر اپنے دونوں ہاتھ جماتے قریب ہو کر ان کے عین سامنے جھکا نہ صرف میں نے یہ سب کیا ہے بلکہ اس سے پہلے آپ کے جتنے بھی کنٹریکٹ ختم ہوئے ہیں یا ڈیلے ہوئے ہیں ان سب میں میرا ہاتھ تھا مسٹر فہد شاہ۔ وہ نفرت اور حقارت سے بولا اس کے لہجے سے چھلکتی تضحیک و استہزائیہ پن نے ان کو اپنی جگہ ساکت کر دیا وہ پوری آنکھیں کھولے اس کو دیکھ رہے تھے۔ تم نے ...... تم نے یہ سب کیوں کیا سلطان پاشا۔ کس کے کہنے پر تم نے یہ سب کیا ہے۔ فہد شاہ کو اپنی ہی آواز کہیں در سے آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ رعونیت اور دبدبہ تو کہیں دور جا سویا تھا میں آپ سے بدلہ لینا چاہتا ہوں آپ کو نیست و نابود کرنا چاہتا ہوں' میں چاہتا ہوں آپ اسی طرح زندگی گزاریں جس طرح میں گزارتا آیا ہوں ایک رات بھی آپ سو نہ سکو اور جب صبح اٹھو تو سارا دن آگے کیا ہو گا کا سوالیہ نشان آپ کی منزل کو بے نشان اور دھندلا کرتا رہے۔ ٹھٹھرا ہوا اور جسم کو منجمد کر دینے والی سردی آپ کی ہڈیوں میں خون کی طرح شامل ہو کر آپ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لے آپ سڑک پر بیٹھ کر بھیک مانگیں اذیتیں اور تکلیفیں پھٹکاریں دھتکاریں سہیں جو میں نے سہی ہیں۔ آپ کے جسم پر جا بجا پیوند زدہ لباس آپ کی پہچان چھین لے مسٹر پاشا تم یہ سب کیوں کرنا چاہتے ہو سلطان میں نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ تمہارے ساتھ تمہارے چہرے سے نفرت اور حقارت کی پرچھائیاں چھلک رہی ہیں۔ میں ان کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ آپ

نے کیا کیا ہے میرے ساتھ مسٹر فہد؟ آپ نے
سب کچھ کیا ہے میرے ساتھ میری ماں سے
کر کے وعدے کیے اور میری پیدائش کے بع
کو کمپنی سے نکال دیا در بدر کر دیا جب وہ مجھے
کے پاس لائی تو آپ نے اس کو دھکے دے
سے نکال دیا اور کچھ عرصے بعد اسے مروا دیا۔ م
میں نے یہ...... نہیں کیا سلطان...... میں تو تم
ماں کو جانتا تک نہیں ...... وہ بپھر کر بولے ا
انجان بننے کی ایکٹنگ کمال کی تھی۔

سلطان دو قدم آگے بڑھ کر بولا تو کیا
فریدہ بیگم کو نہیں جانتے وہ ان کی آنکھوں میں آ
ڈال کر بولا ......نہیں......انہوں نے کسی پس
کے بعد جواب دیا ان کے جواب نے سلطان
حیران نہیں کیا تھا آپ کے پاس صرف پانچ
ہیں مسٹر فہد ریسٹورنٹ سیرمنی کے دوران آپ
اپنا بیٹا تسلیم کر لیں ورنہ میں اس کمپنی کو اور آ
نیست و نابود کر دوں گا یہ میرا وعدہ ہے یہ
چھاپ فقیر قاتل آپ کو بھی سڑک پر لے آئے
غلط کر رہے ہو بخدا میں نہیں جانتا تمہیں کسی نے
گائیڈ کیا ہے میں تو اوروں کی اولادوں کو سینے سے
ہوں پھر اپنے جائز بیٹے کے ساتھ ایسا کیسے
ہوں......

اپ سب کچھ کر سکتے ہیں مسٹر فہد ب
پانچ گھنٹے ہیں آپ کے پاس سیرمنی شروع
سے پہلے آپ دنیا کے سامنے مجھے اپنا بیٹا کہیں
ورنہ میں اپنا وعدہ پورا کروں گا وہ کہہ کر اس ک
سے نکلنے کے ساتھ سلطان پاشا کی آنکھوں
آنسو نکلنے لگے وہ نہ جانتا تھا کہ وہ جب بھی
کے سامنے آئے گا وہ اس کو یونہی دھتکاریں
دھتکار تو بھیک مانگتے ہوئے لوگوں کی دھتکا
کہیں زیادہ تکلیف دہ اور باعث ندامت تھ

نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا سامنے سے آتی مسز طاہر کو دیکھ کر اس کو بے اختیار رک جانا پڑا۔گڈ ایوننگ جنرل منیجر وہ بہت محتاط اور تشویش بھری نگاہوں سے اس کے چہرے کا طواف کرتے ہوئے بولنے لگیں اس نے سر کو ہولے سے جنبش دی ورنہ الفاظ تو کہیں گلے میں ہی اٹک گئے تھے ۔ آپ ٹھیک ہیں جنرل منیجر صاحب۔جی بالکل۔اس نے بمشکل کہا اور ایکسیوز می کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔مسز طاہر نے حیرت سے اس کی پشت کو دیکھا اور کندھے اچکا کر رہ گئیں

☆......☆

وہ اپنے اپارٹمنٹ میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ جے ڈی کا میسج آ گیا فوراً پارک میں آ جاؤ سلطان۔ سلطان کے لیے ان کا اس وقت بلاوا حیرت کا باعث تھا پارٹی شروع ہونے میں تین گھنٹے رہ گئے تھے اس کی سوئی اس نہج پر رک سی گئی تیار ہونے کے بعد جیسے ہی باہر نکلا رنگ و بو کا ایک طوفان سا تھا جو کچھ فاصلے پر امڈنے کو تیار تھا۔اس نے بے اختیار کمپنی اپارٹمنٹ میں سب سے پر شکوہ اور الگ تھلگ اپارٹمنٹ کی جانب دیکھا جو آج بھی پر شکوہ اور روشن تھا۔ میں اپنے اندر کی ساری کڑواہٹ ساری کھولن تمہارا نصیب بنادوں گا فہد شاہ یہ میرا تم سے وعدہ ہے وہ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھا ورکرز مستعدی سے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ہوٹل اسٹاف کا چناؤ پچھلی میٹنگ میں کیا جا چکا تھا اس لیے تمام ورکرز ہال میں نظر آ رہے تھے ۔وہ ہال سے ہوتا ہوا طویل راہداری کو عبور کر کے مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔ دائیں جانب مڑتے ہوئے اس کو سڑک پہلے سے زیادہ خالی ویران اور اداس لگی بالکل اپنے دل کی طرح۔ پارک میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے جے ڈی کو دیکھ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرا ان سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔اس کے محض ایک منٹ بعد وہ اس جانب متوجہ ہوئے ان کا چہرہ غصے میں سرخ ہو رہا انہوں نے غصے میں لاٹھی اسکے ندھے پر دے مار وہ اس پر بلبلا کر رہ گیا ایک کندھے پر لاٹھی مار کے بعد وہ رکے نہیں انہوں نے پے در پے کئی لاٹھی اس کو ماریں تمہیں مجھ پر میری محبت پر یقین نہ تھا نا سلطان۔ وہ لاٹھی ایک طرف پھینک کر ہا ہوئے بولے۔سلطان نے انتہائی حیرت سے ان جانب دیکھا وہ جانتا تھا وہ اس پر نظر رکھتے ہیں لیک فہد شاہ سے جو بات ہوئی تھی وہ تو بند دروازے ہوئی تھی پھر ان باتوں سے آگاہی کیسے حاصل کی یہ راز اس پر افشا ہو ہی گیا کہ فہد شاہ کے ہر معاملا سے جے ڈی کس طرح باخبر رہتے تھے مجھے آپ پورا یقین تھا اور ہے جے ڈی۔وہ سر جھکا کر بولا اس کی بات پر انہوں نے ہونہہ کیا اور اس کے سامنے آ کر اس کا کندھا جھنجوڑتے ہوئے بو نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے سلطان میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ تم ساری باتیں فہد سے جا کر کرو ساری باتیں اس سے کرنے کے بعد کیا ہوا سلط پاشا کچھ بھی نہیں اس نے تمہیں نہیں اپنایا اور د دیا تم نے اس کو پانچ گھنٹے دیے تھے تا اگر پانچ س بھی دیے ہوتے تو بھی وہ تمہیں تسلیم نہ کرتا آ سوری جے ڈی وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ جے ڈ سارا غصہ بھاپ بن کر اڑ گیا وہ قریب ہو کر اس دونوں کاندھوں سے لگاتے ہوئے بولا اس دنیا اگر کوئی انسان تم سے سچی محبت کتا ہے سلطان تو میں ہوں۔ میں نے تمہیں چاہا ہے تم میں اور بہ میں بھی فرق نہیں کیا۔تمہاری اس حرکت نے میر دل پر کاری ضرب لگائی ہے مجھے دکھ ہوا ہے بہت سلطان ایک دم سے ان کے پیروں میں گر گیا۔ معاف کر دیں۔ جے ڈی مجھے لگا تھا شاید وہ اپنی غل

کااعتراف کریں شاید وہ جان جائیں کہ ان کی وجہ سے میری ماں مجھ سے جدا ہوئی ہے میری شخصیت کو تباہ کرنے اور مجھے اس قدر اذیت میں مبتلا کرنے میں انہی کا ہاتھ ہے لیکن انہوں نے مجھے میرے وجود میری شخصیت کو ماننے سے انکار کر دیا اس کی آنکھوں میں بہتے ندامت کے آنسوؤں نے جے ڈی کو خاموش کر دیا وہ اس کے قریب آئے اسکو کھڑا کیا سلطان میرے بیٹے میں نے تمہیں بہت سمجھایا ہے اور سمجھا رہا ہوں کہ اگر فہد نے تمہیں اپنانا ہوتا تو وہ تمہاری ماں کو دھوکا نہ دیتا تمہیں بے رحم دنیا کے حوالے نہ کرتا تم میرے بیٹے ہو جہانگیر ڈار کے بیٹے میں تمہیں دوں گا عہدہ مرتبہ سب کچھ جو تم چاہتے ہو اس نے اثبات میں سر ہلایا جہانگیر ڈار نے اب اس کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

☆......☆

ریسٹورنٹ سیرینٹی شروع ہو چکی تھی محفل اپنے جوبن پر تھی مشہور و معروف انڈسٹریلیسٹ وہاں موجود تھے۔ ملازمین مستعدی سے اپنے فرائض سر انجام دے رہے تھے ویٹرز مہمانوں میں لوازمات سرو کر رہے تھے۔ میں لیٹ تو نہیں ہوئی نا۔ زرش سلطان پاشا کے قریب آ کر بولی۔ وہ ہجوم میں گھرا ہوا تھا بے ساختہ چونک کر پیچھے مڑا اس کو دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ بے اختیار مسکراتے ہوئے بولا بالکل بھی نہیں لیکن وقت پر آئی ہو ابھی تو چیئر مین صاحب بھی نہیں آئے وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مسکرا دیا ویسے آج کافی خوبصورت لگ رہی ہو کہیں ڈیئر کزن کی وجہ سے تو نہیں...... سلطان کے شرارت وذومعنی انداز پر وہ اس کو گھور کر بولی وہ میری پیدائش کے بعد سے ہی میرا کزن ہے۔ اب نہیں ہوا اور صد شکر کہ محترم سلطان پاشا کو میری خوبصورتی نظر تو آئی۔

اس کے شکوے پر سلطان قہقہہ بار ہوا وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا سوئمنگ پول کے قریب آ گیا اسی وقت اوپر سے ایک چیخ کے ساتھ کوئی ونڈو سے نیچے ہوتا ہوا سوئمنگ پول میں گرا۔ وہاں کھڑے افراد میں چیخ و پکار کے ساتھ بھگدڑ مچ گئی پہلے پہل تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا ہے پھر سوئمنگ پول میں تیرتا چیئر مین کا نیم جان وجود دیکھ کر ورکرز تیزی سے سوئمنگ پول کی جانب بڑھے۔ سلطان پاشا کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا گلاس زمین بوس ہو گیا وہ لوگوں کو دھکیلتا پول کے اندر چھلانگ لگا چکا تھا فہد شاہ کا وجود اپنے بازوؤں میں بھینچے اس کو ایسا لگا جیسے ایک بار پھر سے سلمان اس کے بازوؤں میں دم توڑ رہا ہو اس کی حیات ایک بار پھر لٹ رہی تھی وہ دیوانہ وار پول سے باہر نکلا کچھ ورکرز نے اس کے باہر نکلنے میں مدد کی وہ تیزی سے لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا انٹرینس ڈور کی جانب بڑھا کار گیٹ پر پہلے ہی آ چکی تھی وہ فہد شاہ کو کار میں ڈال کر خود ان کے قریب بیٹھ گیا ان کا سر اس کی گود میں تھا جبکہ اس کا رواں رواں ڈر خوف سے کانپ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ یہ خودکشی اس دھمکی کی وجہ سے کی گئی ہے۔ م...... میں...... میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ان کے چہرے کو تکتے ہوئے وہ خود سے ہمکلام ہوا آغا کو مارنے کے بعد کتنے ہی عرصے وہ یونہی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر خود کو یقین دلاتا رہا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا اس اذیت ناک لحات سے وہ ابھی تک باہر نہیں نکل سکا تھا اور اب ایک اور پچھتاوا اور خود احتسابی کے پرکٹھن لمحات اس کے منتظر تھے مجھے مجھے معاف کر دیں ان کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں ان کی سانس اکھڑنے کے ساتھ اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے سے جان نکلنے لگی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

گاڑی جلدی چلاؤ۔ سنا نہیں تم نے...... وہ دھاڑا۔ ڈرائیور نے رفتار بہت تیز کر دی تھی جبکہ وہ ان کے چہرے کو اپنے ہاتھ سے تھپتھپانے لگا۔ ہاسپٹل آ چکا۔ فہد شاہ کو اسٹریچر پر لے جایا جا رہا تھا وہ ہاسپٹل سے نسبتاً اندھیرے گوشے میں بیٹھا اپنی زندگی میں بسنے والے اس نئے اندھیرے کی وجہ تلاش کرنے لگا اس رات اس نے خود سے انگنت سوالات کیے آغا کو مارنے سے لے کر فہد شاہ کی خود کشی کے سوالات اندھیرے میں ڈھونڈنے کے علاوہ اس نے دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔ اس میں اتنی جرات ہی پیدا نہ ہو سکی کہ ہاسپٹل کے اندر جاتا اور ڈاکٹرز سے فہد شاہ کے متعلق سوال کرتا اس نے جیسے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ فہد شاہ نہیں بچے گا جیسے فہد شاہ نے مر بھی جانا ہے حالانکہ ان کے زندہ رہنے یا مر جانے سے فہد شاہ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا وہ یونہی بے نشان رہتا پھر کیوں اس نے خود سے فہد شاہ سے ضد کی کہ وہ اس کا وجود تسلیم کر لیں۔ اس کو بیٹا مان لیں۔ اس نے خود سے شکوہ کیا۔ وہ اس وقت خود سے شکوے کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆

سلطان پاشا کی آنکھ منہ اندھیرے کھلی پہلے پہل تو خود کو ایک سنگی بینچ پر چت لیٹا ہوا پا کر وہ ششدر ہوا لیکن پھر میکانکی انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہی اس کو کل رات خود پر بیتی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ نہ صرف الٹا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہاسپٹل میں داخل ہو گیا نائٹ ڈیوٹی پر مامور اسٹاف چاق و چوبند تھا اس نے ریسپشنسٹ سے فہد شاہ کا پوچھا تو اس نے سامنے ڈاکٹر جاوید کے روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان سے پوچھیں۔ وہ تھکے ماندے اعصاب اور بچے کی طرح ڈرے سہمے دل کو بے قابو

ہوتے ہوئے محسوس کرنے لگا اس کے قدم
بھر کے ہو رہے تھے وہ دروازہ ناک کر کے اند
ہوا ان کے بیٹھنے کا اشارہ کرنے پر وہ کسی
ہوئے جواری کی طرح بیٹھ گیا اس نے سر فہد
حالانکہ ڈاکٹر کا جواب جانتا تھا ان کی حالت
ہے کوما میں بھی جا سکتے ہیں بہر حال چوبیس گھ
لیے ان کو آبزرویشن میں رکھا ہوا ہے۔ تو کیا
ہیں؟ وہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں
لگا۔ ڈاکٹر جاوید نے حیرت سے اس کی جانب
جی بالکل ان کے جواب سے زیادہ ان کے اند
اس کو شدید سبکی میں مبتلا کر دیا۔ تھینک یو۔ تھینک
۔ وہ جیسے ہی ان کے روم سے نکلا جے ڈی
پڑتے ہی اس کی ساری خوشی بھک سے اڑ گئی
نے تیکھے چتونوں اور کچھ عجیب نگاہوں سے
دیکھا۔ وہ تیزی سے ان کے قریب گیا وہ آ
اسی کیفیت میں تھا جس کیفیت میں آغا کو
کے بعد کافی عرصہ رہا تھا میں۔ میں نے سب
جے ڈی وہ بوکھلا کر ہونق پن سے بولا۔
حالت زار پر جے ڈی نے انتہائی تحمل سے
دیکھا پھر اس کا کاندھا تھپکتے ہوئے بولے میں
ہوں تم ایسا نہیں کر سکتے سلطان پاشا فہد اتنا تو
تھا کہ اس کو خودکشی کے علاوہ کوئی اور حل نظر
آیا تم جانتے ہو ہمارے کنٹریکٹ ختم ہو رہے
ہماری کمپنی کی ساکھ ختم ہو رہی ہے یہی صدما
جنہوں نے فہد کو دل برداشتہ کر دیا ہے اگر میں
پانچ گھنٹے کا ٹائم نہ دیتا تو شاید وہ یہ اقدام نہ اٹھ
وہ اب بھی خود کو مجرم گردانتے ہوئے بولا۔
نے نفی میں سر ہلا دیا اور اپنا بازو اس کے کند
گرد حمائل کرتے ہوئے بولے۔ تم خود کو قص
کیوں سمجھ رہے ہو وہ کچھ ہی دنوں سے بکھرا
شکست خوردہ سا تھا اسے یہی کرنا تھا۔ وہ

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یقین دلاتے ہوئے بولے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆

کل رات کی فلائیٹ سے زرتاش آ رہی ہے ہاسپٹل سے نکلتے ہوئے کار میں بیٹھنے کے فوراً بعد جے ڈی نے سلطان پاشا کو بتایا وہ جو باہر کے مناظر میں پتہ نہیں کیا کھوج رہا تھا ان کی آواز پر چونک کر ان کی جانب دیکھنے لگا وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ میں چاہتا ہوں اس کو ریسیو کرنے تم جاؤ۔ سامنے دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک لحظے کو اس کی جانب دیکھا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا سلطان پاشاہ یہ بات ہرگز نہ بھولو تمہاری بربادی اور تمہاری خستہ حالی کی ذمہ دار وہی لڑکی ہے جو فہد کی کچھ نہیں لگتی لیکن اس کی بیٹی کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے جبکہ تم اس کے حقیقی بیٹے ہونے کے باوجود بھی یتیموں کی سی زندگی گزار رہے ہو وہ آہستہ آہستہ زہر اس کے دل و دماغ میں انڈیل رہے تھے اور یہ کام وہ جانے کب سے کمال مہارت اور باریک بینی سے کرتے رہے تھے اب تو سلطان پاشا کو اس طرح کی باتوں کی عادت ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا تھا فہد کی یوں اچانک پسپائی کے بعد شاید ریسٹورینٹ کی ریپوٹیشن پر فرق پڑے گا لیکن فند نے اندر ہی اندر آفاق والوں سے جو معاہدہ کیا ہوا ہے اس سے ریسٹورنٹ کی شہرت بہت اچھی ہے ایک کام بہرحال بہتر ہے کہ ریسٹورنٹ کے جنرل مینیجر بھی تم ہی ہو تمہارے لیے یہ فخر کا مقام ہے مائی سن۔ وہ اس کو دیکھ کر مسکرائے اس نے محض سر کو ہلکی سی جنبش دی وہ چاہ کر مسکرا نہیں سکا شاید اس کو مسکرائے ہوئے تو عرصہ ہوگیا تھا۔ میں کبھی کبھار تمہارے رویے سے حیران ہوجاتا ہوں سلطان۔ کبھی تو خوشی کو خوشی کی طرح محسوس کیا کرو بہرام تمہارے ساتھ ہے لیکن مجال ہے جو کبھی سیریس ہوا ہو اور آمنہ وہ تو تم سے بھی بڑی ہے لیکن اس کا بچپنا تو جاتا ہی نہیں ہے باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے جبکہ وہ چاہ کر بھی کس قسم کا ردعمل کا مظاہرہ نہیں کر سکا میں بھی اکثر خود حیران ہوتا ہوں کہ کس طرح جی پاؤں گا اور جی ہوں۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکایا اور سا دیکھنے لگا۔

☆......☆

مجھے حیرت ہو رہی ہے تم مجھے اپنے ساتھ جانا چاہتے ہو؟ زرش نے کتنی ہی بار اس سے یہ سوال کیا تھا اس کے سوال پر وہ محض مسکرا کر بولا کیو تمہیں کیوں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ پھر تم میرے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتیں۔ اس کے استعجابیہ انداز زرش ٹپٹا کر بولی ایسی کوئی بات نہیں ہے تمہارے رویے کی اس اچانک تبدیلی نے مجھے حیران کر ہے کہیں مجھ سے شادی وادی تو نہیں کرنا چاہ رہے تم۔ زرش نے چھیڑنے کے انداز میں کہا اس بات پر سلطان قہقہہ بار ہوا اور پھر گمبھیر لہجے میں محترمہ کر بھی سکتا ہوں انسان ہوں اکیلے رہ رہ تھک بھی سکتا ہوں میرا دل بھی کسی ہم سفر خوبصورت دلنشیں ہم سفر کی چاہ کر سکتا ہے اور یقی یہ خصوصیات آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ سلطا کے اس انداز نے زرش کو حیران کر دیا۔ خیر تو کہاں تو محترم ٹھیک طریقے سے بات ہی نہیں کر تھے اور اب یہ حال ہے کہ چند دنوں سے ان کی ر بدل گئی ہے بہرحال زرش اس کے اس رویے بہت خوش تھی۔ اس نے بہت عرصے بعد سلطان خوش ہوتے دیکھا تھا اس نے خود پر چسپاں سار پرتیں اتارنا شروع کر دی ہیں۔ تو کہا میں رشتہ پکا سمجھوں پھر؟ زرش نے مسکرا کر استفسار کیا اس

بات پر سلطان نے کار روک دی اور اس کی جانب دیکھ کر بولا کاش میں ایسا کہہ سکتا کہ بالکل سمجھو فی الحال تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ بس کچھ ہی لمحوں کی بات تھی کہ سلطان دوبارہ سے اپنے خول میں مقید ہوگیا اس نے ڈرائیونگ دوبارہ شروع کردی اور زرش نے بھی باہر دیکھنا شروع کردیا وہ جانتی تھی کہ اب وہ چاہ کر بھی سلطان کو ان کیفیات سے باہر نہیں نکال پائے گی جب وہ ایک بار خود کو اپنے شیل میں مقید کرلیتا تو پھر اس کو باہر نکالنا بہت مشکل ہوجاتا تھا۔ کار رک چکی تھی لیکن زرتاشہ کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں تھا سلطان نے پہلے سے ہی اسسٹنٹ منیجر کو بھی بھیجا تھا جو ان دونوں کو دیکھ کر تیزی سے ان کی جانب آیا۔ سر مس زرتاشہ آئی ہی نہیں میں کب سے یہاں کھڑا ہوں بورڈ لے کر۔

اپنے بورڈ ان کی جانب کیا جس پر زرتاشہ لکھا ہوا تھا۔ سلطان نے سیل پر جے ڈی کا نمبر ملایا ان کو مطلع کرنے کے بعد وہ زرش کے ساتھ واپس آ گیا۔

☆......☆

یہ کیسے ہوسکتا ہے سلطان وہ نہیں آئی حالانکہ کل رات ہی میری اس سے بات ہوئی ہے۔ جے ڈی کافی دیر سے بولنے کے ساتھ کمرے میں دائیں بائیں چکر بھی لگا رہے تھے سلطان نے محض کندھے اچکا دیئے حقیقت تو یہ تھی اس کو نہ تو زرتاشہ سے دلچسپی تھی اور نہ ہی اب فہد شاہ سے اس کے اندر لڑنے اور بدلہ لینے کی قوتیں خود بخود دم توڑ گئی تھیں اب طویل خاموشی اور سناٹے اس کے اندر رقصاں تھے اور وہ ان سناٹوں میں اپنی ہستی کو تلاش کرنے میں مگن رہتا ......سر......سر......مس زرتاشہ آ گئی ہیں۔ ملازم اندر آ کر بولا۔ ......کیا آ گئی ہے......لیکن کیسے آ گئی ...... جے ڈی حیرت سے بولتے ہوئے باہر نکلے

سلطان بھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کے پیچھے آ دونوں راہداری کو عبور کر کے ہال میں پہنچے انتہائی ماڈرن لڑکی دو لڑکیوں کے ہمراہ کھڑی نگاہوں سے ہوٹل کو دیکھ رہی تھی۔

اوہ انکل کیسے ہیں آپ؟ جے ڈی پڑتے ہی وہ ان کی جانب لپکی ایک ادا سے ا اپنا سر ان کے آگے جھکایا اور پھر تن کر ان کے کھڑی ہوگئی جے ڈی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ا لمحے انہوں نے کمال مہارت سے خود کو سنبھ بولے زرتاشہ میری بیٹی کیسی ہو؟ میں نے ریسیو کرنے جنرل منیجر سلطان پاشا کو بھیجا تھا اس فلائٹ سے آئی ہی نہیں۔ جے ڈی کی ش ڈوبی ہوئی آواز برچھی کی طرح زرتاش اعصاب پر لگی اس کو اپنی یونیورسٹی کی اینول پا آنے لگی جب ہال میں گونجتے تیز م اسٹوڈنٹس کے اژدہام میں اس کے ہاتھ موبائل بجا اس نے موبائل اسکرین کی جانب ڈیڈ کا نمبر جگمگا رہا تھا اس کو اچنبھا سا ہوا آج ڈیڈ سے بات ہوئی تھی تو زرتاشہ نے ان کو اپنی کی مصروفیات کے متعلق بتایا۔ اور یہاں اتنا کہ شاید ہی ان کی بات سمجھ میں آتی اس ریسیو کی اور ہال سے نکل کر ٹیرس پر آ گئی۔ وہا شور تھا لیکن ہال کی نسبت کم تھا۔

”ہیلو...... بابا کیسے ہیں آپ“ و ہوئے بولی۔ زر......زر...... میری بیٹی۔ میری دھیان سے سنو۔ ڈیڈ کی دھیمی اور قدرے بکھری نے اس کے قدم منجمد کر دیئے اس کا دل ا خدشات میں گھر کر دھڑکنے لگا۔ یہاں مت ش یہاں ہر طرف تمہارے دشمن ہیں۔ اگر آ کسی پر اعتبار نہ کرنا۔ یہاں کوئی اعتبار کے قابل ہے اور ایک بات یاد رکھنا میرے لیے تمہارا با

کمزور نہیں کہ خودکشی کرے...... ہیلو...... ہیلو...... بابا ...... بابا۔ وہ چلائی تھی۔

☆......☆

ان کی ناقابل فہم باتوں نے اس کو الجھا دیا تھا اس نے کتنی ہی بار اس کا نمبر ملایا لیکن کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔ زرتاشہ ساری رات سو نہ سکی اور اگلی صبح اس نے پاپا کی خودکشی اور پھر کومے میں جانے کی خبر سنی۔ اس نے جان بوجھ کر جے ڈی کو غلط فلائیٹ کا بتایا اور دوسری فلائیٹ سے پاکستان پہنچی جے ڈی کے چہرے پر بکھرے جا بجا خجالت کے رنگوں کو اس نے بغور ملاحظہ کیا نجان بنتے ہوئے بولی میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی انکل! اس کے ساتھ ہی اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے زرتاشہ تم میری بیٹیوں جیسی ہو۔

بیٹیوں جیسی ہوں انکل، بیٹی تو نہیں ناں۔ اس نے مڑ کر تکڑا توڑ جواب دیا۔ اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک لمحے کو دیکھا اور قدم آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔ میں آج شام ڈیڈ سے ملنے ہسپتال جاؤں گی اور شاید اپنی ماں کے آبائی گاؤں بھی۔ ہاں بالکل تم جاؤ میں تمہارے ساتھ گارڈ بھیج دوں گا۔ وہ اس کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے بولے۔ زرتاشہ رک کر بولی۔ گارڈ کیوں انکل آپ کے جنرل منیجر کس دن کام آئیں گے۔ ان کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ جنرل منیجر نے اچھنبے سے جے ڈی کی طرف دیکھا۔ کہاں محترمہ نے نگاہِ غلط بھی اس پر نہیں ڈالی اور کہاں اب وہ اس کے ساتھ جانا چاہ رہی تھیں۔ جے ڈی گھگیا کر بولے بالکل سلطان ہی جائے گا تمہارے ساتھ اب تم آرام کرو۔ اس کو کمپنی اپارٹمنٹ کی جانب بڑھتے دیکھ کر جے ڈی نے کہا۔ زرتاشہ نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر بے

نیازی کے سارے پردے چاک ہو گئے۔ اس ... اپنا موبائل پرس سے نکالا۔ اسکرین پر جگمگاتی پاپا ... تصویر کو اشکبار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ... بولی۔ پاپا جب میں امریکہ گئی تھی آپ کو ہنستا مسکر ... چھوڑ کر گئی تھی بار ہا آپ امریکہ ملنے آئے تب ... آپ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوتی ... اور اب۔ اب میں آپ کو کیسے دیکھ پاؤں گی ... زرتاشہ کے مسلسل بہتے آنسوؤں نے موبا ... اسکرین کو بھگو دیا۔ اسی وقت دروازہ بجا اس ... لیس کہا لیکن دروازے کی سمت ہنوز پشت ... ہوئے تھی۔ ایک اونچا لمبا نوجوان اندر داخل ... اس نے کمپنی کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی اس شخص کو ... ہزاروں میں بھی پہچانتی تھی اس کے ساتھ بچپن ... گڑیا کا ہاؤس بنانے سے لے کر گیلی ریت پر مختلف ... اشکال بنانے اور بگاڑنے میں وہ اس کے ساتھ ... تھا پانچ سال پہلے جب وہ امریکہ جا رہی تھی تب ... لکڑی کا گھر دیکھنے اس کے گھر گئی۔ اس گھر کو بنا ... میں اس کو چھ ماہ لگے تھے اس گھر کے باہر ... دروازے پر زرتاشہ ہوم اس طرح کندہ کیا ہوا ... کہ ایک لمحے کو زرتاشہ کی نگاہیں خیرہ رہ گئیں ... یہ...... یہ گھر کس کے لیے بنایا ہے افتخار؟ اس ... مشتاق لہجے میں پوچھا مس زرتاشہ کے لیے۔ ا ... نے اسی بے نیازی سے جواب دیا اور آج پا ... سال کے بعد اس کو دیکھ کر بھی نہیں لگتا تھا کہ یہ و ... افتخار ہے۔ کوئی کام تھا آپ کو۔ اس نے لاپرو ... سے موبائل سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ا ... قدر اجنبی انداز پر ایک لمحے کو افتخار سٹپٹا گیا پھر نفی ... سر ہلاتے ہوئے بولا روم کے متعلق پوچھنا تھا ... آپ کو یہ روم پسند نہیں تو آپ کا سامان دوسر ... اپارٹمنٹ میں شفٹ کر دیں۔

زرتاشہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

نیازی سے چلتی ہوئی اس کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ناقدانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی منیجر میں جس حسین اپارٹمنٹ میں رہ کر آئی ہوں یہ اس کے مقابلے میں زیرو ہے لیکن بہر حال میں گزارہ کرلوں گی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پردے سرکا کر نیچے جھانکا۔ جنرل منیجر پارکنگ کے قریب کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ اس کو دیکھ کر زرتاشہ کے منہ سے بے اختیار گالیاں نکلیں۔

اوکے۔ مادام آپ آرام کیجیے۔ افتخار نے قدم آگے بڑھائے۔

بس اتنا پوچھنا تھا افتخار۔ افتخار کے عقب سے ابھرتی آواز نے اس کے قدم زمین میں جکڑ دیے وہ بھونچکارہ گیا۔ یہ خواب تھا اور نہ ہی واہمہ۔ زرتاشہ بازو باندھے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتے افتخار کے لیے وابستگی کے رنگ اتنے نمایاں تھے کہ وہ حیران رہ گیا۔ میں سمجھا آپ مجھے بھول گئیں۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

افتخار نہ تم مجھے بھولے ہو اور نہ میں تمہیں بس مجھے تم پر غصہ تھا۔ بہت زیادہ۔ میں جاتے ہوئے تمہیں اپنا نمبر دے کر گئی۔ پاپا کے ساتھ کیا کچھ ہوگیا اور تم نے ایک بار بھی مجھے اطلاع نہیں دی۔ زرتاشہ میں نہیں جان پایا کہ یہ سب کس نے کیا ہے لیکن میں ایک بات جانتا ہوں وہ جو کوئی بھی ہے ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس نے کمال مہارت سے......

افتخار مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ بجا اور جنرل منیجر کو اندر آتا دیکھ کر وہ چپ ہوگیا۔ روم سروس بالکل بھی اچھی نہیں ہے۔ منیجر اور شام تک یہ پنک کلرز کے کرٹن اپنے روم میں نظر نہیں آنے چاہئیں اب تم جاسکتے ہو۔ زرتاشہ چلاتے ہوئے بولی۔ افتخار جلدی سے روم سے نکل گیا۔

مس زرتاشہ چار دن بعد کمپنی کی میٹنگ ہے

کیا آپ اس میں شرکت کریں گی...... بالکل
گی، کیا اب میں آرام کرسکتی ہوں...... جی
جنرل منیجر نے ایک لفظے کو اس کی جانب
شانے اچکائے اور باہر نکل گیا۔ اس کے جا
بعد زرتاشہ نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا۔ ایک
اوپن کی جس میں پاپا کا انٹرویو تھا۔ کچھ دن پ
انہوں نے کمپنی اجلاس میں شرکت کی تھی
انٹرویو دیا۔ ان کے چہرے پر تفکرات کی پر
موجود تھیں لیکن وہ کبھی بھی خودکشی نہیں کر
میں خودکشی نہیں کرسکتا۔ ان کے الفاظ ابھی
کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

☆......☆

مادام گاڑی تیار ہے۔ آپ کو ہسپتا
جانے کے لیے۔ ملازم نے آکر اس کو اطلا
اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر آئی
اپارٹمنٹ کے درمیان سے گزرتے ہوئے ا
قدم بائیں جانب ٹیرس پر واک کرتے جنرل
دیکھ کر رک گئے۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھ
دونوں چائے پینے کے ساتھ واک کررہے
دونوں باتوں میں اتنے منہمک تھے کہ گردو
ہوش نہیں تھا جبھی تو جنرل منیجر نے خود جا
بجائے ڈرائیور کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ ا
بہت غور سے جنرل منیجر سلطان پاشا کی جانب
وہ کہیں سے بھی اس کمپنی کا ایمپلائی نہیں لگتا تھ
کی نشست و برخاست بات چیت کے اند
ایک فاصلہ اور ایک تکبر و غرور سا چھلکتا تھا اس
جھٹکا اور آگے بڑھ کر پارکنگ میں افتخار دو تین
اور ڈرائیور اس کے منتظر تھے۔

زرتاشہ نے اپنا سر جھٹکا اور افتخار سے م
ہوئی۔ منیجر افتخار میرے ساتھ صرف آپ جائ
لیکن میم جے ڈی صاحب نے کہا ہے کہ گار

کے ساتھ جائیں گے ایک ادھیڑ عمر ملازم نے گارڈ کی جانب اشارہ کر کے کہا لیکن زرتاشہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سرد وسپاٹ لہجے میں بولی۔افتخار کار ڈرائیو کرو۔ افتخار نے لپک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ زرتاشہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہوگئی۔لیکن میم سر بہت خفا ہوں گے...... ادھیڑ عمر نے کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ گاڑی چلاؤ۔زرتاشہ نے سن گلاسز آنکھوں پر ٹکاتے ہوئے کہا اور افتخار نے گاڑی چلادی۔ میم کچھ دن بعد چیئر پرسن کی سیٹ کے لیے کمپنی اجلاس ہو رہا ہے اور جے ڈی چاہتے ہیں کہ چیئر پرسن ان کو بنادیا جائے۔ایک تو وہ پچاس فیصد شیئرز کے مالک ہیں دوسرا چیئر مین کومے میں ہیں اور دوسرا کوئی ایسا نہیں ہے جو اُن کے چیئر مین ہونے پر اعتراض کرے۔ افتخار کی بات پر وہ حیران نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔ افتخار یہ جنرل منیجر سلطان پاشا کون ہے۔زرتاشہ کی نگاہیں ابھی بھی واک کرتے ہوئے اس بے نیاز شخص کی جانب مرکوز تھیں۔

جے ڈی کا لے پالک بیٹا ہے اس کی کفالت جے ڈی نے کی ہے سر بہرام کے ساتھ ہی اسے ایم بی اے کیا ہے اور پانچ فیصد شیئرز کمپنی میں سلطان پاشا کے بھی ہیں جو اس نے اس سال خریدے تھے۔ میم اس حادثے سے پہلے چیئر مین کی سلطان سے جھڑپ ہوئی تھی چیئر مین اس پر چلا رہے تھے اور جواب میں وہ بھی زبان چلا رہا تھا جب میں چیئر مین کو کمرے میں فائل دینے گیا تو اندر سے آتی آوازوں پر رک گیا۔ زرتاشہ نے کچھ رک کر افتخار کی جانب دیکھا وہ خود کو ایسے بند راستے میں کھڑا محسوس کر رہی تھی جہاں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہاسپٹل آ گیا۔ زرتاشہ مرے مرے قدموں سے پاپا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ان کو مختلف پٹیوں میں جکڑا ہوا دیکھ کر اس کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔آنکھوں سے آنسو بارش کے قطروں کی طرح گالوں پر گر لگے۔ میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتی ہوں۔اس مڑے بغیر کہا۔افتخار جی میم! کہتا ہوا کمرے سے گیا۔ وہ زور قطار روتے ہوئے ان کے بیڈ قریب آئی اور وہیں بیٹھ گئی اس نے اپنا ہاتھ ان ہاتھ پر رکھا اس کی نگاہ ان کی کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑی جو اس نے ان کی برتھ ڈے پر ان دی تھی اور اب اس گھڑی کو دیکھ کر خود کو قابو میں ر دوبھر سا ہو گیا تھا۔ پاپا ایک بار صرف ایک بار مجھے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ جاتی لیکن آپ ...... آپ نے مجھے اتنا اجنبی ......اتنا انجان اور کر دیا کہ مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ کہاں سے لا ان ثبوتوں کو جمع کروں اور کمپنی کے حالات کے عل آپ کے بعد خود پر مرکوز نگاہیں مجھے یہ باور کرا ہیں کہ میرا جینا ان حالات میں کس قدر مشکل پاپا۔کاش، کاش! آپ ایک بار مجھے ان حالات آگاہ کر دیتے۔ وہ رو رو کر اپنا سر ان کے قر ٹکاتے ہوئے بولی لیکن ان کے منجمد وجود میں کہ بھی زندگی کی رمق پیدا نہیں ہو پائی۔ میں وعدہ کر ہوں پاپا وہ جو کوئی بھی ہے اس کو نہیں چھوڑوں گی۔

☆......☆

ہاسپٹل سے آنے کے بعد وہ پاپا کے اپارٹمنٹ میں آئی اس کا خیال تھا کہ ان کا اپارٹمنٹ بند ہو گا یا اس کو یوں آسانی سے اندر نہیں جانے دیا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اس نے جیسے ہی سلطان پاشا سے ک آپ جا سکتی ہیں اپارٹمنٹ کھولا ہر چیز اسی ترتیب رکھی ہوئی تھی جو ترتیب اسکائپ پر ڈیڈی نے اس دکھائی تھی۔ کتابوں کے ریکس کے درمیان سے ہو ہوئے وہ سینٹرل ٹیبل تک آئی۔ پاپا کی فائل ٹیبل ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں کچھ دیر پاپا کی چیئر پر بیٹ

غائب دماغی سے وہ چھت کو گھورنے لگی۔ جنرل منیجر۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، اس کے آفس سے ضرور کوئی نہ کوئی معلومات مل سکتی ہیں اور اس وقت وہ اپنے آفس میں موجود بھی نہیں ہوگا۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھ کر قیاس کیا اور محتاط قدموں سے چلتی ہوئی راہداری میں آ گئی ۔ ہوٹل اسٹاف اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھا ۔ اس کے قریب سے گزرتے کئی ویٹرز اور ویٹرس نے آئی برو اچکا کر اس کی جانب دیکھا۔ بہر حال وہ مالکن تھی کوئی بھی اس سے سوال کرنے یا پوچھنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا دوسرا اس کا ہتک آمیز رویہ کسی سے پوشیدہ نہیں تھا اس کا اندازہ درست نکلا۔ جنرل منیجر کے کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے سرعت سے دروازہ بند کیا اور بجلی کی سی تیزی سے اس کی ٹیبل کے قریب پہنچی وہاں روزمرہ کی فائلوں کے علاوہ اس کو کچھ نہیں ملا ٹیبل کی درازوں کی تلاش کے بعد وہ مایوس ہو کر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ ٹیبل کے دائیں جانب فائلوں کے نیچے کوئی شے چمکتی محسوس ہوئی اس نے فائلوں کو ہٹا کر دیکھا۔ پاپا کی گھڑی اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس کی گفٹ دی ہوئی گھڑی کلائی میں باندھنے کے بعد انہوں نے یہ گھڑی اتار کر کوٹ کی جیب میں ڈال دی تھی وہ کوئی معمولی گھڑی نہیں بلکہ لفنی کی ڈیزائن کی ہوئی واچ تھی۔ واچ اپنے اپر کی جیب میں ڈالنے کے بعد وہ رکی نہیں پاپا کے آفس میں داخل ہونے کے ساتھ ہی اس ضبط کی طنابیں ہاتھوں سے چھوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں مسز طاہر اور دو ورکرز کمرے میں ضروری فائلز تلاش کر رہی تھیں اس کو آتا دیکھ کر مسز طاہر نے سر کے اشارے سے سلام کیا اور پھر سے اپنے کام میں منہمک ہو گئیں آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند تھی کہ اس کا پیر ایک چھوٹے سے گملے سے لگا۔ گملا الٹ گیا مسز طاہر چونکیں اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو قریب

آنے سے روکا نچوں کے بل اس گملے کا جائزہ۔ اچانک اس کی نگاہ دوسرے گملے پر چمکتی ایک پڑی اس نے مسز طاہر کی جانب دیکھا ان کا اس کی جانب نہیں تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ میں لے لی، پنک کلر کی چھوٹی چھوٹی گولیوں تھیں کے شاپر میں رکھا ہوا تھا اس نے وہ تھیلی ا کی دوسری جیب میں ڈال لی اور اٹھتے ہوئے طاہر یہاں کی صفائی کرا دیں۔ وہ کہہ کر رکی نہیں

☆......☆

زرتاشہ نے اگلے دن گولیوں کی تھیلی اف حوالے کی تا کہ وہ پتہ کرا سکے کہ یہ گولیاں کس لیے

میم یہ زہر کی گولیاں ہیں۔ اتنی زیادہ تعد آپ کے پاس کیوں ہیں؟ افتخار نے شاپر اس کی بڑھاتے ہوئے حیرت سے کہا۔ زرتاشہ جواب نہیں دیا البتہ یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس کے پیچھے جنرل منیجر کا ہاتھ ہے لیکن اس نے کیوں کیا اور کس کے کہنے پر کیا، یہ جاننا ضروری

میم بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہو چکی ہے۔ ملازم نے اندر آ کر مطلع کیا اس اثبات میں سر ہلایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی کانفر کی جانب بڑھنے لگی اس کے دل و دماغ ایک ہی بات رقصاں تھی کہ اس کو ہر حال چیئرمین کی کرسی پر براجمان ہونا ہے وہیں پاپا کے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچا سکتی ہے۔ آ خیال میں اب کی بار جاپانی ڈیلیگیشن کی نمائند کرے گا۔ بورڈ میں بیٹھے افراد میں سے ایک جے ڈی آئی مین جہانگیر ڈار صاحب کریں گے

جے ڈی مسکرا کر بولے مجھ سے بہ کر سکتا ہے یہ نمائندگی......

(جاری

میرے بابا کی شادی

وہ بھی اپنی تنہائی سے پریشان تھا پھر ایک فیصلہ ہوگیا.....زندگی سے جڑی حقیقتیں جنہیں آپ اور ہم اکثر درگزر کردیتے ہیں.....

مہر نسیم

شکیل صاحب کو آج کل تنہائی کسی ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ وہ بظاہر خود کو مصروف رکھنے کی بہت کوشش کرتے مگر گھر میں آتے ہی تنہا گھر انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتا' وہ بے چین ہوکر باہر نکل آتے۔ اُن کی جیون ساتھی سال بھر پہلے اُن کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں' اب وہ تنہائی کا عذاب جھیل رہے تھے۔

شکیل صاحب کے بچے اپنی دنیا میں مگن تھے۔ کبھی فون کرلیا' کبھی ویسے ہی حال چال پوچھنے آگئے۔ وہ اب بچوں کو کیا کہتے کہ میرے پاس رہو' اُن کی اپنی مصروفیات تھیں' وہ دیواروں کو گھور گھور کر اُکتا جاتے' کبھی کبھی تو ایسی طبیعت خراب ہوتی کہ اٹھ کر پانی بھی نہ پی سکتے تھے۔ ایسے میں بے بسی اور لاچاری اُن کے چہرے سے یوں ٹپکتی تھی جیسے غریب کی جھونپڑی برسات میں ٹپکتی ہے تو وہ اللہ سے بارش رُکنے کی دعا کرتا ہے۔

شکیل صاحب کا بہت دل چاہتا تھا کہ کوئی تو ہو جس سے وہ گھنٹوں بات چیت کریں' کوئی اُن کی سنے وہ کسی کی سنیں' مگر دور دور تک ایسا کوئی ذی روح دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ رات بھر کر[illegible] پر کروٹ بدلتے مگر نیند بھی جیسے اُن سے نا[illegible] محبوب کی مانند روٹھ چکی تھی۔ وہ بھلا کیا [illegible] پڑھا ہوا اخبار پھر سے پڑھ ڈالتے' ٹی وی [illegible] گھسی پٹی خبریں سن سن کر تنگ آجاتے' کو[illegible] ایسی مصروفیت نہ تھی کہ وہ خود کو بہلا سکتے' [illegible] ہو ہو کر پہلو بدلتے رہتے تھے۔

اچانک ایک دن انہیں خیال آیا کہ کیو[illegible] وہ دوسری شادی کرلیں اِس دنیا میں کوئی تو [illegible] طرح تنہا ہوگی' اُسے بھی ساتھی کی ضرورت [illegible] مگر پھر یہ سوچ کر وہ خود گھبرا گئے کہ بچے کیا [illegible] گے کہ اِس عمر میں ہمارے والد شادی کر [illegible] ہیں۔ بہت دل کو سمجھایا اپنے اندر ہمت پ[illegible] اور آخرکار ایک دن اخبار میں ضرورت ر[illegible] اشتہار دے ڈالا تھا۔

دوسرے دن ہی اس سلسلے میں کال آنا ش[illegible] ہوگئیں۔ ایک خاتون کو انہوں نے دوسری [illegible] کے لیے منتخب بھی کرلیا' اب انہوں نے اِس [illegible]

کے بارے میں بچوں کو بتانا تھا اور پھر بہت جھجک جھجک کر اپنے چھوٹے بیٹے اسد کو فون کیا تھا۔

''جی بابا خیر تو ہے؟''

''خیر ہاں بیٹا' وہ بیٹا!''

''ہاں' ہاں بولیں بابا کیا مسئلہ ہے؟''

''بیٹا وہ تنہائی اب برداشت نہیں ہوتی۔''

''بابا پھر اس کا کیا حل ہے؟''

''بیٹا میں......شادی کرلوں۔''

''بابا' یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اس عمر میں شادی لوگ کیا کہیں گے؟ کیوں ہماری سبکی کروانی ہے۔ بابا اِس خیال کو چھوڑیں اور کوئی نوکر رکھ لیں' دل بھی بہل جائے گا اور گھر کے کام بھی ہوتے رہیں گے' اور بابا آپ یہ بات امینہ اور جنید بھائی کو نہ کہنا' وہ بہت برا منائیں گے۔''

شکیل صاحب نے فون بند کیا اور پریشان ہوکر اپنی آنکھوں میں آئے اشک صاف کیے۔

''کیا اس عمر میں شادی کرنا جرم ہے ہے' ایک بیوہ کی شادی ہوسکتی ہے تو ایک رنڈو[illegible] کی کیوں نہیں ہوسکتی' کیوں لوگ اس بات کو نہ[illegible] سمجھتے کہ اِس عمر میں تو ساتھی کی زیادہ ضرور[illegible] ہوتی ہے۔'' کیسے کیسے خیالات شکیل صاحب [illegible] ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے۔ انہوں نے ا[illegible] گھومتے ہوئے سر کو پکڑلیا تھا اور بستر پر د[illegible] ہوگئے تھے۔

دوسرے روز جن خاتون سے رشتے کی با[illegible] ہوئی تھی اُن کی کال آئی تو شکیل صاحب پریش[illegible] ہوگئے' وہ خاتون بھی بیوہ تھیں' بچے ملک سے [illegible] تھے وہ بھی تنہائی سے تنگ آچکی تھیں۔ ش[illegible] صاحب نے پہلے تو سوچا کہ ان کی کال اٹینڈ [illegible] کریں' مگر پھر اٹینڈ کرہی لی تھی۔

''جی آپ نے پھر کیا سوچا؟''

''میں نے اپنے بیٹے سے بات کی تھی' وہ نہیں مان[illegible]



"دیکھیں اگر آپ بچوں کی مرضی پر چلیں گے تو وہ کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ آپ یونہی تنہائی کا عذاب سہتے رہیں گے۔"

"پلیز آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" یہ کہہ کر شکیل صاحب نے فون بند کر دیا تھا اور اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔

"یا اللہ! تو اس تنہائی سے بہتر مجھے موت دے دے۔" میں نے ساری زندگی بچوں کی خاطر گزار دی' اُن کی پرورش' تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی' آج بچے مجھے ہی تنہائی کی دلدل میں چھوڑ کر اپنی اپنی دنیا بسا کر مجھے بالکل ہی بھول بیٹھے ہیں' پھر میں کیوں اُن کی پرواہ کروں۔" شکیل صاحب کے دل و دماغ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی' دل کہتا تھا کہ...... اپنی دنیا بسالو اور خوش رہو' کسی کی پرواہ نہ کرو' مگر دماغ کہتا تھا کہ دنیا تو جینے ہی نہیں دے گی۔ اس عمر میں کیوں ذلت اٹھائی ہے' جیسے ایک سال گزر گیا ہے باقی کے سال بھی گزر جائیں گے۔"

ساری رات اسی کشمکش میں گزر گئی اور آخر دل جیت گیا' انہوں نے صبح ہی ان خاتون کا نمبر ملایا اور اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی پھر چند ملاقاتوں کے بعد شکیل صاحب اور اُن خاتون فرحت کا نکاح ہو گیا' بچے بہت تلملائے' مگر وہ اپنی نئی دنیا میں مگن ہو گئے' آخرکار بچے بھی خاموش ہو گئے۔ اب شکیل صاحب کی بھی کوئی سننے اور سنانے والا موجود تھا گھر ایک بار پھر آباد ہو گیا تھا۔

آج شکیل صاحب زندگی کو پہلے کی طرح بہت آسودگی سے گزار رہے ہیں' زندگی میں بعض فیصلے بہت مشکل ہوتے ہیں۔ مگر ایسے فیصلے بہت سی خوشیاں بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔

☆☆......☆☆



تشنگی اور ہے' منظر ہے مسلسل کوئی اور
اوس میں عکس کوئی اور ہے چھاگل کوئی اور

میں تجھے بھول کے اِترانے لگا ہوں ایسے
جیسے کل تک تھا ترے عشق میں پاگل کوئی اور

ساتھیو! اب مجھے رَستے میں اترنا ہو گ
ڈوبتی ناؤ بچانے کا نہیں' حل کوئی اور

یہ محبت کا فسانہ ہے شریعت تو نہیں
کیوں ترے بعد کرے اس کو مکمل کوئی اور

کھل چکا مجھ پہ محبت کا بیاباں یارب
دے مجھے پھر سے بھٹک جانے کو جنگل کوئی اور

یار لوگوں نے بہت خود کو اُچھالا اوپ
ہو سکا پھر بھی مرے قد سے نہ افضل کوئی اور

افضل خان

بولتی تصویریں

وہ حسینہ روز رات کو فریم سے نکل کر باہر آ جاتی اور اپنے بنانے والے سے راز و نیاز کرتی حیرت انگیز تحریر جو آپ کو گنگ کر دے گی......

محمد سلیم اختر

آج 28 فروری ہے کتنا سوگوار ہے یہ دن' اور نجانے کیوں یہ دن مجھے ہر سال سوگوار کر دیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ آج ہی کے دن چونتیس سال قبل میرا دوست مجھ سے بچھڑ کر بہت دور چلا گیا تھا۔ اور آج 28 فروری کو وہی یادیں وہی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش کر رہی ہیں۔ یہ 1983ء کا ذکر ہے میری اور ساحل کی دوستی کو اتنا پرانا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آٹھ ماہ قبل ہم ایک دوسرے سے قطعاً ناآشنا تھے اور آشنائی بھی کیسے ہوتی۔ نہ ساحل کبھی مجھ سے اور نہ ہی میری کبھی اس سے ملاقات ہوئی۔ ہماری پہلی ملاقات بھی ایک لطیفہ ٹھہری۔

☆......☆......☆

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا فائلوں میں غرق تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ میں نے ناگواری سے فون اٹھایا اور ہیلو ہی کہا تھا کہ کسی لڑکی کی مترنم آواز سنائی دی۔ اُس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہوگی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں نے بوکھلا ہوئے پوچھا۔

"فرمائیے کوئی میرے لائق خدمت؟"

"دیکھیے ندیم صاحب' میں آپ سے چاہتی ہوں۔ پلیز آج شام لیک ویو پارک ضرور آیئے گا' میں آپ کا شدت سے ا کروں گی۔"

فون بند ہو گیا اور میرا ذہن اُلجھتا رہا۔ دیر میں اسی کے متعلق سوچتا رہا کہ وہ لڑکی کون ہ ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ میزبانی نے کی ہے۔ دفتر سے فارغ ہو کر میں سیدھا گیا۔ چائے پی اور پھر لیک ویو پارک کی ط چل دیا کہ اگر کوئی لڑکی وہاں نہ ہوئی تو کم تفریح تو رہے گی۔ موسم بھی اس دن خوشگوار ہلکے ہلکے بادل ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور پھر لیک پارک کی خوبصورت کو ہر چیز اپنی جگہ شاد مان آتی تھی۔ میں پارک میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر نظ دوڑانے لگا۔

مگر سوائے ایک صاحب کے کسی اور کو اپنی طرف متوجہ نہ پایا۔ وہ صاحب بہت گہرے انداز میں مجھے گھور رہے تھے۔ جیسے میں نے ان کا حق مار لیا ہو۔ میں جب بھی اُن کی طرف دیکھتا وہ فوراً نظریں گھما لیتے۔ میں وہاں بیٹھا ہوا فون کے الفاظ یاد کرتا رہا۔ وقت بھی سرکتا رہا۔ اب گہرا اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا وہ صاحب اب بھی وہاں موجود تھے مگر ان کی کیفیت ذرا مختلف تھی اور وہ پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ برابر ٹہل رہے تھے اور ہاتھوں کو مسل رہے تھے۔ نہ جانے کس ظالم نے انہیں 'ٹائم' دیا تھا کیونکہ اُن کی حالت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی کے شدت سے منتظر ہیں۔ مجھے اُن پر بہت رحم آیا۔ حالانکہ اس وقت میں [illegible] تھا۔ اب خاصا اندھیرا پھیل گیا۔ میں نے ٹیلی فون کو مذاق سمجھا اور تمام باتوں کو اپنے دماغ سے رخصت کر کے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ خدا جانے میرے دل میں کیا سمائی کہ میں نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے اُن صاحب سے پوچھا۔

''کیا آپ کو بھی کسی نے ٹیلی فون پر یہاں ملنے کو کہا تھا۔''

وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے میری شکل دیکھنے لگے اور پھر بڑی ہمت سے جواب دیا۔

''مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔



صاحب! یہ تو آپ کی حالت ہی بتا رہی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود ایک لڑکی نے یہاں ملاقات کا وقت دیا ہے۔" ان صاحب نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اطمینان کر لینے کے بعد پوری بات بتا دی جو سو فیصد میری بات سے مشابہہ تھی۔

"بہت خوبصورت' تو مذاق اچھا رہا۔"

"ارے بھائی' عورت نے آدم کو بہکا دیا تو ہم کس زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔" اور پھر یہیں میرا اور ساحل کا تعارف ہوا اور ہم دونوں نے ریسٹورنٹ میں نو بجے تک خوب دلچسپ گفتگو کی' وقت گزارا اور رات کا کھانا بھی ہم دونوں نے ساتھ ہی کھایا میرے لاکھ انکار پر بھی ساحل نے ہوٹل کا بل ادا کیا' اور اپنا کارڈ تھماتے ہوئے بولا۔

"ہاں بھئی مسٹر ندیم اب ملاقات رہا کرے گی۔"

"ضرور رہے گی...... میں کل ہی تمہارے ہاں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ خیال رہے کہ میرے گھر ایسی چیزیں نہ مل سکیں گی جو یہاں ملی تھیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں وہ سب چیزیں خریدی بھی جا سکتی ہیں۔" اور ہم دونوں کے قہقہے کافی دیر فضا میں سنائی دیتے رہے' یوں ہم ایک دوسرے سے مل کر جدا ہو گئے۔

اب میری اور ساحل کی دوستی کو تین ماہ گزر چکے تھے مگر اس قلیل عرصے میں ہم دوسرے سے اتنے بے تکلف ہو گئے کہ میرا جی چاہتا کہ ساحل کے ہاں رات بھر ہنسی مذاق میں گزار دیا جائے۔

ساحل کا ذریعہ معاش مجھے معلوم نہ تھا ایک اچھا مصور ضرور تھا۔ ہر دو ماہ تصویروں کی نمائش ہوتی اور اس سے ساحل اسے سے تفریح میں اڑا دیتا اس رہ کر میں بھی کافی عیش پسند ہو گیا تھا۔ ایک اچھا مصور تھا۔ اس کی بنائی ہوئی اور وہ بھی خاص و عام میں کافی مقبولی کر چکے تھے۔

آج بھی ساحل کی تصویروں کی نمائ بہت خوش نظر آ رہا تھا اور میں اس سے مسرور تھا لوگ ساحل کی تصویریں دیکھنے آرٹ گیلری کا رخ کر رہے تھے۔ جہاں ہو رہی تھی۔ ملک رحمان صاحب بھی ان کو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔ ملک اونچے طبقے کے تھے مگر فن کے دلدادہ سابق کچھ تصویروں کے بارے میں ا اپنی پسند کا اظہار کیا اور آخر کار دو تصو لیں...... جو تیس ہزار روپے کے عوض ڈرائنگ روم کی زینت بن گئیں۔ ہونے پر میں نے ساحل سے کہا۔

"یار یہ تو بہت اچھا دھندہ ہے بس اُلٹی سیدھی تصویریں بناؤ اور ہزاروں کما لو۔"

"جی ہاں' اگر یہ اتنا ہی آسان ہو کہہ رہے ہو تو آج دنیا کا ہر فرد مصو ساحل نے رٹا ہوا فقرہ ادا کیا۔

"یار ساحل ...... تم نے اتنی تصویر ہیں' یہ بتاؤ تمہیں ان میں سے کون سی تص سے زیادہ پسند ہے۔" ساحل نے مسکرا کر دیا۔

"ویسے تو سبھی تصویریں مجھے پسند

ب تصویر مجھے بے حد پسند ہے۔

"وہ کون سی؟" میرے منہ سے بے اختیار لا۔

"وہ تصویر......" ساحل نے کچھ سوچتے وئے کہا۔

"وہ تصویر دراصل میں نے ابھی بنائی ہی یں ہے۔" میں نے ساحل کی ہنسی اڑاتے وئے کہا۔

"عجیب چغد آدمی ہو تصویر ابھی بنی ہی نہیں ہے اور وہ تم کو سب سے زیادہ پسند بھی آ گئی؟"

"ہاں ندیم......" ساحل نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"میرے تخیل میں میرے دماغ میں ایک تصویر نقش ہے۔ جسے میں ابھی تک کینوس پر نہیں تار سکا۔ اس لیے کہ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ میں جب بھی اسے کینوس پر منتقل کرتا ہوں تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ تصویر دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ میں نے کم از کم سات آٹھ بار سے بنانے کی کوشش کی مگر ہر دفعہ وہ ایسی نہ بن پائی جیسی میرے خیالوں میں موجود ہے۔"

میں نے یہ سنا تو طنزیہ کہا۔

"کوشش جاری رکھو خدا نے چاہا تو ایک دن تم اپنی پسند کی یہ خیالی تصویر بنانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔"

☆......☆......☆

دن گزرتے رہے ہماری دوستی مضبوط ہوتی رہی اور پھر ایک دن جب میں اس کے گھر پہنچا تو وہ صاحب اپنی کل کائنات رنگ برش وغیرہ سمیت غائب تھے۔ ساحل چونکہ اکیلا تھا اس لیے میں نے اس کے آس پاس سے پوچھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ مگر کوئی بھی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ میں عجیب اُلجھن میں تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کہیں جاتا تو کم از کم مجھ سے تو ذکر ضرور کرتا مگر حیرت تو اسی بات پر تھی کہ کل شام کو ہی ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تھے اور اس وقت تک اس کا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا۔ میرے ذہن پر ایک بوجھ سا سوار ہو گیا۔ میں ہر روز معلوم کرتا مگر جواب ملتا کہ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میرا وقت ساحل کے بغیر کتنا مشکل ہو گیا۔ آفس سے گھر آ کر پڑا رہتا۔

یا کبھی کبھار فلم پر نکل جاتا مجھے رہ رہ کر اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ اگر اس نے جانا ہی تھا تو کم از کم مجھے تو اطلاع کر دیتا تاکہ کچھ سکون تو ہوتا کہ وہ کب آئے گا۔ مگر اس نے تو نہ جانے کی خبر کی تھی اور نہ ہی اس کی واپسی کا پتہ تھا۔ یوں ہی ایک ماہ گزر گیا۔ مجھے اس کی کمی بری طرح محسوس ہوتی تھی۔

اور پھر ایک دن جب میں فلم دیکھ کر گھر لوٹا تو اپنے کمرے میں ساحل کو بیٹھا دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا میں دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

"کیوں بھئی کب آئے؟ یار کم از کم مجھے بتا کر تو جاتے کیا وہاں جانے کی اتنی جلدی تھی کہ مجھے اطلاع بھی نہ دی بہت عجیب آدمی ہو یار تم بھی۔"

میرے ذرا خاموش ہونے پر اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مجھے بھی بولنے کی اجازت ہے۔" میں نے خفیف ہو کر جواب دیا۔

"یار کم از کم مجھے تو بتا کر جاتے ہاں اب بتاؤ کہاں کہاں کی خاک چھانی؟" اس نے مسکرا کر

کہا۔
''شکر ہے تم خاموش تو ہوئے' بھئی ندیم' مجھے افسوس ہے کہ میں جلدی میں تم سے نہ مل سکا۔ وقت کم تھا۔ اس لیے آخری بار ملاقات نہ ہوسکی۔ مگر اب فکر مت کرو۔ میں اب یہاں سے کہیں جانے کا نہیں' میں جس مقصد کے لیے گیا تھا وہ پورا ہو چکا۔'' اُس نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

''کیسا مقصد؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک دفعہ میں نے تم سے اپنی پسندیدہ تصویر کا ذکر کیا تھا۔''

''ہاں پھر؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''بس وہی تصویر بنانے گیا ہوا تھا۔ دراصل یہاں شہر کے ہنگاموں میں' میں وہ تصویر کبھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس لیے میں کشمیر چلا گیا تھا اور تمہیں بھی یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں وہ تصویر ہو بہو بنانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ وہ تصویر جو ایک عرصہ سے میرے خیالوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ حقیقت میں میرا آئیڈیل ہے۔ اب میں نے اسے کینوس پر منتقل کر کے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ تم بھی دیکھ سکتے ہو' بس ذرا جان پڑنے کی کسر ہے۔''

''کہاں ہے...... کیا ساتھ لائے ہو؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''نہیں...... فی الحال تو وہ گھر پر ہے۔ مگر کل...... تم اسے ضرور دیکھ سکو گے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تو کیا کل تمہاری تصویروں کی نمائش ہے۔''

''بالکل......'' ساحل نے مختصر جواب دیا اور پھر اپنے سفر کی پوری کہانی سنانی شروع کردی۔

☆......☆......☆

آج پھر آرٹ گیلری میں لوگوں کی بھیڑ تھی جو ساحل کی تصویروں کی خوبیاں بیا
تھے۔ میں نے اس تصویر کو دیکھا تو د
گیا۔ وہ حسن و جمال کا مکمل نمونہ تھی او
وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی کہ جیسے کوئ
خوبصورت دوشیزہ زندہ کھڑی ہو۔
ٹھیک ہی کہا تھا کہ صرف جان پڑنے
اس کے جسم کے خوش نما' دلفریب نشیب
میں ہلچل پیدا کر رہے تھے۔ سب سے
اسی تصویر پر تھی۔

حالانکہ سب لوگ اسے دیکھ رہے
بھی وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہ رہا
صاحب کو بھی وہ تصویر بہت پسند آئی۔
پچاس ہزار کے عوض اسے خریدنا چاہا۔
نے ہنس کر جواب دیا۔

''ملک صاحب! پچاس ہزار تو کیا
پانچ لاکھ میں بھی نہیں بیچوں گا۔ اس کی
بھی نہیں دے سکتا۔'' ایک صاحب نے
ستر ہزار لگا دیے۔ ملک صاحب کو شاید
پسند آ گئی تھی۔ انہوں نے اس کے
لگا دیے۔ مگر ساحل نے کہا۔

''نہیں ملک صاحب! آپ یا کوئ
نہیں خرید سکتا میں اسے بیچنا ہی نہیں چاہ
دن ملک صاحب خالی ہاتھ لوٹ گئے مگر
نے اور دوسری تصویریں خرید لیں۔
ہونے کے بعد میں ساحل پر برس پڑا۔

''یار تمہیں کبھی عقل نہیں آئے گی۔
میں تو تمہارے وارے نیارے ہو جا
ساحل نے پھر وہی جواب دیا۔

''نہیں ندیم! یہ تصویر انمول ہے' ا
ایک حقیر رقم ہے۔'' اور میں اس کی عقل پ
ہوا گھر روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

تیسرے وز مجھے ساحل ملا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گیا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ خلاف توقع میں نے آج یہ تبدیلی دیکھی تو مسکرا کر کہا۔

"کیوں بھئی' کیا بات ہے کیا تصویر مہنگی بک گئی۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"نہیں یار...... وہ تصویر بکنے والی نہیں ہے۔ آؤ ذرا ہوٹل تک چلیں' میں نے تم سے ایک ضروری اور دلچسپ بات کرنی ہے۔" میں اس کے ساتھ چل پڑا ہوٹل پہنچ کر اس نے چائے کا آرڈر دیا وہ اپنی بات سنانے کے لیے بہت بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ بولا۔

"ہاں تو ندیم' تم میری بات سننے کے لیے تیار ہو۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر کچھ دیر بعد اس نے بات شروع کی۔

"ہاں تو ندیم' اس دن میری تصویروں کی نمائش تھی۔ تو تم گھر جلدی روانہ ہو گئے۔ اور مجھے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے سب تصویریں اتار دیں اور وہ تصویر بھی جس کا عنوان تھا۔

"گلشن...... تم سمجھ گئے ہو گے میرا اشارہ اپنی اس شاہکار تصویر سے ہے۔ جس کے ایک لاکھ روپے لگ گئے تھے۔ وہ بھی میں اپنے ساتھ لے کر چلا آیا گھر آ کر میں نے تمام تصویروں کو ایک طرف رکھا اور اس تصویر کو اپنے بیڈ کے سامنے لگا دیا۔ یقین کرو وہ ہلکی ہلکی روشنی میں زندہ دوشیزہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر کلاک نے دس بجائے تو میں چونک پڑا۔ میں ایک نشے کے یوں ہی بیٹھا تھا۔ مجھے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ پھر میں نے اپنا بستر ٹھیک کیا اور لیٹنا ہی چاہتا تھا کہ اس تصویر پر نظر پڑی۔ وہ اس وقت اتنی حسین لگ رہی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا' میرے دل میں ایک ہلچل سی مچ گئی' اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس تصویر کا بوسہ لے لیا۔ اور دوسرے ہی لمحے میں خوف سے چلا اٹھا۔ گلشن...... لکڑی کے فریم سے باہر آ رہی تھی۔ وہ اب ایک زندہ عورت تھی اور میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ برابر مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈر کے مارے میرے پسینے چھوٹ گئے اور پھر فضا میں جیسے نقرئی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ گلشن نے اپنے نازک لبوں کو جنبش دی اور کہا۔

"ساحل! گھبراؤ نہیں میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ میں تمہاری زندگی ہوں' مجھ سے ڈرو نہیں۔" اس کی یہ باتیں سن کر میرا خوف کچھ کم ہوا اور میں نے پوچھا۔

"تم...... تم کون ہو؟"

اس نے ایک مدھم قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ساحل! میں ہوں تمہارے خوابوں کی شہزادی' تمہارے تخیل کی شہزادی' کیا تم مجھ سے خوفزدہ ہو؟"

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... نہیں تو...... مگر تم زندہ کیسے ہو گئیں؟ تم تو ایک تصویر تھیں۔" گلشن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ساحل' اب تم نے مجھے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ میں ابد تک زندہ رہوں گی اور صرف تمہاری رہوں گی۔ مگر میری زندگی صرف رات کے اندھیرے تک ہو گی۔ صبح ہونے سے پہلے میں پھ

سی فریم میں چلی جاؤں گی اور ایک تصویر بن جاؤں گی۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے مجھے تم سے محبت ہے۔" یہ کہہ کر گلشن آگے بڑھی۔ اب میرا ڈر بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ اس نے میرے سینے سے اپنا سر ٹکا دیا۔ پھر ہم دیر تک پیار محبت کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والی خوشبو نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد وہ کہنے لگی اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ اب میں کل آؤں گی۔ وہ اٹھی اور پھر اسی فریم میں چلی گئی۔ اب وہاں پر وہی بے جان مگر مسکراتی گلشن کھڑی تھی۔

میں اس رات بڑی مشکل سے سویا۔ گلشن کی محبت نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ ان ہی خیالوں میں گم نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح سورج کی روشن کرنوں نے میرا استقبال کیا اور میں اٹھ بیٹھا' سامنے جیسے ہی گلشن کی تصویر پر نظر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے چوم لیا۔ ناشتہ کر کے میں تمہیں یہ خبر سنانے آنے ہی والا تھا مگر ہر بار گلشن کی تصویر پر نظر پڑتے ہی میں وہیں بیٹھ جاتا اور اسے دیکھتا رہتا۔ اور پھر میں نے باہر جانے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ دن کس قیامت سے گزرا میں تمہیں کیا بتاؤں' شام ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ آخر اندھیرا پھیلنا شروع ہوا۔ میں نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور ایک عمدہ خوشبو لگا کر گلشن کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی معلوم ہو رہا تھا اور پھر نو بجے گلشن اس فریم سے باہر نکلی۔ ہم پیار محبت کی باتیں کرنے لگے' باتوں باتوں میں گلشن نے کہا۔

"ساحل! تم میری ایک بات مان
میں نے کہا۔
"گلشن...... تم کہو میں تمہاری ہر بات
گا۔"
"تم تصویریں بنانا چھوڑ دو۔" گلشن
لہجے میں بولی۔
"لیکن پھر میرا گزارہ کیسے ہوگا' می
کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے جواب دیا۔
"تم اس کی فکر نہ کرو' اس کا بھی
ہو جائے گا۔" گلشن نے جواب دیا۔ میں
کی اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ پھر وہ ف
واپس چلی گئی اور میں نیند کی آغوش میں چا
"یہ ہے وہ بات جس کی وجہ سے تم مجھ
پا رہے ہو۔" ساحل نے اپنی ناقابل فہم
ختم کی۔ مگر میں نے اسے ماننے سے انکار
"یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لگتا ہے تمہارے
کوئی اثر ہو گیا ہے...... اسی وجہ سے
نے...... کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ مگر ساحل
زور دیتا رہا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے ا
اس نے اس بات پر بہت زور دیا اور ک
رات کو زندہ ہو جاتی ہے تو میں نے حسب
کہا۔
"تم شرط لگا لو۔"
"یار تم بھی عجیب ہو' میں دو راتیں اس
باتیں کر چکا ہوں اور تم ہو کہ شرط لگانے
بیٹھے ہو۔" اس نے کہا' میں نے آخر
استعمال کیا اور کہا۔
"چلو آج کی رات میں تمہارے ہاں
گا اور دیکھوں گا کہ وہ کیسے زندہ ہوتی ہے؟
ساحل کچھ دیر سوچتا رہا اور بولا۔
"دیکھو ندیم' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

شاید وہ اسے پسند نہ کرے میں آج رات اس سے پوچھ کر کل تمہیں ساتھ لے چلوں گا' مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہ کرے گی۔"

میں ساحل کی اس بدلتی کیفیت پر حیران رہ گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ساحل نے مجھے خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔ کیونکہ اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور میں دیر تک ان ہی کے بارے میں سوچتا رہا کہ آیا گلشن واقعی زندہ ہوتی ہے یا ساحل نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ساحل پر مجھے یقین تو تھا۔ مگر عورت کے معاملے میں بڑے بڑے لوگ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں اور اگر ایسا ہے کہ گلشن واقعی زندہ ہوتی ہے اور ساحل کو اپنے قرب سے نوازتی ہے تو ساحل بہت خوش قسمت ہے کیونکہ اس قدر حسین عورت شاید ہی دنیا میں کوئی اور ہو۔ وہ دن مجھ سے مشکل سے کٹا۔ مگر پھر بھی مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر گلشن نے انکار کر دیا تو......اور پھر میں نے ایک اور منصوبہ سوچ لیا۔

بہرصورت چار بجے ساحل آیا وہ بہت ہی مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیوں ساحل...... تم نے گلشن سے ذکر کیا؟" مگر ساحل نے میری بات اَن سنی کر کے اپنی بات شروع کر دی اور بولا۔

"ندیم' اب تمہیں ہر حال میں میری مدد کرنی ہوگی۔" میں نے پوچھا۔

"کیسی مدد؟" ساحل نے اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل میں گلشن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کل ہم دونوں نے آپس میں فیصلہ کیا تھا۔ ندیم تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ کتنی حسین۔"

میں چونکا گیا۔

"لیکن میں یہ کیسے یقین کرلوں کہ رات کو ایک تصویر میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ ہو جاتی ہے دیکھے بغیر تو کوئی بھی اسے ماننے سے انکار کر دے گا۔"

ساحل کہنے لگا۔

"ہاں ہاں...... آج تم میرے ساتھ چلو' وہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ مگر وعدہ کرو کہ اس کے بعد میری مدد کرو گے۔"

اگر وہ واقعی زندہ ہوتی ہے اور ایک عورت کے جذبات رکھتی ہے تو میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔" میں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

پانچ بجے ہم ساحل کے گھر میں تھے۔ جیسے ہی میری نظر اس تصویر پر پڑی۔ میرے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی اب وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا اور ساحل پر رشک کرتا رہا۔ وہ واقعی بہت خوش قسمت تھا۔ کافی دیر تک میں تصویر میں کھویا رہا۔

ساحل نے میرا سکوت توڑا اور بولا۔

"کچھ رات کے لیے بھی باقی رہنے دو۔"

آج ساحل سے زیادہ مجھے گلشن کا انتظار رہتا' اور ساحل نے بھی میری اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد گلشن اس لکڑی کے فریم سے مسکراتی ہوئی باہر نکلی۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اطمینان رکھو' یہ تمہیں کھا نہیں جائے گی۔"

اور پھر ساحل نے گلشن کو مخاطب کیا۔

"گلشن...... ان سے ملو یہ میرے دوست ندیم ہیں۔ جن کا ذکر میں نے کل تم سے کیا تھا۔"

اور ندیم یہ ہیں تمہاری ہونے والی بھابی گلشن۔"

اشارہ میری طرف تھا۔ ساحل کی اس بات سے گلشن کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ میں نے خوفزدہ انداز میں اس سے خیریت پوچھی اور گلشن نے مسکراتے ہوئے مناسب جواب دیا۔ کچھ دیر تو میں اجنبی سا بن کر بیٹھا رہا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا خوف ختم ہوگیا۔ رات بارہ بجے تک ہم تینوں قہقہے لگاتے رہے گلشن کے الفاظ میں نہ جانے کا جادو تھا کہ وہ مجھے اپنے دل میں اترتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ ایسی خوش فہمی اکثر لوگوں کو ہوجاتی ہے۔ مگر گلشن اب ساحل کی ملکیت ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی بننے والی تھی۔

باتوں باتوں میں' میں نے ساحل سے پوچھا۔

"ہاں یار تم کس سلسلے میں میری مدد چاہتے تھے۔" ساحل بولا۔

"جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں گلشن سے شادی کرنے والا ہوں تم کسی نکاح خواں کا انتظام کردو جو تمہاری موجودگی میں ہمارا نکاح پڑھا دے اور ہاں نکاح خواں کو رات کو لانا ہوگا۔ تاکہ گلشن موجود ہو۔"

"تو یہ معاملہ ہے۔" میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں کیا مشکل ہے میں کل ہی کسی نکاح خواں کو لے آؤں گا تم تیار رہنا' اور آپ بھی۔" میں نے گلشن کو مخاطب کرکے کہا تو وہ شرم سے گلنار ہوگئی۔ رات کے دو بجے ہم سونے کی تیاری کرنے لگے..... گلشن بھی خدا حافظ کہہ کر فریم میں داخل ہوگئی۔ میں اور ساحل اسی کمرے میں سوگئے۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز میں کہیں نہ کہیں سے
خواں کو لے آئی اور پھر ساحل اور گ
ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ ساحل
تصویر سے شادی کی تھی میں اب بھی
پریشان ہوجاتا ہوں اس کے بعد بھی
سے ملتا رہا' میں کبھی اس کے ہاں بھی ج
شام ہوتے ہی میں لوٹ آتا ایک دن
ساحل سے کہا۔

"یار جب گلشن موجود ہی تھی تمہار
پھر تمہیں شادی کی ضرورت کیوں محسوس
"نہیں ندیم...... وہ ایک عورت
نے اس سے نکاح کرکے سنت ادا کی
شاید میں گناہ گار ہوجاتا۔" تین ماہ اسی
گئے...... ایک دن اخبار میں یہ اشتہار چھ
صاحب کو ایک قد آدم تصویر کی ضرورت
خوفناک حد تک خوفناک ہو...... اچھی
قیمت کے علاوہ انعام بھی دیا جائے گا۔
اس کا ذکر ساحل سے کیا۔ تو اس نے
تصویر بنانی شروع کردی۔

ایک ہفتہ بعد میری ملاقات ساحل
تو اس کی شکل سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔
کی طرح پیلا تھا اور آنکھوں کے گرد گڑھے
تھے۔ میں نے اس کی یہ حالت دیکھی ت
ہوگیا اور بے تابی سے پوچھا۔

"ساحل یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"
تھا کہ یہ سب کچھ گلشن کی وجہ سے ہوا ہوگا۔

"ندیم! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں ک
تکلیف میں ہوں۔ اگر کچھ دن یہی کیفیت
ایک دن تم مجھے پہچان ہی نہ سکو گے۔" سا
دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"ساحل مجھے بتاؤ کیا مسئلہ ہے میں ا

نے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔
''نہیں ندیم' تم کچھ نہیں کرسکتے۔'' ساحل
داس لہجے میں جواب دیا۔
''کچھ منہ سے بھی بولو' میں تمہاری خاطر جان
سکتا ہوں کیونکہ تم میرے عزیز دوست ہو۔''
یہ سن کر ساحل نے گہری سانس لی اور بولا۔
''وہ خوفناک تصویر میں نے دو دن قبل مکمل
لی تھی میں نے سوچا۔ کل وہ اسی شخص کو دے
ں گا اور قسمت میں انعام ہوا تو مل جائے گا۔
رات کو جب میں اور گلشن پیار محبت کی باتیں
رہے تھے کہ 'کھڑ کھڑ' کی آرزو نے مجھے چونکا
۔ میں نے وقت تھا' بارہ بج گئے تھے۔ اس
ت کون آسکتا ہے۔ پھر میرا خیال فوراً تمہاری
ف گیا کہ شاید کوئی بہت ضروری بات ہو یہ
چ کر میں نے دروازہ کھولا۔ دوسرے ہی لمحے
ی اور گلشن کی چیخ نکل گئی۔ وہی خوفناک آدمی
رے سامنے کھڑا تھا اس کے چہرے پر وہی
یانک مسکراہٹ اور شیطانیت نمایاں تھی۔ جو
ں بڑی مشکل سے اس کے چہرے پر لایا تھا۔
ں نے ذراہمت کر کے کہا۔
''تم کون ہو؟''
اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
''میں وہی آدمی ہوں جسے تم نے تخلیق کیا ہے
یا جناب نے مجھے نہیں پہچانا؟'' میں نے خوفزدہ
ر کر کہا۔
''نہیں وہ تم نہیں ہوسکتے۔''
میں دوڑا دوڑا دوسرے کمرے میں گیا۔ اور
ر میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ فریم سے
سویر غائب تھی۔ میں ابھی اسی سوچ میں گم تھا کہ
ھے گلشن کی چیخ نے چونکا دیا میں بے اختیار اپنے
کمرے کی طرف لپکا اور پھر یہ دیکھ کر میرا خون

کھول اٹھا کہ اس خبیث نے گلشن کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ میں غصے سے بے قابو ہوگیا اور کسی شیر کی طرح جست لگا کر اس کی گردن دبوچ لی لیکن وہ مجھ سے زیادہ بڑا اور طاقتور تھا۔ اس نے مجھے اُٹھا کر مسہری پر پٹخ دیا اور پھر مسہری پر چڑھ کر مجھے دھنک ڈالا۔ اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے صبح کو ہوش آیا میں نے ذہن پر زور دیا اور گلشن کی طرف دیکھا وہ فریم میں موجود تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ وہ خوفناک تصویر بھی وہاں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر وہی شیطانی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ میں گھبرا سا گیا کہ جیسے یہ ابھی آگے بڑھ کر میری گردن دبوچ لے گا۔ میں سارا دن اس کے متعلق سوچتا رہا۔ میں نے سوچا شاید وہ آج نہ آئے...... مگر رات ہوئی گلشن فریم میں سے باہر نکلی اور مجھ سے کہنے لگی۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اب تصویر بنانا چھوڑ دو۔ مگر تم نے میری بات نہ مانی۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔'' میں نے معذرت کے انداز میں کہا۔

اتنے میں دروازے پر ہونے والی دستک نے ہم کو خوفزدہ کردیا۔ میں نے دروازہ نہ کھولا دستک جاری رہی اور پھر اگلے ہی لمحے دروازہ ایک زور دار دھماکے کے ساتھ کھل گیا۔ وہی خوفناک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گریبان سے پکڑا اور فرش پر پٹخ دیا اور میں بے ہوش ہوگیا۔

''اب تم بتاؤ ندیم تم اس سلسلے میں میرے لیے کیا کرسکتے ہو۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس واقعہ کی خبر کسی اور کو بھی ہو۔''

میں ساحل کی باتیں سن کر خوفزدہ ہوگیا مگر سوال میرے دوست کی زندگی کا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

''تم فکر نہ کرو، میں آج رات تمہارے پاس ٹھہروں گا اور دیکھوں گا کہ وہ تمہیں کیسے نقصان پہنچائے گا۔''

میں اور ساحل بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کررہے تھے۔ آٹھ بجے گلشن فریم سے باہر آئی۔ نو بجے دروازے پر دھما کہ ہوا اور دروازہ کھل گیا۔ آج تو اس نے دستک بھی نہ دی تھی۔ اسے دیکھ کر میں بھی خوفزدہ ہوگیا۔ مگر وہ وقت ڈرنے کا نہیں تھا۔ نہ جانے اس وقت مجھ میں اتنی پھرتی اور طاقت کہاں سے آ گئی۔ میں نے لپک کر لوہے کی موٹی سلاخ اٹھائی جو اسی مقصد کے لیے میں دن کو لایا تھا اور پھر ساحل کا بیڈروم اچھا خاصا میدان جنگ بن گیا میں اور ساحل اندھا دھند سلاخیں چلا رہے تھے۔ مگر وہ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا اور پھر اس نے پوری قوت سے ساحل کو لات ماری۔ ساحل لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے پوری قوت سے سلاخ اس کے سر پر دے ماری۔ اس کے سر سے خون کا فوراہ پھوٹ پڑا۔ ہم دیر تک لڑتے رہے اور پھر مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ ساحل ابھی تک بے سُدھ پڑا تھا۔ گلشن کی تصویر وہاں ہی موجود تھی لیکن اس پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی میں نے ساحل کو زبردستی جگایا اس کے تمام جسم میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اسے جو ضربیں لگی تھیں وہ کافی شدید تھیں میں نے اسے تسلی دی اور اس کے ہاتھ پاؤں دبانے لگا۔

کافی دیر بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اس

نے مجھے دوسرے کمرے میں
خوفناک تصویر دکھائی تو غصے میں میر
اٹھا۔ تصویر میں، میں نے ایک بات
محسوس کی وہ یہ کہ اس کے سر کے قریب
کی پتلی سی لکیر تھی۔ جو میری سمجھ م
ساحل نے بتایا کہ تم نے جو سلاخ اس
ماری تھی یہ اُسی کا خون ہے...... میں
انکشاف پر حیران رہ گیا۔

اب میں اس تصویر پر پٹرول چھڑ
میں نے اسے صحن میں رکھا اور تیلی دکھا

اُف خدایا...... بھیانک چیخوں
شروع ہوگیا۔ آج بھی وہ چیخیں دھیمی
میرے دماغ میں گونجتی ہیں تو میر
کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کافی دیر تک
گونجتی رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ تمام کراہ
نہ جانے کہاں ڈوب گئیں تصویر جل کر
تھی۔ یوں ساحل کو سکون مل گیا۔ اس
ساحل نے مجھے واپس نہ آنے دیا۔

میں بھی انکار نہ کرسکا۔ اس رات
ساحل اور گلشن دیر تک اسی بھیانک
بارے میں باتیں کرتے رہے میں
سے کہا۔

''ساحل، اب آئندہ تم کوئی تصو
خدا جانے تمہارے ہاتھ میں یہ مسیحائی
ہے۔'' اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ا
تصویر نہیں بنائے گا۔

دن گزرتے رہے اور ہم دونوں یو
رہے ایک دن ساحل نے مجھے بتایا ک
بننے والا ہے اور اس کے گھر ایک ننھا مہ
والا ہے۔ میرے لیے یہ بات نا قابل ی
دوسرے دن جب میں نے گلشن کی تصو

سر گھومنے لگا۔ وہاں اس کی تصویر میں اس کے ں کا حصہ غیر معمولی طور پر ابھرا ہوا تھا۔ میں اس ں خود کو کسی طلسمی محل میں کھڑا پا رہا تھا جہاں ہر ہر بات کسی طلسم سے کم نہ ہو حالانکہ یہ سب کچھ ے سامنے تھا۔ مگر میری عقل اسے تسلیم نہ رہی تھی آج بھی جب میں ان واقعات کا ں کرتا ہوں تو سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ میری دفتری روفیات کچھ بڑھ گئی تھیں اس لیے ساحل سے ملاقات کم ہی ہوتی تھی۔ ساحل نے مجھ سے ئی رابطہ نہ کیا تھا۔ اور نہ ہی ملنے آیا تھا' میں نے چا کہ شاید وہ بھی میری طرح کہیں مصروف ا۔ میں نے اگلے دن اس سے ملاقات کرنے ارادہ کر لیا۔

دوسرے دن میں حسب معمول دفتر پہنچا۔ ں اخبار پر نظر ڈالنے لگا تو ایک خبر پڑھ کر میری تو ن ہی نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا ر دل ڈوبنے لگا' سرخی تھی۔

'' ملک کے نوجوان مصور ساحل نے خودکشی ر لی۔'' اس روز فروری کی 28 تاریخ تھی۔ خبر ے ساتھ ساحل کی تصویر بھی لگی۔ میں پوری خبر نہ ھ سکا۔ اور میرا ذہن اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب یا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اپنے سیکریٹری کو اپنے پر جھکے ہوئے پایا میرے گرد آفس کے دیگر ل بھی کھڑے تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کریٹری نے پوچھا۔

'' سر اب طبیعت کیسی ہے؟''

اور پھر سارے واقعات میرے دماغ میں گھوم گئے۔ میں نے نخیف آواز میں کہا۔

'' میں اب بالکل ٹھیک ہوں بس ذرا چکر گیا تھا۔'' مگر ان سب کو حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ساحل میرا گہرا دوست تھا۔ اخبار میرے سامنے پڑا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

'' میں بالکل ٹھیک ہوں' اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔'' وہ چلے گئے تو میں آفس سے باہر آ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ اور یہ سوال ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

'' ساحل جیسے زندہ دل آدمی نے خودکشی کیوں کی؟''

میں ساحل کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اس کے گھر کے باہر محلہ کے لوگ جمع تھے۔ پولیس والے بھی موجود تھے۔ مجھے وہاں میرے نام کا ایک پیکٹ ملا۔ جو میں نے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ اور پھر مجھے ایک دھچکا لگا۔ چھت کے بیچوں بیچ رسی کا پھندا لٹک رہا تھا۔ ساتھ ہی مسہری پر ساحل لیٹا ابدی نیند سو رہا تھا۔

میرا دوست...... میرا ساتھی...... میرا ہمدرد......

میں نے چادر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا اور پھر صبر کا دامن مجھ سے چھوٹ گیا۔ میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں میں دیر تک اس کی مسہری کی پٹی پر سر رکھے روتا رہا کہ میرا دوست مجھ سے بہت دور جا چکا تھا۔ مجھے گزری ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اور آنسو رُکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ کافی دیر بعد میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور گھوم کر گلشن کی تصویر کو دیکھا تو میرے ذہن پر بجلی سی گری گلشن کی تصویر جوں کی توں موجود تھی۔ مگر اس کے ساتھ اتنی ہی بڑی تصویر ساحل کی بھی لگی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ جو میں نے اس سوگوار فضا میں بھی محسوس کر لیا۔ میں نے ساحل کو دیکھا اور

پھر اس کی تصویر کو دیکھا ان دونوں میں ذرا برابر بھی فرق نہ تھا۔ پھر مجھے اس پیکٹ کا خیال آیا۔ جو میرے نام تھا اور ساحل میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ میں نے ساحل کی سرد لاش کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا اور گھر لوٹ آیا۔ اس وقت میری حالت اس مریض کی سی تھی جو ایک طویل بیماری کے بعد بستر سے اٹھا ہو...... گھر پہنچ کر میں نے پیکٹ کھولا مجھے معلوم تھا کہ اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو میں جاننے کے لیے بے قرار ہوں۔ میں نے اس میں موجود خط کو پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

''پیارے دوست ندیم! سدا خوش رہو۔''

''جس وقت تم یہ تحریر پڑھ رہے ہوں گے۔ میں تم سے بہت دور جا چکا ہوں گا' مگر تم میرے بچھڑنے کا افسوس نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے لیے یہ مشکل ہوگا۔ لیکن کیا کروں' میں اپنی زندگی کیوں ختم کر رہا ہوں' یہی بتانے کے لیے تم سے مخاطب ہوں میرے دن گلشن کے ہمراہ مزے سے گزر رہے تھے۔ اس خوفناک آدمی کے مرنے کے بعد ہماری محبت میں اضافہ ہوگیا تھا ایک دن گلشن مجھے کہنے لگی۔''

''ساحل! تم نے طرح طرح کی تصویریں بنائی ہیں کیا تم نے کبھی اپنی تصویر بھی بنائی ہے؟''

''نہیں گلشن...... میں نے آج تک اپنی تصویر نہیں بنائی۔''

''تو پھر میرے کہنے پر تمہیں اپنی ایک خوبصورت سی تصویر بنانی ہوگی۔'' گلشن نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں گلشن؟'' میں نے سوال کیا۔

''بس میرا جی چاہتا ہے تم اپنی بھی ایک خوبصورت سی تصویر بناؤ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گلشن تمہیں معلوم ہے کہ ندیم
تصویریں بنانے سے منع کر دیا ہے او
کر چکی ہو۔ اس لیے میں مجبور ہوں ک
بنا سکتا۔'' میں نے مجبوری ظاہر کی۔

گلشن نے ناراض ہوتے ہوئے ک

''کیا تم میری اتنی سی خواہش بھی
کروگے۔''

میں نے لاکھ انکار کیا۔ مگر اس ک
آگے جھکنا پڑا۔ کاش میں ایسا نہ کرتا' م
ہی دن میں نے اپنی تصویر بنانی شروع ک
سارا دن میں تصویر ہی بناتا رہتا۔ او
دن بعد تصویر مکمل ہوگئی۔ میں نے اس ک
راحیل رکھا۔ تم یقیناً میری تصویر دیکھو
میں اور مجھ میں کوئی فرق محسوس نہیں کرو
تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میرے ہاتھ
آگئی ہے۔ اس تصویر کو میں نے گلشن کی
برابر لگا دیا۔ تین دن کی مسلسل محنت سے
چکا تھا۔ اور اب اپنے دماغ کو سکون
تھا۔ اس لیے میں نے تفریح کا پروگرا
چل پڑا تمہیں لینا اس لیے مناسب ن
صروف ہوگئے۔ نہ جانے کہاں کہاں گھ
فلم کا آخری شو دیکھ کر گھر چل دیا۔ او
میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے وہ م
گیا۔ گلشن ایک مرد کے ہمراہ راز و
تھی۔ میرا خون کھول اٹھا میں نے گلش
زور سے آواز دی کہ وہ دونوں گھبرا کر
اور پھر میری آواز میرے حلق میں آ گئی
ہی تھا' میں نے گھوم کر تصویر کی طرف د
ساری بات میری سمجھ میں آگئی میری تص
سے غائب تھی گلشن راحیل کے سینے
اور بولی۔

''کیا بات ہے ساحل؟''
''یہ کون ہے؟'' میں نے بڑی مشکل سے کہا۔
''ساحل یہ تم ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
''میں ...... نہیں ...... نہیں ...... یہ میں نہیں ہوں۔'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔
''ساحل ...... یہ تم ہی ہو۔'' وہ پیار بھرے انداز میں بولی۔
''ساحل یہ تم ہی ہو ...... پہلے تمہاری زندگی محدود تھی۔ مگر اب تم نے خود کو لازوال بنالیا ہے۔ تم ابد تک کے لیے زندہ جاوید ہوگئے ہو یہ تم ہی ہو' اور اب میں اور راحیل ایک ہی شخص کی تخلیق ہونے کی وجہ سے ایک ہی ذات کے ہوگئے ہیں۔ اب ہم دونوں ابد تک زندہ رہیں گے۔ میں راحیل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر تم نے غصے میں آ کر کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو پھر مجھ سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اب میں اور راحیل ایک بدن دو قالب ہوگئے ہیں۔''
میں نے روہنسا ہو کر کہا۔
''نہیں گلشن ...... یہ میں نہیں میری تصویر ہے ...... میں تو یہاں ہوں ...... تم میری بیوی ہو میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''
''ہاں میں تمہاری بیوی ہوں۔'' گلشن بولی۔ ''مگر یہ بھی تم ہو۔''
میرے دماغ پر ہتھوڑے چلنے لگے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے' وہ دونوں فریم میں چلے گئے۔ وہ رات میں نے کانٹوں پر بسر کی۔ مجھے گلشن کے جدا ہونے کا شدت سے غم تھا اب وہ مجھ سے بچھڑ چکی تھی۔ اگلا دن میں نے بڑی مشکل سے گزارا۔ رات ہوئی تو میں حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اور پھر گلشن اور راحیل

جب جاگ گیا وہ

بنائی میں نے اِک تصویر

بہت سارا وقت لگا کر

پھر جاگ گیا وہ

پہلے دِن غائب ہوگیا آسمان

دوسرے دِن پہاڑ

چوتھے دِن جنگل

پانچویں دِن تُم

اور چھٹے دِن میں

ایک سفید کاغذ باقی رہ گیا فریم میں

دیوار پر سجا

پھر آرام کیا اُس نے ساتویں دن

اور میں بھی سوگئی

خواجہ حیدر علوی

فریم سے نکلے' اور ایک دوسرے میں کھو گئے' میں نے گلشن کو مخاطب کر کے کہا۔

''گلشن کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

'' راحیل...... میں اور تم سے ناراض ہوں گی۔ نہیں راحیل...... اب میں اور تم ابد تک ایک دوسرے کے ہیں۔'' میں بے خودی میں گلشن کی طرف بڑھا تو وہ بولی۔

''نہیں ساحل...... اب یہ نہیں ہوسکتا...... اب راحیل میرا جیون ساتھی ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''تو کیا تم میرے قریب نہ آؤ گی میرے سینے سے نہ لگو گی۔''

'' کیوں نہیں ساحل......'' اس نے راحیل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

'' یہ بھی تو تم ہی ہو' اب میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

مجھے غصے آ گیا...... میں نے کہا۔

'' اگر تم میرے پاس نہ رہیں تو میں کل اپنی تصویر کو جلا ڈالوں گا۔'' گلشن افسردگی سے بولی۔

'' تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ اس دن میں تم سے بہت دور چلی جاؤں گی اور پھر تم بھی میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکو گے' ساحل...... تمہیں میں کیسے بتاؤں کہ یہ تم ہی ہو۔''

''میں مایوس ہو کر دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اور پھر میں نے یہ بھیانک فیصلہ کرلیا کیونکہ میں گلشن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ان دنوں میری حالت کیا ہو چکی تھی۔ یہ میں ہی جانتا ہوں گلشن کے بغیر زندگی بے مقصد ہو چکی تھی میں نے اپنے دل کو ہزار تسلیاں دیں مگر وہ سب جھوٹی ثابت ہوئیں۔ دوسرے دن میں نے ایک اور

وہ زندہ نہ ہوئی یہ آخری کرن بھی ختم ہوگئی
میری مسیحائی ختم ہوگئی تھی۔ اب میرے سا
راستہ نہ تھا۔ یہ دن میں نے گلشن کے بغ
گزرے' میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں ہر لمح
میں مبتلا تھا۔ میں گلشن کو دیکھ سکتا تھا مگر اسے
سے نہیں لگا سکتا تھا حالانکہ وہ میری بیوی تھی
میں نے راحیل کی خاطر اپنی جان داؤ پر لگ
فیصلہ کرلیا کیونکہ وہ بھی میں ہی تھا۔''

''ندیم تم میرے عزیز دوست ہو کیا تم
ایک ضرورت پوری کرو گے میرے مر
بعد ان تصویروں کو آرٹ گیلری میں ساتھ
رکھوا دینا اور یہ خیال رہے کہ انہیں کوئی نہ خر
یہ ابد تک وہاں لگی رہیں تاکہ وہ دونوں بھی ا
زندہ رہیں شاید اس سے میری بے چین ر
قرار ملے۔ اچھا میرے دوست میری غلط
معاف کر دینا' اور میرے سکون کے
کرنا۔ آخری سلام...... تمہارا ساحل......''

☆......☆......☆

میں خط پڑھتا رہا اور میرے آنس
رہے۔ ساحل نے گلشن کی خاطر کتنی بڑی
دی یہ وہی جانتا ہے میں نے ساحل کی
پوری کر کے وہ شہر چھوڑ دیا جہاں کبھی میر
ساحل کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔ آج اس
34 برس گزر چکے ہیں۔ شاید اب بھی رات
اندھیرے میں راحیل اور گلشن فریم سے باہر
ایک دوسرے کو ملتے ہوں اور ان کے دھیمے
قہقہے گونجتے ہوں۔ کبھی کبھی جی چاہتا
واپس اپنے سابقہ شہر جاؤں اور آرٹ گیلر
جا کر ان تصویروں کو دیکھوں' مگر میں پھر
ملتوی کر دیتا ہوں۔



وہ حسینہ اس نوجوان کی دادرسی کے لیے آئی تھی کہ
کہیں وہ نامراد ہو کر اپنے ایمان سے نہ چلا جائے......

مہر پرویز احمد

"لڑکے بالے" لفظ ہم نے اس وقت پڑھا تھا جب ہم ننکے نکے ہوتے تھے۔ گھر کے سکھ، ماں کے پیار، باپ کے لاڈ اور ہم عمر دوستوں کی محفلوں کو چھوڑ کر جہنم نما قید خانے جانا پڑتا تھا۔ جسے اس وقت سے لے کر آج تک "سکول" کے نام سے پکارتے ہیں۔

وہاں جلاد صفت نوجوان ہوتے تھے جو ہمیشہ نہا دھو کر، صاف ستھرا لباس پہن کر، خوشبو لگا کر تازہ دم ہو کر آتے تھے۔ شکل وصورت سے وہ کسی طور پر جلاد نظر نہیں آتے تھے مگر جب ہم کبھی سبق یاد کر کے نہ آتے تھے یا گھر کا دیا کام نہ کر کے لاتے تھے تو وہ ہماری حیثیت، برداشت اور صحت کے مطابق سزا دیتے تھے۔

اس عمل کی وجہ سے اسکول میں نکھٹو طلباء جو گھر کا کام کاج، ڈھور ڈنگر چرانے کے عذاب، چارہ کاٹنے، فصلوں کی گوڈی کی ذلت سے بچنے کے لیے اسکول میں وقت ضائع کرنے آتے تھے

سبق یاد نہ کرنے کی اور کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی اور اس پر پوری طرح کاربند تھے۔ اس کارِ خیر کا صلہ ان کو مولا بخش کی تواضع کی صورت میں ملتا۔ مولا بخش کی مدد سے انکے جسموں پر لمبی لکیریں بن جاتیں۔

بدلے میں وہ لوگ دل سے تو پتہ نہیں کیا کہتے لیکن کھلے عام جلاد کے لقب سے پکارتے تھے۔ انکی پیروی کرتے ہوئے ہم نے بھی اپنے روحانی باپ، محترم اساتذہ کرام کو جو ایک طالب علم کو زمین سے اٹھا کر اوج پر پہنچاتے ہیں جلاد کہنا شروع کر دیا۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں ہمارا جرم نہ تھا۔ بچے تو بندروں کی طرح نقال ہوتے ہیں اور پھر شیطانی عمل میں کشش بھی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے بچے جلدی سیکھ جاتے ہیں۔

اس وقت ایک دن نظم پڑھانے کے دوران استاد صاحب نے لفظ "لڑکے بالے" بولا تھا۔

صاحب تو دور کہیں دوسرے گاؤں سے ایک پھٹیچر سی سائیکل پر آتے ہیں جو چلنے کے دوران چیں چیں کر کے سفر کم طے کرتی ہے اور بین کر کے روتی زیادہ ہے۔ وہ تو ہمارے گاؤں کے کسی مرد و زن کو نہیں جانتے، مگر جب انہوں نے ''لڑکے بالے'' پڑھایا تو میں سمجھا کہ لڑکے کے ساتھ ''بالے'' کا مطلب خالہ زرینہ کے بیٹے کا نام لیا ہے، جو مست ہے اور گاؤں میں گرمی ہو یا سردی، چوک پر بیٹھ کر ہر گزرنے والے، یا والی کو گالیاں دیتا تھا۔ جب بھی وہ گالی دیتا، خواتین کے سینے خوشی سے پھول جاتے۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کر

جس خاتون کو زیادہ گالیاں ملتیں اسکی فخر سے تن جاتی، غرور دیکھنے کے قابل دوسری خواتین اس پر رشک کرتیں، جبکہ و سال منے کی ماں بننے کا یقین دل میں بٹھ ساتھی خواتین اس کو مبارک باد دیتیں، کچھ دل ہی دل میں اس عورت سے حسد لگتیں اور بالے کو برا بھلا کہہ کر غصہ نکالتیں

''ہمیں گالیاں دے کر اعزاز کیوں بخشتا۔''



میں بہت حیران ہوا کہ استاد جی ''بالے'' کو کیسے جانتے ہیں۔ پھر دل میں خیال پیدا ہوا۔

''شاید استانی جی بھی بالے سے گالیاں سننے آئی ہوں اور ان گالیوں کے طفیل اسکی گود ہری ہوئی ہو۔ اسکی کرامت کا ذکر انہوں نے استاد جی سے کیا ہو۔''

استاد جی کی زبان سے بالے کا نام سن کر میں بھی اسکی کرامت کا معترف ہو گیا۔

لیکن بالے کی کرامت کا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب کچھ دنوں بعد ایک دوسرے استاد صاحب نے ہمیں اردو کی گرامر پڑھائی اور کلمہ اور مہمل کی تعریف بتائی۔

انہوں نے کہا کہ ''لڑکے کے ساتھ لگنے والا لفظ بالے مہمل ہے یعنی اس کے کوئی معنی نہیں۔ یہ لفظ تو لڑکے کو خوبصورت اور باوزن بنانے کے لیے ساتھ لگایا جاتا ہے۔''

یہ سنتے ہی مجھے بالا ایک نمبر کا فراڈیا لگا جو محض من کے رانجھا کا راضی کے لیے چوراہے پر جہاں سے خواتین زیادہ گزرتیں تھیں، جان بوجھ کر بیٹھتا تھا۔ ہم گاؤں کے لڑکے بھی بالے کی طرح ''مہمل'' تھے۔ ہم شمار میں تو آتے تھے لیکن اہمیت کوئی نہیں تھی جبکہ اصل بچے، شہزادے اور خوبصورت دوشیزائیں جیسے حسین لفظ گاؤں کے وڈیرے کی اونچی دیواروں والی حویلی کے اندر زندگی کا مذاق اڑانے والے کے لیے مخصوص تھے۔

میرا شمار بھی مہملوں میں ہوتا تھا، لیکن میں اپنی اہمیت بھول گیا۔ مہمل کی بجائے کلمہ بننے کی کوشش کی۔ لیکن جیسے کوا ہنس نہیں بن سکتا، بھڑ پتنگا نہیں بن سکتا، غریب آدمی سیاستدان نہیں بن سکتا، رشوت اور سفارش کے بغیر کوئی سرکاری ملازم نہیں بن سکتا۔ ایسے ہی میں بھی مہمل سے کلمہ نہیں بن سکتا۔

مگر دل کب کسی کی مانتا ہے وہ تو اپنا حکم چلا ہے۔ میں بھی اسکے بہکاوے میں آکر عشق ومعشوقی، پیار محبت اور چاہت کا جذبہ دل میں مچلنے لگا۔

جذبات کی تسکین اور خواہشات کی تسکین کے لیے بہت سی لڑکیوں پر دوڑے ڈالے، مگر کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔ دکھ کی بات تو ہے کہ حویلی میں تو بڑے لوگ رہتے تھے جن کو خوبصورت اور باوزن بنانے کے لیے ہم مہملو کو استعمال کیا جاتا تھا مگر حویلی والوں کی دیکھا دیکھی حویلی کی خوبصورت دوشیزاؤں کی ت سجانے والی، انکے پاؤں دبانے والی، جھاڑ پونچھ صفائی ستھرائی کرنے والی، کپڑے دھو کر استر کرنے والی، بالوں میں بائیو آملہ ہیئر ٹانک لگانے والی، تسمے والے بوٹ پالش کرنے وا اور پہنانے والی بانکی ناریوں کے نخرے بھی بادلوں سے آگے خلاء تک پہنچے ہوئے تھے۔

گاؤں کی تمام صنف نازک حویلی کی ملکا سے لے کر کھیتوں میں سے جڑی بوٹیاں کاٹ کر بکریوں کو ڈالنے والی تک کی نگاہوں میں ہم سب لڑکے مہمل تھے۔

مایوسیوں کی دھند نے چھا کر جب کہر کی چادر کے نیچے جذبات کو مونگ پھلی والا گڑ کھا سونے پر مجبور کر دیا تو میں نے بھی نا چاہتے ہو دل پر پتھر رکھ کر یہ فرض کر لیا کہ یہ جتنی بھی لڑکیا جو گلیوں بازاروں میں آتی جاتی ہیں، جن کی و سے بازاروں کا ماحول سرسوں کے کھیت سا بنا ہے۔ جہاں رنگ برنگی تتلیاں اور چھوٹی بڑی ش کی مکھیاں ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول

جا کر رنگوں کو قوس بنا دیتی ہیں ۔ یہ اڑنے والی مخلوق مختلف خوبصورت رنگوں کا حسین امتزاج قدرت کا شاہکار عجوبہ ہیں۔ جبکہ گاؤں کی مغرور لڑکیاں، کچن میں پھرنے والے لال بیگ اور ٹڈیوں کی مانند ہیں جن کا کام کھانے پینے کی چیزوں کو پہلے کھا کر یا سونگھ کر جھوٹا کرنا ہوتا ہے۔ خود تو نکھٹو ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی جس چیز کے پاس جاتے ہیں اسے بھی ناقابل استعمال بنا دیتے ہیں۔

انہیں کچن کے کھانوں کو خراب کرنے والے حشرات الارض کی طرح یہ نیلی آنکھوں، لمبے سیاہ بالوں، ہرنی کی چال والیوں نے بھی گاؤں کے خوبصوت کڑیل نوجوانوں کی صحت منداور تازہ دم سوچوں کو بیکٹیریا والے کھانوں اور دہی کی طرح کھٹا کر رکھا ہے۔ ان فضول لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر مجھے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے ۔ وگرنہ آوارہ پھرنے سے روٹی کے لالے پڑ جائیں گے، گھر کی چھتوں اور کواڑوں میں جالے پڑ جائیں گے۔

پھر میں نے نفرت کی انتہا کر دی ۔ان کو خوبصورت حسینہ کے بجائے بازار میں نقلی جھریوں والا چہرہ لگا کر مانگنے والی بھکارن، بھٹے پر اینٹیں نکالنے والی اور بھٹی پر مکئی کے دانے بھونے والی کالی کلوٹی پسینے سے شرابور، بو سے معمور بڑھیا تصور کرنے لگا۔

ان گاؤں کی بے موسم اڑنے والی تتلیوں کی نگاہ میں مہمل تھا۔ مگر جیسے گدڑی میں لال، سیپ میں موتی، پتھر میں ہیرا پہچانا جاتا ہے، ایسے ہی ایک حسینہ جو میرے گاؤں کی نہیں لگتی تھی۔ حسین اتنی کہ چاند بھی دیکھ کر شرما جائے۔ صراحی راد گردن، کالے سیاہ، گھٹا کی طرح لمبے بال اور رنگت ایسی کہ دیکھنے سے بھی میلی ہو جائے۔

مجھ میں نوجوانوں والا حسن و جمال، شہ
والا جاہ جلال اور کڑیل جوانی کو دیکھ کر
ہو گئی۔

گاؤں کی زندگی بھی ادھار لیے
پیسوں کی مانند ہوتی ہے۔ جن کو لینے والا
دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے، سو جھوٹ بول
مجبوری کے آنسو بہا کر جان چھڑانی پڑتی
پر کپڑا دینے والے پٹھانوں کی شر
اللہ بچائے۔

گرمی سردی میں دروازے پہ یوں آ
سے دستک دے کر پورے گھر کے درو
ہلاتے ہیں بشرط یہ کہ دیواریں اور درواز
جیسے رشوت نہ دینے پر ٹریفک سارجنٹ ر
ویگنوں کے ڈرائیوروں پر ٹوٹ پڑتے ہیں
سیرپ گولیاں اور انجکشن بیچنے والوں پر،
انسپکٹر، ریڑھی پر پھل بیچنے والوں پر بلدیہ
مفت گھر پر دودھ سپلائی نہ کرنے پر چیکنگ
اور مفت گھریلو سودا سلف نہ دینے
دکانداروں پر پرائس کنٹرول پر حملہ کرتے ہیں

اس طرح قرض دینے والوں کے بھی
اصول ہیں۔ مقررہ وعدے پر قرض واپس
والوں کو اٹھنی بھی ادھار کوئی نہیں دیتا ا
ہزاروں ادھار لے کر ڈکار لے کر ہضم کر جا
ان کو تلاش کر کے قرض دیتے ہیں۔
مقروض زندگی کو کونے کھدرے میں چھ
دنوں کی گنتی پوری کر رہا تھا کہ ایک دن اپنی
گائے کے لیے ایک بڑے سائیں جی
کھیتوں سے چوری کی، دوپہر کو چارہ کا
تھا کہ انتہائی سریلی آواز میں ایک پنجابی نغمہ
دیا۔

''سن ونجھلی دے مٹھڑی تان وے...... میں
تے ہو ہو گئی قربان وے۔''

مدھر سروں کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

مجھے گانوں کے بولوں کی خوشی کم اور چارے کے مالک کا خوف زیادہ تھا۔اس لیے خوف کی وجہ سے درانتی ہاتھ پر لگنے سے خون بہنے لگا۔اور مڑ کر پیچھے دیکھا تو ایسی خوبصورت حسین نوجوان گڑی کو دیکھ کر میرے ہاتھوں اور آنکھوں دونوں کے طوطے اڑ گئے۔

وہ مجھے یوں عقیدت اور محبت سے دیکھنے لگی جیسے میں کسی نگری کا شہزادہ ہوں اور وہ میری محفل میں آنے کے لیے اذن مانگ رہی ہو۔میں اس کے حسن کے دریا میں ایسا ڈوبا کہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا۔اسکی آنکھوں کے نشے نے چارہ وغیرہ بھلا دیا، میں ان آنکھوں میں ایسا کھویا کہ جب ہوش آیا تو خود کو گھر میں پایا۔

چارے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔اس نے پیار سے مجھے چارہ کاٹنے والی مشین کے آگے کر دیا۔مشین خوبخود چلنے لگی جبکہ وہ پیچھے کھڑے ہو کر مشین میں چارہ ڈالنے لگی۔لمحوں میں چارے کا ڈھیر لگ گیا۔اس نے کپڑے میں چارہ ڈال کر گائے کے آگے ڈالا، جبکہ میں اسکی حرکات وسکنات میں کھویا ہوا تھا۔

اسی دوران میری اور اس خوبصورت حسینہ کی بدقسمتی کی گاؤں کے وڈیرے کی اکلوتی نازنخرے والی، غرور وتکبر کا نمونہ بیٹی چھوٹی مالکن وہاں سے گاڑی میں گزری۔میری ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے صحن میں ایک خوبصورت دوشیزہ کو دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہوگئی۔

کے پاس کھڑی حسینہ کو نفرت سے اسکے پکڑا او
جھٹکا نما دھکا دیا۔بالوں سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے تھپڑ اس کے سیب کی طرح دہکتے گال پر مارنے کی کوشش کی، مگر یہ اسکی حسرت ہی رہی۔

حسینہ نے بال اسکی گرفت سے چھڑوائے او
بازو کو سختی سے پکڑا۔لال پیلی ہو کر غصے سے ڈھاری اور اس بدتمیزی کی وجہ پوچھی۔

''تم میرے گاؤں میں رہتی ہو، اس نکھٹو شخص کے پاس رہ رہی ہو، خوب بن سنور کر مجھ سے زیادہ خوبصورت بننے کی کوشش کر رہی ہو۔تمہیں میری حویلی میں جھاڑو دینا چاہیے، میرے جوتے صاف کرنے چاہیے، میرے سر میں تیل ڈال کر مالش کرنی چاہیے، میرے پاؤں دبانے چاہیے میں اس گاؤں کی واحد مالک ہوں۔

یہاں میرا حکم اور قانون چلتا ہے۔گاؤں کی ہر لڑکی کو حویلی میں کام کرنا پڑتا ہے۔لگتا ہے تم اپنے حسن کی وجہ سے میری حیثیت کو للکار رہی ہو۔تم اس پکوڑے کی ناک والے، کھٹمل کی مونچھوں والے، چمگادڑ کی شکل والے کے ساتھ گل چھڑے اڑا رہی ہو۔میں تو ایسے لوگوں کو اپنی حویلی کے پاس سے نہیں گزرنے دیتی۔یہاں جو ہوتا ہے میری مرضی سے ہوتا ہے۔'' چھوٹی مالکن غصے میں بول رہی تھی۔پھر اس نے ڈرائیور کو گاڑی سے پٹرول لانے کا کہا۔ڈرائیور نے پٹرول لا کر دیا تو اس نے پٹرول اس حسینہ کے منہ پر پھینک دیا۔

پٹرول گرتے ہی موتیے کے پھولوں میں تبدیل ہو گیا۔قطرے پتیوں میں تبدیل ہو گئے معطر خوشبوؤں نے سارا ماحول خوشبودار اور خوابیدہ کر دیا، اس حسینہ کا حسن اور نکھر گیا۔

اس اذیت نے جلتی پر تیل کا کام کیا، اسکا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔اس نے نفرت سے ایک بار پھر اس حسینہ کو چٹیا سے پکڑنا چاہا۔مگر اس نے مالکن کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے موڑ دیا۔اسی چیخ نکل گئی ،مگر اس حسینہ کو ترس نہ آیا۔اس نے اس پر لاتوں،مکوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

جس مالکن پر مکھی بھی بیٹھنے سے قبل ہزار بار سوچتی تھی،اس کی سر راہ ایک غریب نوجوان کے سامنے چھترول ہوئی۔میرے بھی ارمان پورے ہوگئے تھے،ایک طرف تو محبت کرنے والی لڑکی مل گئی تھی اور دوسری طرف گاؤں کی مغرور لڑکی کا غرور میرے سامنے خاک میں مل گیا۔

مالکن غصے میں بھری گالیاں بکتی گاڑی میں بیٹھی اور چلتی بنی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک لاؤ لشکر میری جھونپڑی پر حملہ آور ہوا۔میری مشکیں کس کر باندھ دی گئی۔ایک گدھے پر بٹھا کر حویلی کی طرف لے جایا گیا جبکہ اس دوران وہ حسینہ کہیں غائب ہوگئی۔

حویلی سے متصل ڈیرے میں مجھے لایا گیا، ہاں وڈیرہ سائیں مونچھوں کو سرسوں کا تیل لگا کر چمکائے بیٹھا تھا۔مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔

پولیس کا چھتر منگوایا گیا جس کے اوپر لکھا تھا

''چن کتھاں گزاری ہے ای رات وے''

مارنے والے نے چھتر ہوا میں لہرایا ہی تھا کہ وہ سیاہ ناگ بن گیا۔جس نے بھی اسے دیکھا س کے پسینے چھوٹ گئے۔جو میرا تماشہ دیکھنے آئے تھے وہ خود تماشہ بن گئے۔ڈیرے سے باہر بھاگنے لگے تو دروازہ بند پایا،جبکہ اسکے سامنے وہی حسینہ چمڑے کا کوڑا لیے کھڑی تھی،قریب آنے والوں پر کوڑے برسانے لگی۔

لوگوں کی دھلائی اور بھاگ دوڑ سے جنگ کا منظر اختیار کر گیا۔لوگ تھک ہار کر حسینہ کے پاؤں پڑ کر معافی مانگنے لگے۔

دنیا دار فرعون مجبور لوگوں کی بے بسی فائدہ اٹھاتے ہیں،ان کا مذاق اڑاتے ہیں پتھر سے بھی سخت کر لیتے ہیں،کسی بھی مجبور دبکا،منت سماجت اور گریہ گزاری ان کو مو کر سکتی۔مگر اس حسینہ نے جب اتنے لوگو انتہائی لاچارگی کی حالت میں دیکھا تو اسے آ گیا۔سب کو معاف کر دیا اور انہیں ڈیرے نکلنے کی اجازت دے دی۔

کچھ دیر بعد وہ حسینہ حویلی میں تھی۔اسکے پہنچتے ہی حویلی سے دھوئیں کے اٹھنے لگے،جبکہ جس کمرہ خاص میں چھوٹی خواتین سے سر میں مالش کروا رہی تھی، ا چھت اور فرش اچانک تپنے شروع ہو گئے۔ خواتین گرمی سے گھبرا کر باہر بھاگ گئیں۔

جب مالکن نے باہر نکلنا چاہا تو سامنے آ گئی،بالوں سے پکڑ کر جھٹکے دیئے اور واپس طرف دھکیل دیا۔جس پر گرتے ہی اس پر م سروں والے مکوڑوں نے حملہ کر دیا۔

مکوڑے جدھر بھی کاٹتے اسکے نرم و گوشت کی بوٹی نکال لیتے۔اسکا پورا جسم آلود ہو گیا،کمرے کی گرمی نے الگ بُرا حال تھا۔

مالکن کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس تکلیف اظہار کرے۔اسکی چیخوں نے پوری حویلی پر اٹھا لیا۔

ناگہانی صورت حال کا جب باپ کو پت وہ جوتا پہننا بھول گیا،فوراً حویلی میں بیٹ

کمرے کی طرف گیا۔ وہاں کے منظر نے اسکے ہوش اڑا دیے۔ نازونعم میں پلی بیٹی زخموں کی وجہ سے خون میں تر بتر تھی۔ جبکہ ایک حسینہ اس پر ہنٹر برسا رہی تھی جس کی وجہ سے وہ چیخ رہی تھی۔

گھر کے اندر بے بسی کی حالت دیکھ کر مالک سب کچھ بھول کر بیٹی کا باپ بن گیا، حسینہ کے پاؤں میں گر کر بیٹی کی زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔

''تم نے ایک مجبور انسان کو صرف غریب ہونے کی وجہ سے ڈیرے میں باندھ رکھا ہے۔ اسکے گھر کو آگ لگا دی۔ اسکا جرم یہ تھا کہ وہ غریب تھا، اسکو جینے کے لیے تم سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ اسکی مایوس زندگی میں آس کا دیا میری وجہ سے جلا۔ تمہاری بیٹی حسد کی وجہ سے جل کر خاک ہوگئی۔'' وہ حسینہ گرج رہی تھی۔

''میرے حسین ہونے کی سزا اس مجبور انسان کو دی۔ جبکہ میں صرف اس کی دادرسی کے لیے اسکے پاس آئی تا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ دنیا صرف امیر روپے پیسے والوں کی ہے۔ غریب انسان کو بھی جینے کا حق حاصل ہے۔

میں اپنے کنبے کی سردار ہوں اور حسن میں بھی یکتا ہوں۔ اس نوجوان کو احساسِ کمتری سے نجات دلانے کے لیے اسکی مددگار بنی کہ وہ مایوس ہو کر کہیں خدا کی ذات کا انکار ہی نہ کر دے۔ مگر تمہاری بیٹی تو واقعی زمین پر واقعی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھی۔ جب تک وہ نوجوان تمہاری قید میں ہے اس وت تک یہ لڑکی میری قید میں رہ کر آگ میں جلتی رہے گی۔''

اتنا سننا تھا کہ مالک نے فوراً مجھے آزاد کروایا اور حویلی میں بلا کر میرے اور اس حسینہ کے پاؤں پڑ گیا۔

''اگر تمہاری بیٹی وعدہ کرے کہ آئندہ غرور و تکبر چھوڑ کر عاجز انسانوں کی طرح زندگی کرے گی۔ غریبوں کا مذاق اڑانے کے بجا ان کے دکھ درد کا مداوا کرے گی۔ گاؤں کے گھرانے پر سردار بن کر راج کرنے کے بجا اپنے آپ کو ہر گھرانے کا فرد سمجھے گی اور ہر کسی دکھ درد پر اپنوں کی طرح ہمدردی کرے گی لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے جیب رقم خرچ کرے گی۔

اس گاؤں میں ایسے زندگی گزارے گی کہ ا کا ہر قدم لوگوں کے لیے امن وسکون اور خوشی راحت کا امین ہوگا۔ تو میں نہ صرف اس کو معا کر دوں گی بلکہ تمہارے راج برقرار رکھنے لیے وسائل پیدا کروں گی۔''

باپ بیٹی نے ہر حکم کو من وعن تسلیم کیا۔ کے ہاں کرنے کی دیر تھی کہ آگ کے شعلے گلا کی خوشبودار پتیوں میں تبدیل ہوگئے۔

تانبے کی طرح لال زمین سنگ مرمر کے فر میں بدل گئی ۔ مالکن کے تمام زخم مند ہوگئے۔ اور اسکا حسن نکھر کر چاند کی دھیمی روشنی طرح چمک اٹھا۔

پوری حویلی خوشبوں اور روشنی میں نہا گئی۔

ان لوگوں نے نہ صرف وعدہ کیا بلکہ اس عمل بھی کیا، گزرتے وقت نے ان کے دعوؤں تائید کر دی۔ ایک وقت آیا کہ اس گاؤں کے لو اس باپ بیٹی کو مسیحا اور خوشیوں کا موجب لگے۔

ہم غریب مہمل سے کلمہ بن گئے جبکہ وہ ح جو صرف میرے لیے نہیں بلکہ پورے گا والوں کے لیے مسیحا ثابت ہوئی تھی، مجھے دو کہیں نظر نہ آئی۔

☆☆......☆☆

جن زادہ

URDUSOFTBOOKS.COM

وہ ایک جن زادہ تھا اور ہماری دنیا میں آ گیا تھا' مولوی صاحب کی شاگری اُس کی خواہش تھی......

شیخ معظم الٰہی

یہ واقعہ میرے نانا جان جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے سنایا تھا آپ انہی کی زبانی سنیے۔

تسیم ہند سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس وقت میری عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ ان دنوں میں اپنے محلے کی ایک مسجد میں قرآن پاک پڑھنے کے لیے جناب مولوی عبداللہ صاحب کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہاں اور بھی بچے پڑھا کرتے تھے۔ مسجد کے کچے صحن میں ایک نیم کا درخت تھا جس کے سائے میں بیٹھ کر ہم بچے قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔

ایک روز نیم کے درخت کے نیچے مسجد کے کچے صحن میں بیٹھے ہوئے بچے باآواز بلند اپنا سبق یاد کر رہے تھے مولوی صاحب حسب معمول اونگھ رہے تھے' مگر اتنے بھی نہیں کہ کوئی شاگرد...... زیر زبر یا پیش کی غلطی کرے اور وہ اسے شڑاپ سے چھڑی مار کر درست نہ کروا دیں۔ ہماری پڑھائی کے دوران میں ہی ایک بچے کی اچانک آمد ہوئی تھی۔

''میاں جی السلام علیکم!'' بچے کی بھاری آواز پر مولوی صاحب ہڑبڑا کر اٹھ گئے تھے اور خلافِ

معمول نو وارد کے سلام کا جواب دینے کی بج[...] انہوں نے اُسے گھور کر دیکھا تھا۔ اُن کے سا[...] ایک موہنی سی صورت والا سات آٹھ سال کا [...] سر جھکائے کھڑا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔

''کیوں میاں! کون ہو تم اور کہاں سے ا[...] کیا کچھ پڑھنا چاہتے ہو؟''

''جی جی ہاں! مولوی صاحب! آپ مجھے [...] شاگردگی میں لے لیجیے۔'' بچے نے بہت ہی پُرا[...] لہجے میں جواب دیا تھا۔

مولوی صاحب جو اُس کے معصوم سراپے [...] کھو سے گئے تھے۔ اُس کی اس قدر بااعتماد [...] چیت پر ایک بار پھر گڑبڑا گئے تھے اور حیرت [...] بولے۔

''لڑکے تمہاری عمر کیا ہے؟ قد کاٹھ سے تم [...] سال کے لگتے ہو مگر گفتگو بڑوں جیسی کرتے ہو۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''میں جی پورے بارہ برس کا ہوں بیماری کی [...] سے میرا قد چھوٹا رہ گیا ہے۔'' [...]

تمام بچے کھلکھلا کر ہنسنے لگے تھے۔
''اچھا بیٹے! تم آج سے خود کو ہماری شاگردی میں سمجھو اور ہاں نام کیا ہے تمہارا؟''
''معراج دین ولد سراج دین۔'' بچے کی عمدہ اردو پر دیہاتی بچے ایک بار پھر ہنسنے لگے تھے۔
مولوی صاحب مسکراتے ہوئے بولے تھے۔
''اچھا بیٹے اب تم جاؤ اور خلیفہ (مسجد کا ملازم) سے کہنا کہ مجھے مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ تم کو تمہارے سونے اور پڑھنے کی جگہ دکھا دے گا۔''
چنانچہ اُس لڑکے کو ایک کچے مگر بڑے سے حجرے میں جہاں باقی سارے طالب علم رہتے تھے پہنچا دیا گیا تھا۔ معراج دین کا حافظہ تو بلا کا تیز تھا۔ اُس نے صرف تین ماہ میں پورا قرآن پاک مکمل کر لیا اور اب تو وہ قرآن پاک حفظ بھی کرنے لگا تھا۔ مولوی صاحب بڑے حیران تھے کہ آج تک ہزاروں شاگردوں کو پڑھا چکے تھے مگر ایسا حافظہ ایسی روانی اور ادائیگی کبھی کسی بچے میں دیکھنے سننے میں نہیں آئی

تھی۔ ایک دن مولوی صاحب جب کسی کا
پڑھوا کر لوٹے تو زیادہ مرغن کھانا کھانے کی وجہ
پیٹ میں تکلیف سی محسوس ہوئی۔ سارے لڑکے
چکے تھے مگر معراج دین حسب معمول جاگ رہا تھا
عبادت الٰہی میں مشغول تھا۔ مولوی صاحب درد
کراہ رہے تھے۔
''ارے کوئی ہے جو مجھے کہیں سے ذرا سی
لا دے، کوئی سنتا ہی نہیں میرے پیٹ میں
تکلیف ہے۔'' معراج دین نے اپنے استاد کی آ
سنی تو اس نے سوچا کہ استاد صاحب تکلیف میں
اور اگر میں نے اُن کی بروقت مدد نہ کی تو شاید
پاک میری عبادت ہی قبول نہ فرمائے۔
چنانچہ معراج دین نے جائے نماز لپیٹ کر
میں رکھی اور مولوی صاحب کے سر پر جا کھڑا ہو
کہا۔
''مولوی صاحب میں لاؤں گا ہینگ بتا
کہاں سے ملتی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔



"تم کیسے لاؤ گے بیٹا؟ دکان تو بہت دور ہے اتنے ذرا سے تو ہو تم' کیا تمہیں اندھیرے میں ڈر نہیں لگتا؟" معراج دین نے فوراً ہی جواب دیا تھا۔

"نہیں جی! میں تو اپنے سارے کام جب چاہوں کر لیتا ہوں اور مجھے اندھیرے سے بھی ڈر نہیں لگتا۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"اچھا! اگر تم بضد ہو تو پھر جاؤ بس اسٹاپ کے قریب دکان موجود ہے دکاندار سے کہنا کہ مولوی صاحب ذرا سی ہینگ منگوا رہے ہیں۔"

معراج دین تو جیسے اجازت کا منتظر تھا۔ بھاگ کھڑا ہوا اس کے باہر نکلتے ہی اچانک باہر تند و تیز ہوائیں چلنے لگیں اور موسلا دھار بارش بھی ہونے لگی۔

مولوی صاحب دل ہی دل میں بہت پشیمان ہوئے کہ معصوم بچے کو رات کے وقت باہر کیوں بھیج دیا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکے کیونکہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور وہ واپس آ گیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ باہر طوفان کا نام و نشان تک نہ تھا۔

مولوی صاحب کا درد اسی دم ہرن ہو گیا جب انہوں نے دیکھا کہ معراج دین کے کپڑے بالکل خشک تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بیٹا! لے آئے ہینگ؟"

معراج دین پُراعتماد لہجے میں بولا۔

"جی ہاں!" اُس نے مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"آپ آئیں تو سہی۔" اور انہیں مسجد کے صحن میں لے آیا مولوی صاحب کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ صحن ہینگ کی بوریوں سے بھرا پڑا تھا۔ مولوی صاحب نے پہلی بار اپنے باسعادت شاگرد کو غصے سے دیکھا اور کہا۔

"اِدھر آؤ اور میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ
اور اس کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اس
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" معراج دین
بڑے ہی ادب سے جواب دیا۔

"مولوی صاحب! میں ایک جن زادہ ہوں
پھر اُس کا سر مولوی صاحب کے قدموں پر تھا' وہ
قطار رو رہا تھا' اور برابر معافی کی درخواست کر رہا تھ

مولوی صاحب نے پیار سے معراج د
سر اپنے قدموں سے ہٹایا اور اسے گلے سے ل
جب اسے کچھ حوصلہ ہوا تو اس نے بتایا۔

"اُس نیم کے درخت پر جس کے نیچے سب
بیٹھ کر قرآن پاک پڑھا کرتے ہیں میرا بسیرا ہے
روزانہ قرآن پاک کی تلاوت سنا کرتا تھا تب میر
بھی چاہا کہ آپ کی شاگردی میں آ جاؤں۔"

مولوی صاحب جو بغور اُس کی بات سن ر
تھے۔ یکایک جیسے ہوش میں آ گئے پھر انہوں نے
"اچھا اب تمہارا مقصد پورا ہو چکا ہے ا
قرآن پاک حفظ بھی کر چکے ہو۔ بہتر ہے کہ ا
چھٹی کر دو اور اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ اور یہ ہینگ
بوریاں بھی ساتھ لے جاؤ۔ مجھے اب ان کی
ضرورت نہیں رہی اور اگر تم نے میری بات نہ ما
میں تمہیں بوتل میں بند کر کے زمین میں گاڑھ دو
سمجھے تم؟" معراج دین یا پھر یوں کہیں کہ وہ
زادہ بادل نخواستہ مولوی صاحب کو اللہ حافظ' ک
پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس واقعے کو ایک لمبا عرصہ گزر گیا اور مو
صاحب اُس جن زادے کو بھول چکے تھے مو
صاحب روحانی علاج تعویذ وغیرہ کے بھی ماہر
اکثر گاؤں کی نوجوان لڑکیوں پر جب بھی دورہ و

پڑتا اور ماں باپ اسے جن بھوت وغیرہ کی کارستانی سمجھتے تو وہ مولوی صاحب ہی سے رجوع کرتے مولوی صاحب اُن پر دم درود وغیرہ کرتے تو وہ بھلی چنگی ہوجایا کرتی تھیں۔

ایک روز شام کے وقت ایک ایسی ہی لڑکی کو مولوی صاحب کے پاس لایا گیا وہ بن جل کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مولوی صاحب نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اپنا عمل جاری رکھا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے بڑبڑاتے رہے اور پھر یکا یک وہ چیخ ہی پڑے۔

''معراج دین تو تم اپنی دنیا میں واپس نہیں گئے؟ کیا تم نے اپنا وعدہ بھلا دیا اور یہ بھی بھول گئے کہ استاد کی نافرمانی کتنا بڑا گناہ ہے۔ میرا خیال ہے مجھے تمہیں بوتل میں بند کرنا ہی پڑے گا۔''

معراج دین جواب میں بڑی عاجزی کے ساتھ بولا تھا۔

''نہیں مولوی صاحب جی! ایسا نہ کرنا...... اللہ رسول ﷺ کے واسطے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب آپ کی اِس دنیا میں کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا مگر صرف ایک بار اور آخری بار اپنی دنیا میں لوٹ جانے سے پہلے آپ کی قدم بوسی کرنا چاہتا ہوں۔''

مولوی صاحب نے پہلے اُسے لڑکی کو چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ اُس نے فوراً ہی لڑکی کو چھوڑ دیا تھا۔ پھر مولوی صاحب نے اسے گلے سے لگا کر خوب پیار کیا اور بعد میں کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔

لڑکی یکدم ہوش میں آ گئی تھی اور اس کی حالت اب بہتر تھی اور پھر مولوی صاحب کی چشم نم نے دیکھا کہ وہ جن زادہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا اس واقعے کے بعد وہ جن زادہ کبھی وہاں لوٹ کر نہیں آیا' یہاں تک کہ مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔

☆☆......☆☆

غزل

میں آج بھی تنہا ہوں' کل تھا اُسے کہن
میں منتظر اُسی کا سراپا اُسے کہن

یہ شہر یہ دریا' یہ گلی کوچے یہ چہرے
کچھ بھی نہیں دلکش' نہیں اچھا اسے کہن

نایاب ہیں' انمول ہیں دنیا کے لیے ہم
اُس کے لیے ردی سے بھی سستا اُسے کہن

یہ اُس کی محبت ہے جو اچھائی ہے میری
یوں فکر نہیں تھا مجھے سب کا اُسے کہن

ہم نے بھی تیرے ہجر میں سگریٹ جلا دی
ہم کو بھی لگا زہر کا چسکہ' اُسے کہن

جس دل پہ جدائی نے رقم کی ہو جدائی
اُس دل کا نہیں کوئی مداوا' اُسے کہن

زندہ ہے ہما یاد کے پُرنور جہاں میں
یہ اُس کی محبت کا ہے صدقہ' اُسے کہن

نعمان ہما

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند، آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

دل چار قسم کے ہیں

مسند احمد میں ہے "رسول اللہ نے فرمایا کہ دل چار قسم کے ہوتے ہیں۔"

(1) ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو۔

(2) دوسرے وہ دل جو غلاف آلود ہیں۔

(3) تیسرے وہ دل جو الٹے ہیں۔

(4) چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں۔

پہلا دل تو مومن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے۔

دوسرا کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

تیسرا منافع کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے۔

چوتھا دل اس منافق کا ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر سے اقتباس۔ انتخاب: مولانا شہید السلام المصری)

گزشتہ کی راکھ

ماضی کو کون سمجھائے کہ بچپن تو ہوتا ہی یاد کرنے کے لیے ہے۔ سبھی سمجھیں، گونگی

دوپہریں، بہری شامیں اور اندھی راتیں کہانیوں تو بنتے بنتے راکھ ہوگئیں۔ اور کہانیوں کا کوئی ایک ریزہ بھی میرے پاس ہے۔ سنگلاخ تنہائی کے اس بنجر پن میں دہکتے جذبوں کے گلاب اُگانا اور انہیں آنسوؤں سے شاداب رکھنا میرا منصب بھی اور میرا فن بھی بس اس دھن میں سکوت ہولناک صحرا میں لمحہ لمحہ سوچوں کی بستیاں اُن میں لفظوں کے رنگ رنگ چراغ روشن ہوں۔ جانے کب سے جانے کب تک؟

ہوا مجھ سے برہم، سناٹا میرے تعاقب حوادث مجھ سے دست و گریباں، محبتیں مجھ گریزاں اور شامیں میری آنکھوں پر 'باندھنے' کے لیے مضطرب، مگر میں نصیب، سفر مزاج 'گزشتہ' کی راکھ پر آ دیوار اُٹھا کر اُس کی منڈیر پر اپنی آنکھیں ہوں، تاکہ میرے بعد آنے والوں کی تھکن لمحہ ستا سکے۔

(محسن نقوی کی کتاب 'طلوع اشک' اقتباس، انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی)

آنکھیں

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آ

جیسے اندھیری رات میں موٹر کی ہیڈ لائٹس جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ بہت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں، میں خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کرسکتا ہوں۔

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں جو حنیفہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پُرکشش تھیں۔ معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی۔ میں اس سے پیشتر عرض کرچکا ہوں کہ وہ قطعاً خوبصورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں کھب رہی تھیں۔

حنیفہ نے مڑ کر میری طرف اپنی عجیب و غریب آنکھوں سے دیکھا۔

''بدرو کہاں ہے؟ میں نے اس سے پوچھا۔

''کون بدرو؟''

''وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا'' میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جو تانگے کے پاس ہی تھا۔

''یہ کھڑا تو ہے۔''

''اچھا......!'' یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا۔

''بدرو! مجھے اُتار تو دو۔'' بدرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکل سے تانگے سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا۔ پچھلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔

''کیا بات ہے یہ خود نہیں اتر سکیں؟'' بدرو نے جواب دیا۔

''جی نہیں، ان کی آنکھیں خراب ہیں...... دکھائی نہیں دیتا۔''

(سعادت حسن منٹو کے افسانے 'آنکھیں' سے اقتباس۔ انتخاب: فیضان عثمانی۔ حیدرآباد)

ادب کی دنیا میں اگر مصنف ایسی کتاب
کرے جس کے قاری میں گناہ کی رغبت یا
پیدا ہوجائے تو ایسی تخلیق گناہ ہی کہلائے گی
گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے۔ مصنف کا عمل ت
ہے اور یہ عمل خیر یا شر کے باب میں اپنا
ضرور دیکھیے گا گناہوں پر اکسانے والے کا
گنہگار کے انجام سے زیادہ خطرناک ہے۔
گامزن کرنے والا عمل نیک اعمال میں سب
زیادہ مستحسن عمل ہے ادیب مرجاتا ہے ادب
رہتا ہے اور ادب اپنی تاثیر پیدا کرتا رہتا ہے
(واصف علی واصف کی کتاب 'قطر
قلزم' سے اقتباس۔ انتخاب: رضوانہ کوثر۔ ل

محبت

چار لفظوں کو مجموعی طر پر جوڑنے کو محبت
دیا جاتا ہے۔ مگر یہ انسانی خمیر میں شامل، خ
گندھا ہوا وہ انمول جذبہ ہے جو دل کی د
اور سانس کی ڈور سے کسی اٹوٹ اور دائمی
کی مانند جڑا ہوا ہے۔ کہکشاں کے سبھی ست
قوس قزاح کے سارے رنگ اور قدرت
مناظر، اس کے مقابل ہیچ نظر آتے ہیں۔
خوشبو سے روح معطر، چاشنی سے دل و د
شار جبکہ اس پر ایقان بندے کو رب سے
قریب لے جاتا ہے۔

محبت ایک بے موسمی پھل ہے جو پ
ساون، بسنت اور بہار کے سبھی ذائقے ا
سموئے ہوئے ہے۔ یہ تو وہم وگمان، زبان
اور زمان و مکاں کی قید سے آزاد خلائے
وسعتوں تک میں پھیلی ایک لامحدود نعمت
ازل سے ابد، شروع سے آخر اور زمین سے
تک ہمیشہ موجود رہنے کے لیے بچھا دی گئی

محبت نہیں بنی کسی سے بنی ہوتی ہے۔ یہ مال دولت، جاہ وحشمت، رنگ و نسل، مذہب اور قوم ہرگز نہیں دیکھتی۔ دل تو کسی دوشیزہ کے مہندی والے ہاتھوں سے بنے پراٹھے، گرما گرم چائے یا تلسی سپاری کے ایک پیکٹ پر بھی ہار سکتا ہے۔

اکثر لوگ محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ یہ کس طرح دل پر وار کرتی ہے اور کتنے رنگ و انداز بدلتی ہے۔ محبت وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر ٹھنڈی آہیں بھرنے، غمگین نغمے سننے، المیہ شاعری، ناول اور افسانے پڑھنے کا نام ہی نہیں۔ نا ہی یہ کوئی بازاری کھلونا ہے کہ پسند آنے پر دل بچوں کی طرح مچل اٹھے۔

محبت ہونا بھی ہر کسی کے نصیب میں نہیں یہ تو ایک عطا ہے گوہر نایاب ہے جو صرف نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔ محبت تو سید وارث شاہ، سچل سرمست، میاں محمد بخش، کے صوفیانہ کلام، خواجہ غلام فرید، بابا بھلے شاہ اور شاہ حسین کی کافیوں میں ملتی ہے جنہیں سن کر ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ وجد میں آجائیں۔

یہ تو شاید ہما نامی پرندے جیسی ہے جس کے سر پر سوار ہو جائے اسے بادشاہ بنا دے، یا پھر پارس پتھر کی طرح جو لوہے کو چھو کر بھی اکسیر بنا دے۔

یہ بات بیٹے کے روپ میں نمودار ہوئی تو سر چڑھ کر بولی۔ کہیں آگ گل و گلزار ہوئی تو کہیں پتھر بھی سربسجود ہو گئے اور پھر جب حضرت امام حسین کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تو کفر مٹا کر رہتی دنیا تک اسلام کا نام روشن و منور کر گئی اور سچ تو یہ ہے کہ خداوند کریم نے اپنی محبت ہی کے صدقے پوری کائنات کی تخلیق کی اور اپنے نام کے ساتھ اپنے پیارے کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منسوب کرتے ہوئے محبت کو امر کر دیا۔

مرسلہ: ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف

عورت

باکرم کردار تاریخ روشن عظیم المرتبت بصیرت و بصارت تخلیق سرمایہ فکر، صنف اسلامی معاشرے میں اس منصب پر فائز ہے ج تصور بھی محال ہے۔ تاریخ کے اوراق میں آ سنہری لفظوں میں خواتین کی داستانیں موجو جن کو کسی بھی حال میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس عہد ساز خواتین شاذ و نادر نہیں ہیں بس تک دنیا حرف اور حرف بری عورتوں کا ہی زیادہ لگا سکی ہے۔ جبکہ یہ امر اپنی جگہ بجا ہے ک دنیا تعمیر کرتا ہے اس کو ایک عورت ہی پیدا کرتی یہ بات منطق سے بالاتر ہے کہ آج تک یہ عورت اپنے مساوی حقوق سے محروم ہے او کے دور جدید میں بھی حوصلہ شکنی کی علامت سمجھ ہے اور بہت ہی جگہ پر انسانیت سوز سزائیں عو سہنا پڑتی ہیں قدرت حق نے عورت کو نازک بن شاید اس لیے عورت دنیا کے جس کونے می موجود ہو اس کو مساوی حقوق فراہم نہیں ہیں ی اور ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے میں خواتین کی کے طریقے قدرے مختلف ہیں شاہرہ حیات پ حیا کا یہ مجسم اپنے اندر جاہ و جلال کا سمندر رکھ باوجود مسلسل زوال پذیر ہیں اور اس سے قسمت کی کیا ستم ظریفی ہوگی کہ ذہن کے میں ظلم و نفرت کے آتش فشاں لاوا ابل ر اس کے باوجود کہ اسلامی معاشرے میں بلن حاصل ہے زندگی کی گاڑی ہو یا کوئی آفت حا خواتین نے ہر حال میں مردوں کا شانہ بشانہ س ہے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے لیکن اس کے باوجود مساوی حقوق سے ہر دور میں محروم

چلائیں اور افسوس کہ عورت آزادی حاصل کر کے مزید ذمہ داریوں کے بوجھ تلے آ گئی اس کو اپنی عصمت کی چادر کو مزید بڑا کرنا پڑا افسوس کہ عورت آج بھی غیرتوں کے نام پر قتل ہو رہی ہیں تنگ ذہن معاشرے میں عورت کا جینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور ناممکن کے باوجود عورت نے ممکن بنایا ہوا ہے پچھلی صدیوں میں جو لوگ مریخ پر گئے تھے اب وہ واپس آ رہے ہیں زمانے کی جدیدیت مزید بڑھ رہی ہے اور اس کے باوجود عورت گھٹ گھٹ کر مر رہی ہے عورت اچھی ہو یا بری ہو دونوں صورتوں میں اپنے مرد کی عکاسی کرتی ہے۔

غزل

گزرے ہوئے لمحات کا سایہ ہے اب تلک
مجھ کو میرے جنوں نے ستایا ہے اب تلک
خوشیاں تو کہیں دور بہت دور کھو گئیں
ہم کو غموں نے بارہا رولایا ہے اب تلک
چھوڑا ہے جب سے دنیا کے اس خار زار کو
دل میں حسیں محل سجایا ہے اب تلک
جس میں ہیں میرے پھول میرا ہمسفر اور میں
یوں اپنے گھر میں باغ لگایا ہے اب تلک
نجانے ابھی اور کتنی آزمائشیں ہیں
اللہ نے میرا ظرف آزمایا ہے اب تلک
کوشش ہے میری میں اس امتحان میں سرخرو رہوں
ورنہ تو دل کو درد ہی بھایا ہے اب تلک
شازیہ گل۔ مانسہرہ

غزل

درد کا اک شہر آباد کر لیا ہم نے
دل میں جب بھی تیرا نام لے لیا ہم نے
کتنا خوش ہے وہ میرے دل کا پنچھی قید کر کے
اس کا دل رکھنے کو جی مسکرا لیا ہم نے
ضبط کے کتنے سمندروں سے خود کو گزار لیا ہم
وقت کی گردش سے جو اپنا ستارہ نہ نکل
تب گردشِ چاند کا سہارا لیا ہم
زندگی اسی امید پر بہت رہی ہے
ایک بار تو وہ کہے میرے لیے خود کو مٹا لیا تم
جہلم

غزل

عجب ہوں میں عجب انداز کے سفر میں ہوں
چراغ جاں لیے آندھی کی راہ گزر میں ہوں
سکون کے دن ہیں میسر نہ چین کی راتیں
نفس نفس کسی اندیشہ ضرر میں ہوں
مجھے تو گھر سے چلے ایک زمانہ بیت گیا
ہے سب سے ایک بہانہ کہ اپنے گھر میں ہوں
بس اک چراغ میرے خیمہ سیاہ میں ہے
میں دشت درد میں پاگل ہوا کے ڈر میں ہوں
نجانے کب میری بے صورتی کو شکل ملے
بہ شکل خاک ابھی دستِ کوزہ گر میں ہوں
بہت دنوں تو میں آسودۂ وصال رہی
نہیں کہ تیرے ہجر کے اثر میں ہوں
سو رائیگاں میں تحفظ کی حکمتیں پروین
میں اپنے شہر کے اس عہد پر خاطر میں ہوں
نفیسہ

جدائی

اے چھوڑ کر جانے والے
کہاں چھوڑ کر چلے ہو
نہ منزل ہے نہ منزل کا نشاں ہے
تیرے بعد زیست بھی بے نشاں ہے
گر ہم جی نہیں سکتے مر تو سکتے
زہر ہے زیست تو نہیں
پی بھی سکتے ہیں

شاعر: حسین خوا

تمہیں دیکھا تو جینے کا سلیقہ آ گیا ہے
تم آئے تو سنبھلنے کا سلیقہ آ گیا ہے
تمہاری چاہتوں نے ایسی شدت بخشی دل کو
دعائیں رب سے کرنے کا طریقہ آ گیا ہے
تمہارے ہجر نے آنکھوں کو دریا کر دیا تو
میرے دل کو پگھلنے کا سلیقہ آ گیا ہے
تمہارا آسرا پا کر سنورنے لگ گئی ہوں
ہر ایک غم سہنے کا سلیقہ آ گیا ہے
میں اپنی کاوشوں سے قسمت کو کرتی ہوں تسخیر
مجھے نقشہ بدلنے کا سلیقہ آ گیا ہے

مسز نگہت غفار۔ کراچی

غزل

ذرا لوٹ کے آؤ تم ساجن تیری یاد مجھے تڑپاتی ہے
میرا جینا ہے دشوار ہوا ہر پل یہ یاد ستاتی ہے
ہوں قید غموں کی دنیا میں ہے طوق گلے میں فرقت کا
دن رات تڑپتا ہوں تنہا ہر روز ستم یہ ڈھاتی ہے
میرا دل بھی ہے بے تاب ہوا ناراض آنکھوں کی نیند ہو گئی
آنکھوں سے ساون کی طرح بارش بھی یہ برساتی ہے
تھا وعدہ تیرا یہ مجھ سے ملاقات کروں گا ساون میں
ساون بھی اب تو آ گیا ہے کوئل بھی راگ سناتی ہے
تم کتنے سنگدل ہو اب تک گئے کتنے بیت برس ناصر
کبھی آئے نہ ملنے اک پل بھی تیری یاد روزانہ آتی ہے

ایم ناصر جوئیہ۔ متیلا چوک

غزل

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا' اب اُس کا حال بتائیں کیا؟
کوئی مہر نہیں' کوئی قہر نہیں' پھر سچا شعر سنائیں کیا
اِک ہجر جو ہم کو لاحق ہے' تا دیر اُسے دہرائیں کیا
پھر آنکھیں لہو سے خالی ہیں یہ شمعیں بجھنے
ہم خود بھی کسی کے سوالی ہیں اِس بات پہ ہم شر
اِک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں
جب جسم ہی سارا جلتا ہو' پھر دامنِ دل کو بچ
ہم نغمہ سرا کچھ غزلوں کے' ہم صورت گر کچھ خوا
بے جذبہ شوق سنائیں کیا' کوئی خواب نہ ہو تو
(اط

حسنِ انتخاب: فروا علوی'

غزل

بڑا کٹھن ہے راستا' جو آسکو تو س
یہ زندگی کا فاصلہ مٹا سکو تو س
بڑے فریب کھاؤ گے' بڑے ستم اٹ
یہ عمر بھر کا ساتھ ہے' نبھا سکو تو
جو تم ہو یہ دل تو کیا' میں جان بھی فد
جو میں کہوں بس اِک نظر لٹا سکو تو
میں اِک غریب بے نوا' میں اِک فقیر
مری نظر کی التجا جو پا سکو تو س
ہزار امتحاں یہاں' ہزار آزمائشیں
ہزار دکھ' ہزار غم اٹھا سکو تو س
یہ زندگی یہاں خوشی' غموں کا ساتھ س
رُلا سکو تو ساتھ دو' ہنسا سکو تو
(

حسنِ انتخاب: علی رضا خان' نارتھ

غزل

یوں ستم گر نہیں ہوتے
پھول پتھر نہیں ہوتے
کیوں مرے دل سے کہیں ج
گھر سے بے گھر نہیں ہوتے
وصل کی شب جو کرم تم
کیوں مکرر نہیں ہوتے

غم کے دیپک نہیں جلتے جب تک
دل منور نہیں ہوتے جاناں
ہم تو رہتے ہیں تمہاری حد میں
حد سے باہر نہیں ہوتے جاناں
ایک جیسے ہیں خوشی کے لمحے
دکھ برابر نہیں ہوتے جاناں
اِس قدر خوں نہ بہانا دل کا
دل سمندر نہیں ہوتے جاناں
(باقی احمد پوری)

حسنِ انتخاب: قرۃ العین زینب' ملتان۔

غزل

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے
شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصّے کی کوئی شمع جلاتے جاتے
کتنا آساں تھا تیرے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اِک عمر لگی جان سے جاتے جاتے
جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابہ جولاں ہی سہی' ناچتے گاتے جاتے
اُس کی وہ جانے' اُسے پاس وفا تھا کہ نہ تھا
تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے
(احمد فراز)

حسنِ انتخاب: محمد قاسم فراز' چھنی چور بڑہ۔

بالاکوٹ

ماں! بہت پیاس لگی ہے' مجھے پانی دے دے
میرے سینے سے یہ شہتیر ہٹا دے ابّا!
میں بڑا ہو لوں' اٹھا لوں گا یہ چھت کندھوں پر
جسے دن بھر سے سنبھالے ہوئے تو ہے ابّا!
ماں ورانڈے کو لپیٹے ہوئے کیوں سوتی ہے؟
بھائی دیوار میں کیا سونگھتا ہے؟
دادی اینٹوں میں سے کیوں جھانکتی ہے؟
منی روتے ہوئے دہلیز پہ جا پہنچی ہے
باجی! تم پکڑو اسے' میں تو نہیں ہل سکتا
ماں! بہت پیاس لگی ہے' مجھے پانی دے دے
(محمود شام)

حسنِ انتخاب: ایمان علی' سکھر۔

احساس

گہرے نیلم پانی میں
پھول بدن لہریں لیتے تھے
ہوا کے شبنم ہاتھ انہیں چھو جائے تو
پور پور میں خنکی تیرنے لگتی تھی
شوخ سی کوئی موج شرارت کرتی تھی
نازک جسموں' نازک احساسات کے مالک لوگ
شاخِ گلاب کی صورت کانپ اٹھتے تھے
اور پر وسطِ اپریل کا سورج
انگارے برساتا تھا
ایسی تمازت......!
آنکھیں پگھلی جاتی تھیں
لیکن دل کا پھول کھِلا تھا
جسم کے اندر رات کی رانی مہک رہی تھی
روح محبت کی بارش میں بھیگ رہی تھی
گیلی ریت اگرچہ دھوپ کی حدت پا کر
جسموں کی جھلسانے لگی تھی
پھر بھی سب چہروں پہ لکھا تھا
ریت کے ہر ذرّے کی چبھن میں
فصلِ بہار کے پہلے گلابوں کی ٹھنڈک ہے
(پروین شاکر)

حسنِ انتخاب: تنویر شاکر' وگھ جہلم۔

☆☆......☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ **300/=** روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔



(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔



88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھا کرو۔ اس نفسانفسی کے دور میں جو لوگ اللہ کے بندوں کی مدد کرتے ہیں وہ اللہ کے پسندیدہ بندوں کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔ اللہ تمام مسلمانوں کو توفیق دے کہ اُن کا شمار بھی رب العزت کے مقرب بندوں میں ہو۔ کچھ لوگ مجھے بہت پابندی سے ضرورت مندوں کے لیے رقوم ارسال کر رہے ہیں۔ اللہ اُن کی تمام مشکلات حل فرمائے جو لوگ مختلف امراض میں مبتلا ہیں یا آسیب کے زیر اثر ہیں وہ آیتہ الکرسی بہت پڑھا کریں۔ اللہ ہم سب کو ناگہانی سے محفوظ رکھے آمین۔

□ نامعلوم۔ حیدر آباد

☆ عرض گزارش یہ ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا مگر آپ نے جواب نہ دیا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بہت بے چینی ہوتی ہے رات کو نیند نہیں آتی آپ کوئی وظیفہ عنایت فرمائیں اور اس بار جواب ضرور دیجیے گا۔

○ عزیزم! میں جواب کیسے دوں میں تو یہ جاننے سے ہی قاصر ہوں کہ تم کون ہو بیٹی کہوں یا بیٹا کم از کم اپنا نام تو تحریر کرو۔

□ تمنا روزی۔ سکھر

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے خصوصاً نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 101 بار یا حی یا قی برحمتک استغیث پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ سمیرا نعیم۔ کراچی۔

☆ بیٹی سمیرا! نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور د کرو۔ والدہ سے کہو خوب صدقہ خیرات کیا کریں تم اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ بھی بنا استخارہ کیے مت کرنا۔ خواب پریشان کن ہیں۔ ہر قدم بہت سو سمجھ کر رکھنا۔ سورۃ الناس بکثرت پڑھا کرو۔

□ رِفعت جان۔ کوہاٹ۔

☆ بیٹی رِفعت! تمہارے خطوط مجھے ملے پھٹے ہوئے۔ میں نے دونوں خطوط کے جواب دیئے مگر مجھے محسوس ہوا کہ تمہارا پتا بھی مکمل تحریر نہیں ہوتا۔ آئندہ خط لکھو تو مکمل پتا ضرور لکھا کرو۔ شہر کا واضح لکھو۔ مکان نمبر اور گلی نمبر بھی صاف لکھا کرو۔

□ رابعہ۔ جہانیاں۔

☆ بیٹی رابعہ! جو حالات تم نے تحریر کیے ہیں بدترین ہونیوالے ہیں لہٰذا جتنی جلد ممکن ہو مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تعویذ کیلیے جوابی لفافہ ضرور اِرسال کرو

□ رانا جواد۔ جھنگ

○ باباجان! میری بیوی نے آپ سے میر نوکری کے لیے تعویذ لیا تھا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے

اطلاعِ عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C-II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121-35893122

چہرے پر رونق نہیں ہے' کیل مہاسے چھائیاں
ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے دوا بچی
کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

مجھے اپنی پسندیدہ جگہ پر نوکری مل گئی۔ فی الحال تنخواہ کم ہے مگر میں مطمئن ہوں۔ یہاں ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ باباجان! میرا ایک اور مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ میری کچھ زمین ادھر جھنگ میں ہے جو میں بیچنا چاہتا ہوں مگر مناسب قیمت نہیں لگتی۔ کوئی وظیفہ عنایت کیجیے جس کی برکت سے یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے۔ میرے رشتے کے چچا یہ زمین مارکیٹ ویلیو سے کچھ کم پر خریدنا چاہتے ہیں مگر وہ یہ رقم دو اقساط میں ادا کریں گے۔ اب آپ مشورہ دیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سودے بازی کا ہمارے آپس کے تعلقات پر برا اثر پڑے۔ آپ کے جواب کا منتظر۔

☆ بیٹے جواد! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں ہمیشہ یہ بات سمجھاتا ہوں کہ جو لوگ اللہ سے پورے یقین کیساتھ مدد مانگتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر اَدا کرو کہ اس نے تم پر اپنا کرم فرمایا۔ نماز پابندی سے اَدا کیا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد 99 بار پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف 9-9 بار' پھر حاجت بیان کرو۔ یہی عمل بعد نمازِ عشاء بھی کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بس خیال رہے' حاجت پوری ہوتے ہی حسبِ استطاعت رقم اللہ کی راہ میں دو گے۔

□ سُندس۔ لاہور

☆ بیٹی سُندس! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دُودھ اور چوتھائی چمچہ گڑ کھالیا کرو۔ یہ عمل ہر ماہ 7 دن کرو پھر ترک کردو۔ بکثرت یَاشَافِیُ کا وِرد کیا کرو۔ اللہ مکمل شفا عطا فرمائے گا۔

بالوں کا گرنا' گنی بے جان بال ان سے
لیے جڑی بوٹیوں سے تیار 150 سو سا
نسخہ...... اب آپ بھی حاصل کرسکتے ہیں
......35893121-35893122

□ شازیہ۔ اٹک

☆ بیٹی شازیہ! اللہ تمہارے مسائل
فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف
پڑھو۔ کچھ معاملات بڑوں کے طے کر
ہوتے ہیں۔ چھوٹے چاہتے ہوئے بھی اُ
نہیں بول سکتے۔ تم اللہ سے اچھے حالات
کرتی رہو' وہ ضرور سنے گا۔ والدہ سے کہو' ا
بچوں پر چاروں قُل اور الحمد شریف پڑھ کر
کیا کریں۔ اپنی بہن سے کہو' بعد نمازِ عشاء ا
سورۃ انعام ضرور پڑھے۔ مدت 41 دن ہے

□ سامعہ راشد۔ چکوال

☆ بیٹی سامعہ! اللہ تمہاری حاجت
فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف
پڑھو۔ امتحان شروع ہونے سے قبل خط لکھا ک
وظیفہ کرنے کا ٹائم بھی ہو۔ بہرحال یَارَحِیْمُ
وِرد کیا کرو۔ آرٹس کے مضمون تمہارے
ہیں۔ اپنی توجہ دوسری چیزوں سے ہٹا کر
پڑھائی پر مبذول رکھو' کامیابی ہوگی' انشاءاللہ

□ تجمل حسین۔ جہانیاں

o باباجی! میرے دو مسئلے ہیں بہت
نوعیت کے' ایک تو پورا سال میرا گلا خراب ر
کچھ بھی کھا لوں' تکلیف شروع
ہے۔ دوسرے میری بیوی کا وزن بہت تیز
بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے اُس کو جوڑوں
تکلیف شروع ہوگئی ہے۔ میں نے آپ
رسالے میں پڑھا ہے کہ آپ ان امرا

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکسیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے
دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

دوائیاں دیتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے بھی بنا دیں۔ میں اپریل کے آخر میں کراچی آرہا ہوں' یہ دوائیاں دفتر سے لے لوں گا۔

☆ بیٹے تجمل! بس دفتر آنے سے پہلے مجھے مطلع کروا دینا' میں دونوں ادویات تیار کر دوں گا۔ انشاءاللہ' ضرور فائدہ ہوگا۔

□ رضوانہ۔فیصل آباد

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی آپ سے کئی بار رابطہ کیا مگر اب ایک اور مسئلے کے لیے رابطہ کر رہی ہوں۔باباجی! مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر میں ایک عجیب سی تکلیف ہے۔میرا تمام سر کسی عجیب سی قوت میں جکڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میرا دماغ جکڑا ہوا ہے بلکہ سننے اور سمجھنے کی قوت بھی کم ہے۔ اس بیماری کا بہت علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تو کسی عالم سے استخارہ کروایا تو اس نے بتایا کہ میں جب بالکل چھوٹی تھی تو ایک دن میرے اوپر سے جن اور پریوں کا گزر ہوا تھا اور اس وقت ایک پری کے پروں کی مٹی ٹائپ کوئی چیز میرے سر پہ آگری تھی جس کی وجہ سے یہ تکلیف ہوئی ہے۔ باباجی! بات کچھ بھی ہو' پر میرے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں' یہاں تک میں کیسے پہنچی' یہ تو مجھے ہی پتا ہے۔ میں بہت پڑھنا چاہتی ہوں لیکن اس تکلیف نے میرا سارا کیریئر ہی تباہ کر دیا ہے۔ میں دو سالوں سے مسلسل دُرود شریف پڑھتی آرہی ہوں۔ اس سے بس اتنا افاقہ ہوا ہے کہ میری نظر کی کمزوری کچھ دور ہوئی ہے اور کچھ سمجھنے میں بھی افاقہ ہوا ہے لیکن اب تو دن بہ دن پڑھائی بڑھتی رہی ہے۔ میں اگر کلاس میں دُرود شریف کی طرف دھیان دیتی ہوں تو لیکچر سمجھ میں نہیں آتا اور اگر دُرود شریف چھوڑ دیتی ہوں تو تکلیف ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل کرتا ہے' خودکشی کرلوں لیکن اللہ تعالیٰ پہ یقین کر کے آگے بڑھتی ہوں کہ شاید کسی دن وہ مجھ پہ رحم کرے اور مجھے اس عجیب غریب بیماری سے چھٹکارہ حاصل ہو جائے۔ باباجی! خدا کے لئے مجھے اس تکلیف سے چھٹکارا دلائیں۔ میں دن رات روتی رہتی ہوں۔ میں اپنی تعلیم میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں۔ باباجی! اپریل میں میرے امتحان ہیں اور میں سخت پریشان ہوں۔ آپ جو کہیں' میں کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لیے اجتماعی دُعا کریں۔ میں کسی بھی مشکل وظیفے' تعویذ تجویز کے لیے تیار ہوں۔ خدا کے لئے' میرے لیے کوئی راستہ نکالیں۔

☆ بیٹی رضوانہ! تمہیں میں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تعویذ کے لیے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ ظلِ ہما۔کراچی۔

☆ بیٹی ظلِ ہما! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔

□ علی۔کوئٹہ

☆ بیٹے علی ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! تمہارے خط کی روشنی میں تمہیں جواب دے رہا ہوں۔ بیٹے! اس عورت کو جس قدر جلد ممکن

اندرونی اور بیرونی زخموں آپریشن کے بعد ٹانکوں کا کچا رہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب
جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر
جمنے نہیں دیتی دوا حاصل کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

ہو اپنی زندگی سے نکال دو یہ عورت تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو ایسی عورت تمہارے بچوں کی کیسی تربیت کرے گی؟ ایک نسل تباہ ہوجائے گی لہٰذا اَب مزید دیر مت کرو اور فیصلہ کردو۔ کچھ غلطیاں ایسی ہیں جن کی معافی کی گنجائش نہیں۔

□ سکینہ۔ سرگودھا۔

☆ بیٹی سکینہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ حالات تمہارے حق میں نظر نہیں آرہے۔ ایسے میں میں تعویذ کا ہی مشورہ دیتا ہوں کیونکہ وقت بھی کم ہے لہٰذا مجھے اپنا پتا اِرسال کرو تا کہ تعویذ بھیجا جاسکے۔

□ زیب عالم۔ کرک۔

☆ بیٹے! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! سب سے پہلے تو تم سب افراد ہر وقت باوضو رہو۔ جس قدر ممکن ہو یَا رَحْمٰن کا وِرد کیا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ ضرور نکالو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک سورۃ رحمٰن پڑھو اور پانی پر دَم کرو اور یہ پانی گھر کے تمام افراد دو دو گھونٹ پئیں۔ انشاء اللہ جلد مثبت تبدیلی دیکھو گے۔

□ سمعیہ۔ شکرگڑھ

☆ بیٹی! تم پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو پھر بھی اِن باتوں پر یقین رکھتی ہو؟ ہاں استخارہ ضرور کروانا چاہیے۔ بہرحال ایسا نہیں ہوا۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا وقت جب پورا ہوجائے

وہ اللہ کے پاس چلا جاتا ہے۔ بعض اوقا
مشکلات میں گھر جاتا ہے اور ایسے میں و
بھی کرجاتا ہے۔ بیٹی! تم نماز کی پابند
نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح یَا
القائمُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن
□ سلمٰی۔ مقام نامعلوم۔
☆ بیٹی سلمٰی! صبر اور ہمت سے حالات
کرو۔ اپنے بچوں کو توجہ دو۔ خود بھی نماز پڑ
بھی نماز کا عادی بناؤ۔ بیٹی! استخارہ رشت
صورت میں کیا جاتا ہے۔ بچوں کی خوراک
رکھو پانی خوب پلایا کرو۔ جس قدر ممکن ہو یَ
الرَّاحمین کا وِرد کیا کرو۔ مدت 41 دن۔
□ زیبا علی۔ بہاولپور
☆ بیٹی زیبا! اللہ تمہاری حاج
فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شری
پڑھو۔ بیٹی! تم نمازِ عشاء کے بعد 7 تسبیح پڑ
یَاحَیُّ یَا قَیُّومُ بِرَحْمَتِکَ اَستَ
وآخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ مدت 41 د
□ ج۔ن۔ کراچی۔
☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرما
کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑ
مسائل کے لیے ایک نہایت مجرب وظیف
کررہا ہوں۔ سورۃ یونس آیت 68 ہر نماز
101 بار پڑھو اول وآخر دُرود شریف 3
دُعا کرو۔ انشاء اللہ مسائل رفتہ رفتہ حل ہوں
□ عبیدہ۔ کراچی۔
○ محترم باباجی! السلام علیکم! امید

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ہوں اور میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر والوں نے میری اور میرے بھائی کی ایک ہی گھر میں منگنی کردی ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میں آگے پڑھ سکوں گی یا نہیں؟ کیونکہ اِس سال میں نے بی ایس سی پاس کرلی ہے اور آگے داخلہ لے کر چھوڑ دیا ہے کیونکہ میرے والد صاحب بیمار تھے اِس لیے باباجان! میں گھر میں رہتی ہوں۔ میں دوبارہ بی ایس سی کا امتحان دینا چاہتی ہوں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے 600 سے اوپر نمبر آئیں۔ باباجی! آپ میرے لیے دُعا کریں اور خصوصی دُعا بھی کرائیں۔ میں بہت زیادہ مشکلات میں گھری ہوئی ہوں۔ آپ کا رسالہ پڑھتے ہوئے 6 سال ہوگئے ہیں۔ آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں اور دُعائیں لیتے

خط طویل ہوجائے گا۔ مجھے کوئی اچھا سا وظیفہ یا دُعا بتائیں۔ میں آسانی میں بی ایس سی بھی کرنا چاہتی ہوں امتحان دینا چاہتی ہوں اور ایم۔ اے کے پیپر بھی دینا چاہتی ہوں۔ آپ خصوصی دُعا کرنی ہے اور آپ نے مجھے کیا میری منگنی صحیح جگہ ہوئی ہے یا نہیں حل آپ نے ماہِ جنوری میں شائع آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆بیٹی! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف جس قدر ممکن ہو یَا رحمٰنُ کا وِرد کیا کرو سب خیر ہوگی۔ مدت 41 دن ہے۔

☆☆......☆☆

تیر نیم کش

قارئین

...پی سخن فہمی کو آزمایئے' قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
...ٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کردیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر کے قاری کو 3 ماہ تک بچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

"تیر نیم کش" میں اس ماہ کوثر اسلم' راولپنڈی۔ آسیہ نزاکت' ڈسکہ۔ محمد افسر' کراچی کے اشعار انعام
...فتہ قرار پائے۔ انہیں ستمبر 2009ء کا "دوشیزہ" اعزازی طور پر روانہ کیا جارہا ہے۔

کوثر اسلم.........راولپنڈی

تارے اترے جب پھیلایا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو
مہندی' چوڑی اور تمہارا ساتھ سجن
اس سے بڑھ کر کیا ہے ایک سہاگن کو؟

آسیہ نزاکت.........ڈسکہ

غنچۂ دید کھلے عید کے روز
کون فرقت کو سہے عید کے روز؟
وہ جو روٹھا ہوا ہے مدت سے
کاش وہ آن ملے عید کے روز

محمد افسر.........کراچی

اور بڑھ جاتی ہے بھولی ہوئی یادوں کی کسک
عید کا دن تو فقط زخم ہرے کرتا ہے

سید بدر سعید.........لاہور

عید ملنے جو آپ آجائیں
میری بھی عید' عید ہوجائے

نگہت منیر.........اوکاڑہ

مناؤ عید' بہارِ چمن کو یاد کرو
پیامِ شوق کے اک اک سخن کو یاد کرو
ہجومِ شوق سے فرصت ملے تو اہلِ چمن
وطن سے دور کسی بے وطن کو یاد کرو

شاہجہاں مغل.........لاہور

محبت کی نئی دنیا بسائیں' عید کا دن ہے
پرانی رنجشوں کو بھول جائیں' عید کا دن ہے

نادیہ طارق.........کراچی

دیکھا جو چاند عید کا' تم یاد آگئے
دل میں مسرتوں کے دیے جگمگا گئے

رقیہ یوسف.........سیالکوٹ

احباب پوچھتے ہیں بڑی سادگی کے ساتھ
میں اب کے سال عید مناؤں گا کس طرح؟

رضوانہ کوثر.........لاہور

ہو مبارک تمہیں عید اہلِ وطن
ہر طرف آج خوشیاں ہیں سایہ فگن

نگین مہک.........ہری پور

مرے آنگن میں اداسی کے اندھیرے لے کر
عید کی صبح دبے پاؤں چلی آئی ہے

واصفہ ایوب.........سکھر

کون سی چیز تجھے عید کا تحفہ بھیجوں
پیار بھیجوں کہ دعاؤں کا ذخیرہ بھیجوں

نصرت زمان.........سکھر
گل نہ ہوگا تو جشنِ خوشبو کیا؟
تم نہ ہوگے تو عید کیا ہوگی
تحسین جونیجو.........خیر پور ناتھن شاہ
اب دیکھیے' اداس نگاہوں کو کیا ملے
ہر سمت پھول بانٹتی پھرتی ہے شامِ عید
طیبہ امجد.........ٹنڈو آدم
آئی ہے عید آج بھی ہر سال کی طرح
پر یوں طرب کا جیسے کوئی سلسلہ نہ ہو
پچھلے برس تھا خوف تجھے کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دُعا ہے' ترا سامنا نہ ہو
صائمہ.........ڈیرہ اسماعیل خان
لبوں پہ رنگِ تبسم نہ دل میں موجِ سرور
مرے وطن کے غریبوں کی عید کیا ہوگی؟
مہک مجید.........ٹنڈو آدم
دیکھا ہلالِ عید تو تم یاد آگئے
اس محویت میں عید ہماری گزر گئی
نصرت زمان.........سکھر
آنکھوں کو سمجھا جاتے
بجھتے دیپ جلا جاتے
ایسی کیا مجبوری تھی
عید کے دن تو آجاتے
فرح عالم.........اسلام آباد
دُعا ہے آپ دیکھیں زندگی میں بے شمار عیدیں
خوشی سے رقص کرتی' مسکراتی پُر بہار عیدیں
نسیم شفیق.........اسلام آباد
عید کا دن بھی شبِ ہجر کی صورت گزرا
دوست آیا نہ کوئی اور نہ تم ہی آئے
شازیہ شفقت.........گوجرانوالہ
اس کو میری نہ مجھے اس کی خبر جائے گی
عید اب کے بھی دبے پاؤں گزر جائے گی

ان کی طرف گز. ہو تو کہہ دینا ا
کرتا تھا انتظار کوئی سوگوا
عاصم خان نیازی.........
خوب رویا میں لپٹ کر غمِ تنہائی
کوئی بھی آکے گلے سے نہ لگا عید
نیہا عزیز.........کراچی
غیروں میں جو ہے شاد اسے عید
جس کو نہیں ہم یاد اسے عید
معصوم سے ارمانوں کی معصوم
جو کرگیا برباد اسے عید
نائلہ غضنفر.........کراچی
اے دوست' تجھے میری وفاؤں
میری پلکوں پہ ستارے نہ سجا عید
کئی ماہئی بے آب کی صورت اے
دل تڑپتا ہی رہا عید
احمد کمال.........گجرات
اس مہرباں کی نظرِ عنایت کا شک
تحفہ دیا ہے عید پر ہم کو فراق
شمشیر علی.........کراچی
آپ کا دستِ حنائی جو نظر آیا
چاند چپکے سے ہتھیلی پہ اتر آیا
تابش مقصود.........کرا
ہلالِ عید کی جانب مری بلا
کہ میری چشمِ تصور میں بس رہے
رضیہ ناز.........کراچی
آج کے دن صاف ہو جاتا ہے دل
آؤ مل لو عید' یہ موقع نہیں
عادل گلزار.........فیصل آ
عید وہ مل رہے ہیں غیروں
ہم سے کہتے ہیں' مدعا
☆☆.....☆☆